

ایمان و عمل کا قرآنی تصور

الطاف احمد اعظمی

www.KitaboSunnat.com



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربعہ

معدنہ البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

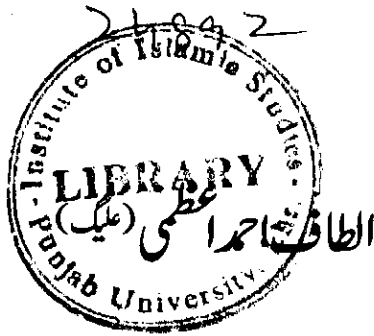
PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

DATA ENTERED

ایمان و عمل کا قرآنی تصور



www.KitaboSunnat.com



جملہ حقوق محفوظ ہیں

- اہتمام: محمد احسن تہاوی
- مطبع: سنج شکر پرنٹرز
- تاریخ اشاعت: 2006
- قیمت: 200 روپے

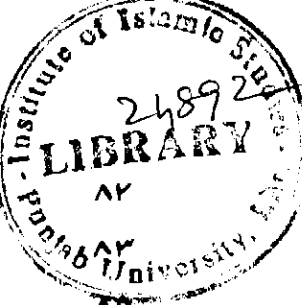
دارالتذکرہ

رحمن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار

لاہور۔ 54000 فون: 7231119

ای میل: info@dar-ut-tazkeer.com

ویب سائٹ: www.dar-ut-tazkeer.com



فہرست مضامین

۸۲	اطاعت رسول	۶	سید جمال الدین عزی	● کتاب میری نظریں
۸۳	احادیث رسول	۸		- دیباچہ
۸۵	مجموعہ احادیث	۱۲		- مقدمہ
۸۸	سنت رسول	۲۳		۱- ایمان کے لغوی معنی
۹۲	(د) کتابوں پر ایمان	۲۵		۲- ایمان کے قرآنی معنی
۹۳	ایمان بالکتاب کے تقاضے	۲۹		۳- ایمان کا شرعی مفہوم
۹۴	(س) اخوت پر ایمان	۳۰		۴- تکمیل ایمان کے شرائط
۹۶	روز جزا کا مفہوم	۳۱		تصدیق بالقلب
۱۰۱	نتائج اعمال سے غفلت کا سبب	۳۶		اقرار باللسان
۱۰۱	آخرت کے بارے میں یومین کا نقطہ نظر	۴۰		اثبات باعمل
۱۰۳	اثبات معاد	۴۵		۵- ایمان کے اجزائے ترکیبی
۱۰۳	خلقِ اول	۴۷		۶- اجزائے ایمان کی مختصر تشریح
۱۰۵	آئندہ کائنات	۴۸		(الف) ایمان باللہ
۱۰۶	زوجیت کا مقنا	۴۸		تصور ذات
۱۰۸	عدل کامل کا تقاضا	۵۵		تعبیرات کا اختلاف
۱۰۹	عقیدہ آخرت ایک اخلاقی و سماجی ضرورت	۵۷		تصور صفات
۱۱۰	ضمیر کا وجود	۵۹		لفی صفات
۱۱۲	داعیِ سرست کی فطری طلب	۵۹		اثبات صفات
۱۱۴	عقیدہ آخرت کے متعلق بعض غلط فہمیاں ایمان کا ازالہ	۶۰		قرآن کا تصور صفات
۱۲۴	۷- حقیقتِ اسلام	۶۲		ایمان باللہ کے تقاضے
۱۲۴	اسلام کا لغوی مفہوم	۶۴		(ب) فرشتوں پر ایمان
۱۲۵	اسلام دینِ فطرت ہے	۶۸		(ج) رسولوں پر ایمان - ثبوت رسالت
۱۲۸	مسلم کے حقیقی معنی	۷۷		تفریق بین الرسل
۱۳۰	اسلام کا شرعی مفہوم	۷۸		ایمان کی حیثیت اور اس کا فرض منصبی

۲۰۴	عمل صالح اور عہد حاضر کے مسلمان	۱۳۳	ایمان اور اسلام میں لازم ہے
۲۰۶	کیا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں؟	۱۳۶	ہدایت اور فلاح کا حقیقی معیار
۲۰۸	اعمال جزو ایمان ہیں	۱۴۰	۸۔ درجات ایمان
۲۰۹	قرآن مجید سے استشہاد	۱۴۷	۹۔ ایمان میں کمی و بیشی کا مسئلہ
۲۱۷	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۵۲	۱۰۔ صفات مومن
۲۱۹	احادیث سے استشہاد	۱۵۴	یقین محکم اور جہد و ایثار
۲۲۲	علماء اسلام کی تحریروں سے استشہاد	۱۵۶	اقامت صلوٰۃ اور ایثار زکوٰۃ
۲۲۴	۱۵۔ جزائے اعمال	۱۶۱	خشیت قلب اور توکل علی اللہ
۲۲۵	(الف) دنیوی جزا	۱۶۴	گناہ کبیرہ سے اجتناب، غصہ و گریز اور مشاورت
۲۲۹	(ب) اخروی جزا	۱۶۵	امر بالمعروف و نہی عن المنکر
۲۳۰	اخروی جزا کا مادی تصور	۱۶۸	مہر صدق، قوت، انفاق اور استغفار
۲۳۴	اخروی جزا کے مادی تصور کی حقیقت	۱۶۴	شروع صلوٰۃ، محافظت صلوٰۃ، پاک مانی، امانت، دیانت، ایثار، عبادت، قیام شہادت
۲۳۶	اخروی جزا کا غیر مادی تصور	۱۷۷	محبت الہی
۲۳۸	۱۶۔ عمل غیر صالح کا مفہوم	۱۸۱	حسن اخلاق
۲۳۸	کیا ایمان کے ساتھ اعمال غیر صالحہ کا اجتماع ممکن ہے؟	۱۸۴	۱۱۔ مومن اور منافق میں فرق
۲۴۰	توبہ و استغفار	۱۸۵	علامات منافق، شک اور تردد
۲۴۶	گناہ کبیرہ اور توبہ و استغفار	۱۸۸	اقامت صلوٰۃ میں ریا و غفلت
۲۴۸	گناہ کبیرہ اور خوارج و متزلفہ کا نقطہ نظر	۱۸۹	ایثار زکوٰۃ میں غفلت و بددلی
۲۵۲	۱۷۔ عمل غیر صالح کی سزا	۱۹۱	امر بالمعروف و نہی عن المنکر، عمل و ذکر الہی سے غفلت
۲۵۲	دنیوی سزا	۱۹۳	جھوٹ، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فحش گوئی
۲۵۵	اسلامی سزائوں کی حقیقت	۱۹۴	اقسام منافقین
۲۶۷	اخروی سزا	۱۹۶	۱۲۔ عمل کا مفہوم، ۱۳۔ اقسام عمل
۲۶۹	جہنم کی سزائیں کن لوگوں کے لیے ہیں	۱۹۷	۱۴۔ عمل صالح کا مفہوم
۲۶۹	اخروی سزا کا مادی پہلو	۲۰۲	بہترین عمل صالح
۲۷۳	جہنم کی حقیقت		
۲۷۷	کیا جہنم ہی خدا کی رحمت ہے؟		

انتساب

میری والدہ صغریٰ خاتون ایک نہایت ہی نیک نفس اور صابرہ خاتون تھیں۔ ان کی نیک نفسی اور صبر و تحمل گھر اور خاندان میں ضرب المثل تھا میں ابھی آیام طفلی کی منزل میں طے کر رہا تھا کہ وہ اس دار فانی سے رحلت کر گئیں۔ یہ حادثہ میرے لیے بڑا جانکاہ تھا۔

ان کی یاد اور ان کا تصور عمر گزشتہ کی طرح عمر و اں کی ہر منزل میں شریک سفر رہے گا۔ میں اس کتاب کو ان کے نیک نام سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

اطراف احمد اعظمی (علیگ)



کتاب میری نظر میں

دین نام ہے ایمان اور عمل صالح کا۔ اسلام نے دنیا اور آخرت کی تمام خوش خبریاں ان ہی دو خوبیوں پر دی ہیں۔ ضرورت تھی کہ علمی اور بالکل فطری انداز میں ان خوبیوں کی بھرپور وضاحت کی جاتی اور ان کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انھیں رفع کیا جاتا۔ ڈاکٹر اعظمی احمد اعظمی کی یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی قیمتی ہے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس میں مصنف نے بڑے دل نشیں انداز میں ایمانیات کی تشریح کی ہے اور قرآن کے دلائل کو بہترین اسلوب میں پیش فرمایا ہے۔ عمل صالح ایمان کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ ایمان جب دل کی گہرائی میں اترتا ہے تو پوری زندگی میں عمل صالح کی بہار آ جاتی ہے اور انسان کی عبادت اور اخلاق سے لے کر معاشرت اور سیاست تک تمام معاملات میں نیکی اور تقویٰ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ دعویٰ ایمان کے باوجود اگر کسی کی زندگی میں اعمال صالحہ کی آب و تاب نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ معاصی کا ارتکاب کر رہا ہے تو کیا اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو گیا اور روز جزا جنت کا مستحق نہیں رہا؟ یا یہ کہ لازماً اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا؟ اس سوال پر ہمارے قدامت نے بڑی بخشنی کی ہیں۔ اس مسئلے میں جمہور امت نے ایک خاص نقطہ نظر اپنایا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے درمیان اتنا گہرا رشتہ ہے کہ اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان میں سے ایک پایا جائے اور دوسرا نہ پایا جائے۔ دل میں ایمان موجود ہو اور زندگی میں عمل صالح سے خالی ہو۔ یہ بات ایک مومن کی شان کے بالکل خلاف ہے کہ وہ معصیت کی زندگی گزارتا رہے۔ اس پر قرآن مجید اور احادیث میں سخت وعید آئی ہے۔ بعض آیات و احادیث سے بظاہر یہ خیال بھی ہوتا ہے

کہ جو شخص کبار کا ارتکاب کرے اس کے ایمان ہی کا کوئی اعتبار نہیں ہے لیکن دوسری آیات و احادیث بتاتی ہیں کہ وہ بہر حال مومن ہے۔ بے علمی یا معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے وہ دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف بھی کر سکتا ہے اور ان پر سزا بھی دے سکتا ہے۔ اس کی سزا ابدی جہنم نہ ہوگی وہ اپنے غلط کاموں کی سزا بھگتے کے بعد بالآخر جنت کا مستحق ہوگا۔ مصنف نے اس مسئلہ میں جو نقطہ نظر اپنایا ہے وہ جمہور کے نقطہ نظر سے بڑی حد تک مختلف ہے اسے انھوں نے قرآن و حدیث سے مدلل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن خود ان کے نقطہ نظر سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے علمی مسائل میں اختلاف ناممکن نہیں ہے اس سے غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں اور کسی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

جمہور کے نقطہ نظر کی مزید وضاحت یا وکالت کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر قرآن مجید نے ایمان کے جن تقاضوں کا ذکر کیا ہے مصنف نے انھیں ایک خاص ترتیب اور سلیقے کے ساتھ اور بہت ہی پر زور طریقے سے پیش کیا ہے کہیں کہیں انداز بیان میں شدت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شدت مصنف کے جوش ایمان اور جذبہ اصلاح کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اس پہلو سے خوشی ہے کہ انھوں نے ایمان کے تقاضوں کو ابھار کر ہمارے سامنے ایک آئینہ فراہم کر دیا ہے جس میں ہم جیسے گنہگار اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلا یا جائے تاکہ ایمان اور عمل صالح کی روشنی عام ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والے اس کے دین کے تقاضے پورے کریں۔

سید جلال الدین عمری

سکرٹری ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

۴ اگست ۱۹۸۶ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

جہاں تک ایمان و عمل کے لفظ کا تعلق ہے اس سے کوئی بھی مسلمان ناواقف نہ ہوگا۔ لیکن اس کے معنی و مفہوم سے صحیح طور پر واقف کم ہی مسلمان ملیں گے۔ بہت سے مذہبی لوگ بھی ایمان و عمل کے حقیقی (قرآنی) معنی و مفہوم سے نااہل ملتے ہیں۔ اور یہ غالباً اسی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی زندگیوں میں بڑی حد تک مومنانہ افعال و خصائص سے تہی دامن نظر آتی ہیں۔

بہت سے ایسے مسلمان بھی ملتے ہیں جو ایمان و عمل کا ایک ایسا تصور رکھتے ہیں جو قرآنی تعلیمات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس غیر قرآنی تصور ایمان کو ان کے قلب و دماغ میں کچھ اس طرح بیوست کر دیا گیا ہے کہ وہ اس کی صحت و صداقت پر کامل یقین رکھتے ہیں، اور اس سے کسی قیمت پر دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ ایمان و عمل کے اس غیر قرآنی تصور ہی کی وجہ سے ان کی اکثریت افکار و اعمال کی بے شمار خرابیوں میں مبتلا ہے حتیٰ کہ گناہ عظیم یعنی شرک سے بھی ان کا دامن واغدار ہے۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کا وجود اور ان کے باہمی نزاع و بیکار کا ایک بڑا سبب بھی ایمان و عمل کا یہی غیر قرآنی تصور ہے۔

یہ صورت حال ہر درمند مسلمان کے لیے سخت اضطراب انگیز ہونی ہی چاہئے۔ میرے لیے بھی فکر کا باعث تھی اور میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیوں نہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں ایمان و عمل سے متعلق قرآنی تصورات کو کسی افراط و تفریط کے بغیر واضح لفظوں میں بیان کر دیا جائے تاکہ جو لوگ اس کے حقیقی معنی و مفہوم کو نہ جانتے ہوں وہ اس کو جان لیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی اصلاح و تہذیب کریں، اور جو لوگ اس کے معنی و مفہوم کی غلط تاویل و

تشریح کرتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اپنے طرز فکر کی غلطی کو محسوس کر لیں بلکہ ایمان و عمل کے حقیقی قرآنی تصور کے مطابق اپنے افکار و اعمال کی اصلاح بھی کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا جو پلک بچھکتے ہی انجام پا جاتا، اس کے لیے بڑی جاں سوزی اور جگر کاوی کی ضرورت تھی۔ میں نے جب بھی اس راہ میں اقدام کا فیصلہ کیا، علمی کم ہانگی اور بے بضاعتی کا احساس مانع راہ بن گیا، اور اس طرح یہ کام برسوں معرض اتواء میں پڑا رہا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے میرا ذہنی و فکری رشتہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ میں برابر غور و فکر مطالعہ، اور اپنے منتشر فکری سرمائے کی جمع و تالیف میں مشغول رہا حالات کی نزاکت اور موضوع سے گہری قلبی وابستگی نے تمام موانع راہ کے باوجود بالآخر مجھ کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کر دیا۔ اسے محض تائید ایزدی اور نصرت خداوندی کا ثمرہ کہیے کہ دو سال کی قلیل مدت میں یہ کام بحسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ واللہ العظیم۔

اس کتاب کا موضوع جیسا کہ بیان ہو چکا، ایمان و عمل ہے۔ کتاب میں سب سے پہلے ایمان و عمل کے لغوی و قرآنی اور اس کے شرعی مفہوم کو قرآنی آیات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لفظی شرح و تفصیل کے بعد ایمان کے اجزائے ترکیبی یعنی دین کے بنیادی اصولوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایمانیات کا تعلق عالم غیب کے غیر مرنی اور نامشہود حقائق سے ہے، اور ان میں عقل انسانی کے لیے گنجائش کلام بہت کم ہے پھر بھی موجودہ دور کے انداز فکر کا تقاضا یہی ہے کہ ان غیبی امور کو عقلی دلائل و شواہد کی روشنی میں جدید اسلوب میں پیش کیا جائے تاکہ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی ان غیبی امور کی تفہیم آسان ہو جائے۔

میں نے ایمان کے اجزائے ترکیبی کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے تقاضوں کی بھی تشریح و توضیح کر دی ہے۔ فی الواقع ایمان کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر اور یوم آخرت کے وقوع پر دل سے یقین رکھا جائے اور زبان سے ان کا اقرار کیا جائے، بلکہ ان کے تقاضوں کو جانا اور ان پر عمل کرنا بھی ایمان میں داخل ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے اقرار ایمان کرتا ہے لیکن اس کے علمی

تقاضوں کو نظر انداز کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو وہ ایمان کے معنی و مفہوم سے بالکل ناواقف ہے، اور یا اس کا اقرار ایمان محض زبانی ہے، اور ابھی تک اس کے قلب و دماغ حلاوت ایمان سے نا آشنا ہیں۔

اس واضح حقیقت کے باوجود ہمارے بعض اکابر علماء اور فقہاء ایمان و عمل کے لزوم کو تسلیم نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ عمل ایمان کا جزو لازم نہیں ہے بلکہ اس سے علیحدہ ایک چیز ہے، اور عمل میں کمی یا اس کے فقدان سے ایمان پر نئی نفع کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میری حقیر فہم کے مطابق یہ تصور ایمان و عمل ہر اس قرآنی تعلیم کے خلاف اور امت مسلمہ کے حق میں سخت مفسرت رساں ہے۔ میں نے قرآن مجید اور صحیح احادیث کی روشنی میں ایمان و عمل کے ربط و تعلق کو واضح بھی کیا ہے اور اسے مبرہن کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ بھی ہمارے یہاں ایک اختلافی مسئلہ ہے لیکن یہ اختلاف بھی دراصل لفظ ایمان کی غلط تشریح و تاویل کا نتیجہ ہے۔ میں نے آیات قرآنی کی روشنی میں اس اختلاف کا جائزہ لے کر امر حق کو واضح کیا ہے۔

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک مومن و منافق کی پہچان کا ذریعہ ان کے اعمال و خصائل ہیں۔ میں نے قرآنی آیات کی روشنی میں مومن و منافق کے اوصاف و خصائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ ہر مقرر ایمان اپنی داخلی اور خارجی زندگی کا جائزہ لے کر دیکھ سکے کہ اس کے ایمان کا کیا حال ہے، اور کہاں تک نفاق کے اثرات سے اس کی زندگی کے شب و روز محفوظ ہیں۔

اسلام میں عقیدہ آخرت کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ قرآن میں توحید کے بعد جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ عقیدہ آخرت ہے، کیوں کہ انہی دو عقائد کی درستگی سے ایک انسان دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں ایک صلح معاشرہ اور عادلانہ نظام حیات کا قیام بھی عقیدہ آخرت کے بغیر ممکن نہیں ہے، جو انسانی معاشرہ بھی عقیدہ آخرت کے تصور سے خالی ہو گا وہ ایک شجر بے برگ و بار ہو گا، اور اس میں انسانوں کو کبھی حقیقی راحت و سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔

عقیدہ آخرت کی اسی اہمیت کے پیش نظر میں نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے، اور حیات بعد موت کے تصور کو ایک امر یقینی کے طور پر اس انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے محصلین کے لیے بھی اطمینان بخش ثابت ہو سکے۔

انسانی زندگی پر عقیدہ آخرت کے جو ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے ہیں اس سے انکار ممکن نہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یوم آخرت پر ایمان رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی بڑی تعداد ہر طرح کی بد اعمالیوں میں مبتلا ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ عقیدہ شفاعت کا غلط تصور ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ شفاعت کا ایک ایسا تصور رکھتا ہے جو قرآن مجید کے تصور شفاعت کے بالکل خلاف ہے اور آخری زندگی کے لیے موجب ہلاکت بھی میں نے قرآنی آیات کی روشنی میں نہ صرف اس تصور شفاعت کی نفی کی ہے بلکہ اس کے صحیح تصور کو بھی پیش کیا ہے۔

حیات بعد موت کے ذکر کے ساتھ اعمال کی جزا و سزا کا ذکر ناگزیر ہے۔ جزا و سزا کا دوسرا اصطلاحی نام جنت اور جہنم ہے۔ جنت اور جہنم کا نام آتے ہی بہت سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فی الواقع جنت اور جہنم سے قرآن مجید کی مراد کیا ہے؟ کیا جنت اور اس کی نعمتوں سے مراد وہی نعمتیں ہیں جن سے انسان اس دنیا میں واقف ہے یا اس کا مفہوم کچھ اور ہے؟ اسی طرح جہنم اور اس کی آگ سے کیا وہی آگ مراد ہے جو ہمارے گھروں کے چولھوں میں جلتی ہے یا اس سے قرآن کی مراد کچھ اور ہے؟ میں نے ان دونوں پیچیدہ سوالوں کا جواب قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں جدید تعلیم یا ذمہ طبع کی تسکین قلب و دماغ کا وافر سامان موجود ہے۔ یہ تھے وہ بڑے موضوعات جن پر اس کتاب میں مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اہم علمی موضوعات بھی ضمناً زیر بحث آنے میں جن سے انشاء اللہ قارئین کو فائدہ پہنچے گا۔

میں نے اس کتاب کے شروع میں دیباچہ سے ٹھیک متصل ”مقدمہ“ کے عنوان سے ایمان اور عمل صالح سے متعلق اہل کتاب کے افکار و اعمال کا مختصر جائزہ لیا ہے اور

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کے تصورِ ایمان و عمل کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ قارئین، کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے موضوع کتاب کی حقیقت و اہمیت سے ایک حد تک واقف ہو جائیں، اور یہ بھی جان لیں کہ ایمان اور عمل صالح کے باب میں اہل کتاب کا نقطہ نظر کیا ہے، اور فکری و علمی اعتبار سے وہ کس طرح کے فسق و فضیلت میں مبتلا ہیں؟ اور اس سلسلے میں قرآن مجید نے جو دور رس فکری و علمی اصلاحات کی ہیں ان کی حقیقت و نوعیت کیا ہے؟ اور یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ اصلاحیں کس درجہ واضح مدلل اور متوازن ہیں۔

اس کتاب میں آپ کو بعض مقامات پر مسلمانوں کے موجودہ طرز فکر و عمل پر تنقید و تبصرہ بھی ملے گا کہیں کہیں اس تنقید و تبصرہ کا رخ علماء کرام کی طرف ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ الفاظ اور انداز بیان کے اعتبار سے یہ تنقید کچھ تیز و تند ہو گئی ہو لیکن حاشا و کلاً اس سے میرا مقصود ان کی توہین و تحقیر نہیں ہے، بلکہ ان کو محض اس امر کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ملت کے قلب و دماغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے طرز فکر و عمل کی اصلاح کر لیں تو عامۃ المسلمین کے افکار و اعمال کی اصلاح بہت آسان ہے۔

میں کسی قسم کے پندار زہد و تقویٰ اور کسی نوع کے فریب بہم دانی میں مبتلا نہیں ہوں۔ میں ایک نہایت ہی حقیر اور خطاکار انسان ہوں اور خود کو قرآن مجید کا ایک معمولی طالب علم سمجھتا ہوں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہر طرح کی احتیاط اور غور و فکر کے باوجود کتاب میں علمی فرورگزاشتیں موجود ہوں۔ میں قارئین بالخصوص علماء کرام سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کتاب کا غیر جانبدارانہ اور معروضی مطالعہ کریں اور اس میں جو علمی فرورگزاشتیں نظر آئیں ان سے مجھے ضرور مطلع فرمائیں، میں ان کا بے حد ممنون ہوں گا۔

میں ان تمام احباب اور بزرگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کے لکھنے میں مجھے کسی طرح کا کوئی تعاون دیا ہے، بالخصوص میں مولانا صدر الدین اصلاحی اور مولانا بدر الدین اصلاحی کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان دو فاضل بزرگوں نے اپنے گوناگوں علمی مشاغل کے باوجود کتاب کا مسودہ دیکھا اور اپنے گراں قدر مشوروں

سے نوازا۔ میں مولانا سید جلال الدین عمری (مدیر تحقیقات اسلامی، علی گڑھ) کا بھی بے حد ممنون ہوں۔ جنہوں نے نہ صرف یہ کہ کتب پر نظر ثانی کی زحمت گوارا کی بلکہ اس کی اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ میں جناب راشد اعظمی کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے ہر قدم پر میری جو ملاحظائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان سب محبتیں و مخلصین کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس "سعی نایبہ" کو شرف قبول بخشے، اے قارئین کے حق میں زیادہ سے زیادہ نافع بنائے، اور مجھ رو سیاہ کو مزید خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ اینب۔

الطاف احمد اعظمی

محلہ اجیری۔ جونپور

۲۸ جنوری ۱۹۸۴ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

خدا کی طرف سے مختلف ادوار میں جو ادیان آئے ان کی جملہ تعلیمات کو دو بڑے خالوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک ایمان کا خانہ اور دوسرا عمل صالح کا۔ ایمان، دین کے بنیادی اصولوں پر دل سے یقین رکھنے کو کہتے ہیں، اور یہ اصول بنیادی طور پر تین ہیں: ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت۔ اور انہی اصول ثلاثہ کے مطابق عمل کرنے کا نام عمل صالح ہے۔ ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں ربط و تعلق کی نوعیت وہی ہے جو ایک عمارت کی بنیاد اور اس کے در و دیوار میں ہوتی ہے۔ ایمان بمنزلہ بنیاد کے ہے اور عمل صالح بمنزلہ در و دیوار اور ستون کے۔ ہر عمارت اپنے وجود کے لیے بنیاد اور دیوار و ستون دونوں کی محتاج ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو عمارت کا وجود بھی نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح دین کی عمارت بھی نہ تو ایمان کے بغیر قائم ہو سکتی ہے اور نہ عمل صالح ہی کے بغیر کھڑی ہو سکتی ہے۔ جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی کسان صرف زراعت کے اصولوں سے واقف ہو کر اپنے کھیت سے غلہ پیدا نہیں کر سکتا ہے، بلکہ کھیت سے اسی صورت میں غلہ پیدا ہوگا جب کسان زراعت کے اصولوں کے مطابق عمل بھی کرے گا، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف دین کے اصولوں سے واقفیت اور ان کے زبانی اقرار سے اس کے بہترین ثمرات ظاہر

نہ ایلان کے دو درکن یعنی ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب، ایمان بالرسول ہی میں شامل ہیں۔ جملہ کتب سماویہ کا نزول ایک فرشتہ (جبرئیل) ہی کے توسط سے ہوا ہے۔ اس لیے جو شخص رسولوں پر ایمان رکھتا ہے وہ ناگزیر طور پر فرشتوں اور کتابوں پر بھی ایمان رکھے گا۔ (مصنف)

نہیں ہو سکتے۔ ایمان صرف اسی صورت میں نافع بن سکتا ہے جب کہ اس کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل ہو۔

ابتداء میں ہر دین کے ماننے والوں نے ایمان اور عمل صالح کے لازمی تعلق کو برقرار رکھا، لیکن ان کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے نہ صرف اس ربط و تعلق کو قائم نہیں رکھا بلکہ ایمان اور عمل صالح کی حقیقت اور ان کے تقاضوں کو بھی فراموش کر دیا۔ دین میں اس افراط و تفریط کی مرتکب قوموں میں سے یہودی اور عیسائی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

یہودیوں نے سب سے زیادہ زور اعمال بالخصوص اعمال قربانی پر دیا اور ایمان کو بالکل ثانوی حیثیت دے دی۔ ارکان ایمان یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرتہ میں سے آخر الذکر دو ارکان کو بڑی حد تک بھلا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تورات کے صفحات میں ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرتہ کی حقیقت اور ان کے تقاضوں کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے، ایمان باللہ کا ذکر تورات میں ضرور ہے لیکن یہودی من حیث القوم اس کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی مکمل طور پر محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس باب میں ان کی غفلت کو شی اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ بت پرستی تک میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی بت پرستی پر تورات کے صفحات آج بھی شہادت دیتے ہیں حضرت یسعیاہ فرماتے ہیں:

”وہ اہل مشرق کے رسوم سے پر ہیں اور فلسٹیوں کی مانند ٹنگون لیتے ہیں

..... اور ان کی سر زمین بتوں سے بھی پر ہے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت یعنی

اپنی ہی انگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں۔“

ایک دوسری جگہ تمثیل کے پیرایہ میں ان کی بت پرستی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”خداوند نے مجھ سے فرمایا، کیا تو نے دیکھا کہ برگشتہ اسرائیل (یعنی سامریہ

کی اسرائیلی ریاست) نے کیا کیا؟ وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک خست

کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری (یعنی بت پرستی) کی..... اور اس کی بے وفا

بہن یہودہ (یعنی یروشلم کی یہودی ریاست) نے یہ حال دیکھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ جب برگشتہ اسرائیل کی زنا کاری (یعنی شرک) کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دے دی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا (یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا) تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی اور اپنی بدکاری کی برائی سے زمین کو ناپاک کیا، اور پتھر اور لکڑی کے ساتھ زنا کاری (یعنی بت پرستی) کی۔^{۱۷}

ایمان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے غفلت برتنے کی وجہ سے یہودیوں نے اعمال صالحہ کے معاملے میں بھی بدترین غفلت کا ثبوت دیا اور نفس پرستی کی راہ پر چل پڑے۔ یسعیاہ نبی نے ان کی بد اعمالیوں کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے:

”آہ خطاکار گروہ، بد کرداری سے لدی ہوئی قوم، بد کرداروں کی نسل، مکار اولاد، جنہوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اور گمراہ و برگشتہ ہو گئے۔ تم کیوں زیادہ بغاوت کر کے اور مار کھاؤ گے۔“^{۱۸}

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

”وفا دار بتی کیسی بدکار ہو گئی، وہ تو انصاف سے معمور تھی اور اس میں راستبازی بتی تھی لیکن اب خونیں رہتے ہیں..... تیرے سر ہر گردن کش اور چوروں کے ساتھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور یتیموں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی۔“^{۱۹}

یہودیوں کی طرح عیسائی بھی ایمان اور عمل صالح کے باب میں افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہے۔ یہودیوں کے برخلاف انہوں نے ایمان، بالخصوص ایمان باللہ کو اہم قرار دیا، اور اس کے دوسرے اجزا یعنی ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرۃ کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا۔ ایمان بالرسل تو یوں غیر اہم ہو گیا کہ انہوں نے خود عیسیٰ کو ایمان باللہ میں شریک کر لیا اور

^{۱۷} تاجیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی (مضمت)

^{۱۸} یرمیاہ باب آیات ۹ تا ۱۶

^{۱۹} تاجیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی (مضمت)

^{۲۰} یسعیاہ باب آیات ۲۳ تا ۲۴

ایمان بالآخرہ کی ضرورت اس لیے باقی نہ رہی کہ عیسیٰ نے مصلوب ہو کر نہ صرف عیسائیوں بلکہ کل بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا (یوحنا ۲: ۲) اب لے دے کے صرف ایمان باللہ بچا لیکن وہ بھی جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، خالص نہ رہا۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ دو اور ہستیوں (بیٹا اور روح القدس) کو شریک الوہیت کر کے عقیدہ تثلیث ایجاد کر لیا، اور صرف اسی عقیدے سے فکری و قلبی وابستگی کو ہدایت اور نجات اخروی کا ذریعہ قرار دیا ہے، رہے اعمال صالحہ تو وہ ہدایت اور فلاح آخرت کے نقطہ نظر سے بالکل غیر ضروری ٹھہرے۔ اس سلسلے میں دور جدید کے ایک عیسائی فاضل کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتا ہے:

”آپ بہترین راستبازی کی زندگی بسر کریں، جتنے بچھے کام کر سکتے ہیں کریں، سنہرے اصول کی پابندی کریں، جو بہترین کام آپ کر سکتے ہیں وہ کریں، ان سب سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ زندگی اچھے اعمال سے نہیں ملتی۔ کوئی زیارت، کوئی دعا، کوئی سخاوت، کچھ بھی جو آپ کر سکتے ہیں فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔“
ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

”تعلیم، اصول، دعائیں، خود انکاری، ماتم توبہ اور خیرات گو کہ کچھ فائدہ مند ضرور ہیں لیکن یہ اعمال آپ کو نجات نہیں دے سکتے ہیں..... اور نہ کسی دوسرے وسیلہ سے آپ نجات پا سکتے ہیں (اعمال ۲: ۱۲) آپ کو صرف مسیح اور صرف مسیح نجات دے سکتا ہے۔“

اعمال صالحہ کے انکار اور نجات اخروی کو صرف عیسیٰ مسیح سے وابستہ کر دینے کے جو لازمی نتائج نکلنے چاہئیں وہ آج آپ بچشم سر دیکھ سکتے ہیں۔ ایمان میں صریح شرک

لے دیکھنے پال کے خطوط و میوں کے نام ۳، ۴ (انجیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ مصنف)

THE SALVATION OF GOD P 72-73

(DR. OSWARD. J. SMITH L.L.D)

داخل ہو گیا ہے، اور اعمال کا حال یہ ہے کہ اب سور کا گوشت، شراب اور زنا جیسے اعمال ان کی نظروں میں اعمال بدنہ رہے: فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خدا کے آخری دین کی حیثیت سے دین اسلام نے آکر ایمان و عمل صالح اور ہدایت و نجات اُخروی کے سلسلے میں یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر اقوام عالم کے گم راہ کن اور مشرکانہ خیالات کی تردید کی، اور وہ راہ بتائی جس پر چل کر تمام انسان خواہ وہ کسی بھی ملک و قوم اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں، دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اسلام نے سب سے پہلے ایمان اور عمل صالح کے درمیان رابطہ و تعلق کی نوعیت کو واضح کیا۔ اس نے بتایا کہ ہدایت اور روزِ آخرت کامیابی کا مدار نہ صرف ایمان پر ہے اور نہ صرف عمل صالح پر، بلکہ ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِقِينَ وَالصَّابِقِينَ مَنْ آمَنَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلْ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲:۵﴾

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابقین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور
یومِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو نہ ان کے لیے خوف کی کوئی بات ہے
اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَصَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ
فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ عَذَابًا ۖ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ﴿۶۰:۴﴾ (مریم: ۶۰)

تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات
نفسانی کا اتباع کیا پر وہ عنقریب گمراہی سے دوچار ہوں گے، لیکن جس نے توبہ کی اور
ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان کا ذرہ

حق نہ مارا جائے گا۔

ہدایت اور فلاح آخرت کو ایمان اور عمل صالح پر منحصر قرار دینے کے ساتھ ہی اسلام نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال باطل کی بھی تردید کی کہ ہدایت اور جنت کا حصول یہودی یا عیسائی بنے بغیر ممکن نہیں، فرمایا :-

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصْرًا تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ آبَائِهِمْ

حَزِينًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمَشْرِكِينَ ﴿۱۲۵﴾ (البقرہ: ۱۲۵)

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہو، نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔
دوسری جگہ فرمایا :-

وَقَالُوا لَنْ نَبْدُ خُلُ الْجَنَّةِ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (البقرہ: ۱۳۱)

وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان لوگوں کی امنگیں اور آرزوئیں ہیں (نہ کہ حقیقت حال) ان سے کہو: اگر تم اپنے زعم میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ حق یہ ہے کہ جس نے بھی اللہ کے آگے سراطعت جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے، اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

اس آیت میں بلیٰ من امن باللہ کہنے کے بجائے بلیٰ من اسلم وجہہ للہ کہہ کر دراصل اللہ تعالیٰ نے ایمان کی حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے کہ وہ صرف زبان سے اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خلوص دل سے اللہ کی اطاعت و فرماں برداری بھی ضروری ہے۔ اسلام نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح نجات اخروی کا مدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اسی طرح دنیا میں بھی کامیابی کا انحصار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ اس دنیا میں ہر وہ قوم انجام کار

خسران سے دوچار ہوگی جو ایمان اور عمل صالح کی سیدھی راہ کو چھوڑ کر کسی ٹیڑھی راہ کو اختیار کرے گی، فرمایا:-

وَالْعَصْرُ لِأَنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ خَشِيرٌ ۖ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وَتَوَّاصُوا بِالْحَقِّ ۖ وَتَوَّاصُوا بِالصَّبْرِ ۖ (العصر)

زمانہ کی قسم (یعنی زمانہ شاہد ہے) انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کرتے رہے۔ انسانی تاریخ کا ایک ایک صفحہ قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔ فی الواقع دنیا کی جس قوم نے بھی ایمان اور عمل صالح کی شرائط مستقیم کو چھوڑا، اپنے افعال و اعمال کے لحاظ سے جانوروں سے کبھی پست و فروتر ہو گئی۔ آیت ذیل میں اسی تاریخی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے:

وَالَّذِينَ وَالَّذِينَ لَا يَرْجُونَ سِوَايَ اللَّهِ ۖ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۖ لَقَدْ
خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۖ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۖ
إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ... (میں ۱-۵)

ہم نے انسان کو بہترین شکل و ساخت کے ساتھ پیدا کیا پھر ہم نے اسے سب سے نیچے درجہ کی طرف پھیر دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ اسلام نے صرف ایمان اور عمل میں ربط و تعلق اور نوعیت تعلق ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ ایمان کے اجزائے ترکیبی یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرتہ کی حقیقت کو بھی کھول کھول کر بیان کیا تاکہ انسان شرک اور دوسرے اعمال بد کے ارتکاب سے محفوظ رہ سکے۔ ایمان باللہ میں توحید اور ایمان بالرسول میں رسولوں کی رسالت اور بشریت کے اقرار کے ساتھ آخری رسول کی اتباع کو لازم کیا ایمان بالآخرتہ میں عدل خداوندی کے تصور کو نمایاں کیا، اور عقیدہ شفاعت کے عنوان سے جو غلط فہمیاں یہودیوں اور عیسائیوں میں پھیل گئی تھیں ان کا ہر ممکن سدباب کیا۔

اسلام نے عمل صالح کی حقیقت اور اس کے اجزائے ترکیبی کو بھی واضح الفاظ میں

بیان کیا۔ اکثر اقوام نے عمل صالح کو صرف چند اعمال پرستش اور چند اخلاقی باتوں تک محدود کر دیا تھا۔ اسلام نے عمل صالح کے اس تنگ دائرے کو ختم کیا اور اس میں عبادات کے ساتھ جملہ اخلاق اور معاملات کو بھی شامل کیا اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ عبادات ہوں یا اخلاق اور معاملات، حقیقی معنوں میں ان پر اسی وقت عمل صالح کا اطلاق ہوگا جب ان کے کرنے سے ایک مومن کی غرض صرف رضائے الہی کا حصول ہو چنانچہ آنحضرتؐ نے یہ طبع جملہ ارشاد فرمایا: **انما الاعمال بالنیات** "اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے" (مسند احمد) اس مختصر سے جملے نے واضح کر دیا کہ اسلام کے نزدیک عمل صالح کا مدار اخلاص نیت پر ہے۔ اگر کسی کام کے کرنے سے مقصود اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے تو وہ عمل صالح کا کہلائے گا، اور اگر اس سے خوشنودی رب کے علاوہ کچھ اور مقصود ہے تو وہ عمل صالح نہیں کہلائے گا خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا عمل کیوں نہ ہو۔ اور روزِ آخرت اس کا کوئی اجر و ثواب بھی نہ ملے گا۔

کسی عمل کی صالحیت کے لیے جہاں اخلاص نیت شرط ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل اعتدال و توسط کے دائرے میں رہ کر انجام دیا جائے، اس میں غلو اور تشدد کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہ ہو۔

گزشتہ صفحات میں ایمان اور عمل صالح سے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اگلے صفحات میں اسی کی شرح و تفصیل ہے۔

ایمان

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي
الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○ (مائدہ)

جس نے ایمان لانے سے انکار کیا تو اس کا ہر عمل ضائع گیا اور
وہ روز آخرت خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا۔

ایمان

ایمان کے شرعی مفہوم، اس کے اجزائے ترکیبی، اس کے تقاضوں اور دیگر متعلقہ امور پر گفتگو سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے لغوی اور قرآنی معانی پر تفصیلی نظر ڈال لی جائے۔

ایمان کے لغوی معنی

ایمان کے لغوی معنی تصدیق کرنے، اعتماد کرنے اور اطاعت و انقیاد کے ہیں۔ لفظ ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:-

”نفت میں ایمان کے معنی تصدیق کرنے کے ہیں، یعنی خبر دینے والے کے حکم کا یقین کرنا اس طرح کہ حکم قبول کیا جائے اور بتانے والے کو سچا قرار دیا جائے۔ یہ مصدر ہے افعال کے وزن پر۔ یہ امن سے ماخوذ ہے۔ گویا ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جس پر ایمان لایا جائے اس کو تکذیب و مخالفت سے امن دے دیا جائے۔ اس کا تعدیہ کبھی بذریعہ لام ہوتا ہے اور کبھی بذریعہ با۔ پہلی صورت میں اذعان یعنی یقین حکم کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں، اور دوسری صورت میں اعتراف یعنی تسلیم و انقیاد کے۔ جس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ بغیر اعتراف کے تصدیق لائق اعتبار نہیں۔ کبھی حقیقت عرفیہ کے اعتبار سے اور کبھی بطور مجاز و ثوق کے معنی میں بھی اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وثوق کرنے والا امن میں ہو گیا۔“

حافظ ابن کثیر لفظ ایمان کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

” لغت میں لفظ ایمان کا اطلاق تصدیقِ محض پر ہوتا ہے اور قرآن میں بھی اس کا استعمال اس مفہوم میں ملتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ** ... (توبہ: ۶۱) ” (زبور) اللہ کی تصدیق کرتا ہے اور اہل ایمان کی باتوں کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ ” یا جیسا کہ برادرانِ یوسف نے اپنے باپ سے کہا: **وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ** (یوسف: ۱۷) ” آپ ہماری باتوں کی تصدیق نہیں کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی ہوں۔ ” اسی طرح اگر ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ذکر کیجا آئے تو اس وقت بھی لفظ ایمان کا یہی مفہوم مراد ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **وَالْعَصْرَ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ خَسِرَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ** ... ” زانہ گواہ ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے تصدیق کی اور نیک اعمال کیے ” اور جب مطلق طور پر لفظ ایمان استعمال ہو تو اس وقت مطلوبہ شرعی ایمان مراد ہوتا ہے جو اعتقاد، قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔“

مولانا حمید الدین فراہی ایمان کے لغوی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

” ایمان کی اصل امن ہے۔ ایمان لغت میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ”امنہ اسی اعطاء امن (اس کو امن بخشا) قرآن مجید میں ہے **وَأَمَّنَّهُم مِّنْ خَوْفٍ** (اور خوف سے ان کو امن دیا) امن لہ۔ صدقہ واعتمد علیہ (اس کی تصدیق کی، اس پر اعتماد کیا) امن بہ۔ یقن بہ (اس کا یقین کیا)

یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے۔ عبرانی میں (5) امن کا مادہ موجود ہے جس کے معنی صدق و اعتماد کے ہیں۔ اسی سے (6) امین ہے جو ایک تصدیق و اعتماد کا کلمہ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیت، توکل

۱۷ تفسیر ابن کثیر، ص ۱۷۱ سورہ بقرہ ” وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ“

اور اذعان کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ لفظ ایمان، لغوی حیثیت سے اپنے صلہوں کے اختلاف کی بنا پر مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ جب یہ بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی امن سے رہنے یا امن دینے کے ہوتے ہیں، اور جب صلہ با کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی اقرار و تسلیم اور ایقان کے، اور صلہ لام کے ساتھ اس کے معنی تصدیق، اعتماد اور اطاعت و انقیاد کے آتے ہیں۔

ایمان کے قرآنی معنی

عربی زبان بڑی وسیع المعنی زبان ہے۔ اس میں ایک لفظ کے متعدد معنی ہوتے ہیں۔ اگر ہم کسی لفظ کے حقیقی معنی و مفہوم کو جانتا چاہیں تو عربی لغات، جاہلی خطیبوں کے خطبات اور اس کے شعراء کے دواوین کے علاوہ ہم کو قرآن مجید کی طرف بھی رجوع کرنا چاہیے جو عربی مبین میں نازل ہوا ہے، اور عربی زبان کے الفاظ و اسالیب کی حقیقت کے جاننے کا سب سے زیادہ صحیح اور مستند ذریعہ ہے۔ آئیے دیکھیں کہ قرآن حکیم نے لفظ ایمان کو کن کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں یہ لفظ بغیر صلہ کے آیا ہے اس کے معنی امن دینا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَأَمَّنَّهُمْ مِنَ الْخَوَافِ اور اس نے ان کو خوف سے امن دیا یا امن

(قریش: ۲۰) میں رکھا۔

اور جہاں صلہ با کے ساتھ آیا ہے تو اس کے ایک معنی اقرار و تسلیم کے ہیں یعنی انکار کے بالمقابل تسلیم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

وَيَقُولُونَ نُوْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكْفِرُ بِبَعْضٍ (النور: ۱۵۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو (یعنی بعض نبیوں کو) مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْتُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا تَقَالُوبًا نُوْمِنُ بِمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا وَ
يَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ (بقرہ: ۹۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کو تسلیم کرو، تو کہتے ہیں کہ جو ہم پر نازل کیا گیا ہے، ہم اسی کو تسلیم کرتے ہیں اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔

وَقَالَتْ ظَالِمَةُ مِنَ أَهْلِ الْكِتَابِ امْتُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ
آمَنُوا وَجِئَتْ بِالْبَيِّنَاتِ وَالْأَخْرَجَتْ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۴۷﴾ (آل عمران: ۴۷)

اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جو کچھ مسلمانوں پر اترتا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کے وقت اس کا انکار کرو۔ اس طرح توقع ہے کہ وہ (اپنے نئے دین سے) پھر جاؤں گے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (بقرہ: ۸۵)

کیا تم کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ انکار کرتے ہو؟

صلوات کے ساتھ قرآن نے لفظ ایمان کو ایقان کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے یعنی ایسا اقرار کہ اس پر اقرار کرنے والے کا قلب و دماغ پوری طرح مطمئن ہو اور اس میں ادنیٰ اشک کی گنجائش نہ پائی جائے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا
حقیقی مومن تو وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر اور پھر شک میں مبتلا نہ ہوئے۔ (البقرہ: ۱۷۷)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا لَنْعَلَهُمْ مَنْ يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ
مِنْهَا فِي شَكٍّ (سبا: ۲۱)

اور انیس کا ان لوگوں پر جو تسلط ہوا تو فقط اس لیے تاکہ تم جان میں (یعنی واضح ہو جانے کہ) کون لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور کون ہیں جو آخرت کے متعلق شک رکھتے ہیں۔

اس آیت میں شک کو ایمان کے بالمقابل استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے

معنی دراصل یقین کے ہیں۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

رَبَّنَا آيْتْنَا ذِيكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآيَاتُنَا بَرِّ

فَلَوْ بُهِمْ فَهُمْ فِي رَبِّهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿٥٥﴾ (توبہ: ۵۵)

تم سے اجازت وہی لوگ چاہتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے قلوب

ریب و شک میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے شک کی میں سرگرداں ہیں۔

اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے حقیقی معنی یقین کامل کے ہیں۔ اگر کسی

کے قلب میں شک ہے، اور دماغ تردد کا شکار ہے تو وہ مومن نہیں ہے کیونکہ ریب و تردد

ایمان کی ضد ہیں۔

قرآن میں جہاں ایمان کا لفظ بصورت فعل آیا ہے اور اس کے بعد متعلقات ایمان کا ذکر

کیا گیا ہے وہاں بالعموم ایمان کے معنی یقین ہی کے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ

هُمْ يُوقِنُونَ ﴿٢٠﴾ (البقرہ: ۲۰)

اور وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری ہے اور اس چیز پر بھی جو تم سے پہلے اتاری تھی (یعنی

کتاب الہی) اور جو آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:-

هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۗ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿٣٢﴾ (نمل: ۳۲)

ہدایت اور خوش خبری ہے ان مومنین کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت

پر یقین رکھتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں ”وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ“ کی جگہ ”وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ“

استعمال کیا گیا ہے حالانکہ اس سے پہلے دوسرے متعلقات ایمان کے لیے ”یؤمنون“ ہی کا

لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ کی اس تبدیلی کو اتفاقی بات نہ سمجھا جائے۔ قرآن خدا کا کلام ہے،

اس کا ہر لفظ اپنی جگہ انگوٹھی میں نیگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔ دراصل ایک جگہ ”یومنون“ اور دوسری جگہ ”یوقنون“ کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے یومنون کی تشریح کر دی ہے کہ اس سے مراد یقین ہے یعنی دل سے یقین رکھنا۔

اس تشریح سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بس دل سے یقین کر لینے ہی کا نام ایمان ہے۔ اس پر فصل گفتگو آگے آئے گی یہاں تو صرف اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ ایمان کا لفظ قرآن میں جہاں کہیں صلاً با کے ساتھ استعمال ہوا ہے بالخصوص متعلقات ایمان کے ذکر سے پہلے یوں اس کے معنی یقین کے بھی ہیں۔

صلاً لام کے ساتھ قرآن میں اس لفظ کا جہاں استعمال ہوا ہے وہاں اس کے ایک معنی تو بات مان لینے اور اطاعت و انقیاد کے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

قَالُوا آتُونَا كُفْرًا وَابْتِغَاءَ لِقَاءِ آلِ أَبِي لَهَبٍ وَابْتِغَاءَ مَا كَرِهُوا وَابْتِغَاءَ مَا كَرِهُوا ﴿۱۱﴾ (شعرا: ۱۱)

انہوں نے کہا کہ اے نوح کیا ہم تیری بات مان لیں جبکہ تمہاری پیروی کم تر درجہ کے لوگ کر رہے ہیں۔

دوسرے معنی تصدیق کے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً ﴿۵۵﴾ (البقرہ: ۵۵)

اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہاری تصدیق اسی وقت کریں گے یعنی تمہیں سچا سی وقت سمجھیں گے جب ہم اللہ کو (تم سے ہم کلام ہونے) پر بلا دیکھ لیں گے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُونَ لَنَا لَوْ كُنَّا آلَ اللَّهِ لَكُنَّا مِنَ الْآلِ الْغَائِبِينَ ﴿۱۰۰﴾ (آل عمران: ۱۰۰)

اے پیغمبران سے کہہ دو: تم معذرت نہ پیش کرو کہ ہم تمہاری معذرتوں کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ تم لوگوں نے تمہارے احوال واقعی سے باخبر کر دیا ہے۔

صلاً لام کے ساتھ ایمان کے تیسرے معنی اعتماد کرنے کے ہیں۔

وَيَقُولُونَ هُوَ أَدْنَىٰ مِمَّا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿۱۱۱﴾ (آل عمران: ۱۱۱)

وہ کہتے ہیں کہ وہ (رسول) کان کا کچا ہے کہہ دو کہ اس میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔ وہ خدا پر یقین

رکھتا ہے اور مومنوں پر اعتماد کرتا ہے اور تم میں جو واقعی صاحب ایمان میں ان کے لیے تو وہ سراپا رحمت سے۔

ایمان کا شرعی مفہوم

ہر زبان میں یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی لفظ مصطلحات کے زمرہ میں آجاتا ہے تو اس کے لغوی معنی بالعموم تبدیل ہو جاتے ہیں اور وہ ایک متعین معنی کے لیے خاص ہو جاتا ہے اس قاعدہ سے عربی زبان بھی مستثنیٰ نہیں ہے مثال کے طور پر لفظ صلوة اور زکوٰۃ کو لیجئے۔ یہ عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ ان کے لغوی معنی بالترتیب دعا اور پاکیزگی کے ہیں لیکن شرعی اصطلاح بن جانے کے بعد یہ الفاظ اپنے خود لغوی مفہوم سے نکل کر ایک دوسرے وسیع مفہوم کے لیے خاص ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اب ہم صلوة اور زکوٰۃ کے الفاظ بول کر ان سے صرف دعا اور پاکیزگی مراد نہیں لیتے بلکہ عبادت کی ایک مخصوص شکل و صورت مراد لیتے ہیں جس میں لغوی مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایمان کا لفظ بول کر اب ہم لغوی مفہوم سے کچھ زیادہ مراد لیتے ہیں یعنی اس کا اطلاق چند ایسی باتوں پر ہوتا ہے جنہیں ہم عقائد یا ایمانیاں کہتے ہیں۔

جب کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ ایمان لایا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے چند عقائد کو تسلیم کر لیا یا اس نے چند ایسے بنیادی امور کو قلب کے پورے یقین کے ساتھ تسلیم کر لیا جن کو تسلیم کیے بغیر وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ اسی کا نام شریعت میں ایمان ہے جسے اصطلاح میں تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان کہا جاتا ہے۔

شریعت کی رو سے جو شخص بھی دل سے خدا اور اس کے رسول پر اور اس کی آیات پر یقین رکھتا ہے اور ان تمام احکامات و ہدایات کو برحق سمجھتا ہے جن کے بارے میں اسے بالقریح معلوم ہے کہ یہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ہیں اور وہ زبان سے بھی ان کا معترف ہو اور اس کے اعمال بھی اس کے اس یقین قلب لورا اعتراف زبان سے حتیٰ الوسع مطابقت رکھتے ہوں، وہ مومن ہے۔ صرف اسی صورت میں وہ دائرہ ایمان سے خارج سمجھا جائے گا جب وہ اپنے قول یا فعل سے ان چیزوں کا انکار کر دے جن کو وہ پہلے صحیح اور برحق تسلیم کر چکا ہے۔

تکمیل ایمان کے شرائط

ہم نے اوپر کی سطروں میں ایمان کی جن تین شرطوں یعنی تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور اثبات بالعمل کا ذکر کیا ہے، وہ تینوں شرطیں تکمیل ایمان کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان میں سے کوئی شرط بھی عام حالات میں ساقط نہیں ہو سکتی ہے۔

ایمان کی یہ شرطیں بالکل اسی طرح کی ہیں جیسے دنیا کی تمام نظریاتی تحریکات میں شمولیت کے لیے کچھ شرائط و ضوابط کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اشتراک کی تحریک کا جو ایک نظریاتی تحریک ہے، رکن (Member) صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اس جماعت کے تمام اقتصادی و سماجی نظریات پر دل سے یقین رکھے، زبان سے ان کا اقرار کرے اور بقدر استطاعت ان نظریات کے مطابق اپنی زندگی گزارے، اور ساتھ ہی ان نظریات کے مطابق سماج میں تغیر و انقلاب لانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرے۔ سیاسی اصطلاح میں ایسے ہی اشخاص کو مستعد کارکن (Active worker) کہا جاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ اس بلند معیار پر پورے نہیں اترتے وہ جماعت کے رکن نہیں سمجھے جاتے۔ رکن وہ لوگ بھی سمجھے جاتے ہیں جو کسی دیکھی سطح پر جماعت کے نظریات کے وفادار ہوتے ہیں، اور اس کے ہر حکم و ہدایت پر مقدمہ و بھر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے شخص کو جماعت کا رکن نہیں سمجھا جاسکتا جو نہ تو جماعت کے نظریات پر یقین رکھتا ہو اور نہ اس کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی جدوجہد کرتا ہو، بلکہ ایسے کام کرنا ہو جو سراسر جماعت کے نظریے اور پالیسی کے خلاف ہوں حتیٰ کہ اسے جو حکم و ہدایت بھی جماعت کی طرف سے دی جائے اس کو نظر انداز کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو کوئی بھی نظریاتی جماعت اپنا رکن تسلیم نہیں کر سکتی۔ وہ پہلی فرصت میں اس کو منحرف قرار دے کر جماعت سے نکال دے گی۔ اس صورت میں کوئی اتحق ہی ہو گا جو کہے گا کہ اس کو جماعت سے نکال کر جماعت نے اس کے ساتھ کوئی نا انصافی کی ہے۔

کسی بھی جماعت کے مختلف اراکین میں جماعت کے نظریات اور پروگراموں پر یقین

اور اس کے مطابق عمل میں فرق مراتب تو ہو سکتا ہے، کیونکہ ہر شخص نہ یکساں ذہنی استعداد رکھتا ہے اور نہ یکساں قوت عمل ہی کا مالک ہوتا ہے، لیکن سرے سے یقین و عمل ہی کا فقدان ہو ایسا ناممکن ہے، اور اگر کسی رکن کے اندر یہ بات پائی جاتی ہے تو وہ یقیناً اس جماعت کا رکن بننے کا اہل نہیں ہے۔ معاملے کی یہی صورت ایمان اور جماعت مومنین کے ساتھ بھی ہے۔ اگر کوئی شخص جماعت مومنین کا رکن بننا چاہتا ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ جماعت کے نظریات (عقائد) پر دل سے یقین رکھے، زبان سے اُن کا اقرار کرے، اور اپنے عمل سے اخلاص ایمان کا ثبوت دے۔ یعنی جماعت کے اصول و نظریات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو بلاشبہ وہ جماعت مومنین کا رکن سمجھا جائے گا، اور اگر ایسا نہیں کرتا ہے تو وہ جماعت کا رکن نہیں ہو سکتا، خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو اس کا رکن ہونے کا کتنا ہی دعویٰ کرے۔

اس جماعت میں بھی جماعت کے بنیادی عقائد اور اس کے احکام اور دستور العمل پر یقین و اعتماد کے اعتبار سے حیثیات و مراتب کا فرق تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن جو شخص سرے سے اس جماعت کے عقائد اور اصول و ضوابط پر یقین ہی نہ رکھتا ہو، اور زندگی کے ہر معاملے میں جماعت کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتا ہو، وہ جماعت مومنین سے خارج سمجھا جائے گا خواہ اس کا نام اور حسب نسب کچھ بھی ہو۔

نظریاتی جماعتوں سے وابستگی کی بنیاد یقین و عمل پر ہے نہ کہ حسب نسب پر۔ دین اسلام ایک نظریاتی تحریک کا نام ہے اس لیے اس سے وابستگی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصول و نظریات پر دل سے یقین رکھا جائے، زبان سے اس کی صداقت کا اعتراف کیا جائے، اور اس صداقت کو خود اپنی زندگی میں اور معاشرے میں نافذ اور غالب کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔

تکمیل ایمان کے ان تینوں شرطوں کی ہم حرید و وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے تمام اطراف و جوانب واضح ہو جائیں، اور کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

۱۔ تصدیق بالقلب

یہ تکمیل ایمان کی اولین اور بنیادی شرط ہے، یعنی قلب کا اذعان و یقین جو شخص بھی ایمان سے

مشرّف ہونا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پورے صمیم قلب سے متعلقات ایمان پر یقین و اعتماد رکھے۔ اس یقین و اعتماد کے بعد ہی وہ حقیقی مومن سمجھا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا.....

(الحجرات: ۱۵)

حقیقی مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اس یقین قلب کے متعلق فرماتے ہیں:

”عربی میں ایمان کے معنی زوالِ شک کے ہیں یعنی کامل درجے کا بھروسہ، کامل درجے کا اقرار تمہارے دلوں میں پیدا ہو جائے۔ اللہ کی صداقت پر اللہ کے اصولوں پر جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے تو تمہیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے، تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی، اس کی سب سے بڑی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان یعنی یقین، جماؤ، تسکین اور اقرار پیدا ہو۔“

یقین علم کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ آگ جلاتی ہے اس پر ہلا یقین تمام تر ہمارے علم و تجربہ کا نتیجہ ہے۔ اور اسی یقین کی وجہ سے ہم ہوش و حواس کے عالم میں کبھی آگ میں اپنی انگلی نہیں ڈالتے، لیکن ایک کم سن بچہ بے خوف و خطر آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ آگ جلاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر علم نہیں ہے تو قلب و دماغ میں یقین و اعتماد پیدا نہیں ہو سکتا، اور ایمان قلب و دماغ کے یقین و اعتماد ہی کا نام ہے۔ اس لیے ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن چیزوں پر ایمان رکھتا ہے ان کے متعلق بقدر استعداد علم بھی حاصل کرے، اور غور و فکر بھی کرتا رہے۔ مگر ایمان میں جھنگلی پیدا ہوا اور قلب و دماغ حلاوتِ ایمان سے صحیح طور پر آشنا ہو سکیں وہ علم جو ایک مومن کے قلب و دماغ کو طائیت اور یقین و اعتماد کی روشنی عطا کر سکتا ہے، النفس و آفاق کا مشاہدہ ہے۔ ایک مومن جو جن

انفس و آفاق کی وادی میں غور و فکر کے قدم بڑھانا ہے اس پر حقیقت حال منکشف ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اصل حقیقت کو پالتا ہے اور اس کا قلب و دماغ یقین و اطمینان کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

لَا تۡ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الْيَلِيِّ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ
اَدۡوٰى اِلَّا لِبٰٓءِ ۙ الَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قَلِيۡمًا وَّ تَعُوۡذًا وَّ
عَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ وَيَتَفَكَّرُوۡنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ رَبَّنَا
مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۗ سُبْحٰنَكَ قَتَمْنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

(آل عمران: ۱۹۱)

بیشک زمین اور آسمانوں کی تخلیق اور گردشِ سیل و بہذ میں نشانیاں ہیں ان عقل مندوں کے لیے جو کھڑے بیٹھے اور بیٹھے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور زمین اور آسمانوں کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں (غور و فکر کے نتیجے میں وہ حقیقت حال سے باخبر ہو کر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ (کائنات) فضول نہیں بنائی ہے۔ کار فضول سے تیری ذات پاک ہے۔ تو ہمیں عذاب و سزا سے بچا۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا ایک مومن کے یقین قلب اور عرفان حقیقت کا مظہر ہے۔ یہ مکتوباتِ ارض و سما کا مشاہدہ ہی تو تھا جس نے ابراہیم علیہ السلام کے آئینہ قلب کو چمکی اور ان کے سینے کو یقین و اطمینان کے انوار سے بھر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيۡ اِبْرٰهِيۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَّ
لِيَكُوۡنَ مِنَ الْمُوۡقِنِيۡنَ ۝ (انعام: ۷۵)

اور اِس طرح ہم نے ابراہیم کو زمین اور آسمانوں کے نظم و اقتدار کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ یقین و اعتماد کا حامل بن جائے۔

قرآن میں جگہ جگہ جو تخلیقِ ارض و سما پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اس سے مقصود بھی یہی ہے کہ انسان کو معرفت کر دگا اس طرح حاصل ہو کہ اس کا قلب و دماغ یقین و اعتماد سے لبریز ہو جائے، بالفاظِ دیگر خالق کائنات یہ بتانا چاہتا ہے کہ علم کے راستے ہی سے ایک انسان بقدرِ ظرف اس کا

عرفان حاصل کر سکتا ہے۔

یہ بات کہ علم ہی ہمارے یقین قلب و دماغ کا ذریعہ ہے، بالکل مشابہاتی حقیقت ہے۔ آپ کسی پیدائشی اندھے اور بہرے آدمی کے سامنے خالقِ ارض و سما کی عظمت و کبریائی اور اس کے حسن تخلیق کا لاکھ قصیدہ پڑھیں، وہ خدا کی عظمت و رفعت اور اس کی تخلیق کی ندرت کاریوں سے بالکل بے خبر ہوگا، کیونکہ علم کے دو بڑے ذریعے یعنی بصارت و سماعت اس کے پاس موجود نہیں ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حواس تو صحیح حالت میں ہوتے ہیں لیکن انسان دنائتِ نفس اور جہل و بے باہمی کے سبب اُن سے صحیح طور پر کام نہیں لیتا مثلاً وہ آنکھ رکھتے ہوئے آثار و مظاہر کائنات پر غور و فکر نہ کرے، اور اُن سے اس طرح صرف نظر کر جائے جیسے اندھا، اسی طرح قوتِ سماعت تو رکھتا ہو لیکن رب کائنات کے ارشادات اور اس کے انبیاء و رسل کے فرمودات کو سن کر اس طرح بے خبر بن جائے جیسے بہرا، اسی طرح قلب تو رکھتا ہو لیکن اس جہانِ فانی کے کسی حادثے اور کسی واقعے سے بھی وہ ذرہ برابر منفعل نہ ہوتا ہو جیسے کوئی سنگِ دل انسان۔ ایسے شخص کو قرآن جانور سے بھی بدتر قرار دیتا ہے، کیونکہ وہ اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے اور خواہشاتِ نفس ہی کو اپنا معبود بنا کر اسی کی پرستش میں شب و روز مشغول رہتا ہے، ایک جگہ فرمایا:

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ ؕ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكَيْلًا ۚ أَمْ تَحْسَبُ
أَنْ أَكْثَرُهُمْ يَتَّبِعُونَ ۚ أَوْ يَعْضِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ
سَبِيلًا ۚ (الفرقان: ۲۴)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا لیا ہے؟ کیا تم اس پر گمبیاں ہو؟ یا تم سمجھے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور عقل سے کام لیتے ہیں۔ وہ تو صرف جانور ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ (حقیقت حال سے) بے خبر اور گم گشتہ راہ ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا
وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (اعراف: ۱۷۹)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ان کے دل میں لیکن سمجھے نہیں ان کے آنکھیں میں لیکن دیکھتے نہیں ان کے کان میں لیکن سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ کھونے ہوئے یہ وہ لوگ ہیں جو ہر نام غصت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خدا کی بخشی ہوئی عقل اور دوسرے ذرائع علم سے کام نہیں لیتا ہے اس کے قلب کو صحیح معنوں میں ایمان یعنی قلب کا نور کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ فی الواقع ایمان کا پہلا مرحلہ جو یقین قلب سے عبارت ہے، وہی شخص محسن و خوبی طے کر سکتا ہے جو علم و نظر کی قیول سے بہرہ مند ہوگا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان صرف علم و یقین ہی کا نام ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ابلیس بھی مومن ہوتا کہ اسے بھی معرفت رب حاصل تھی۔ فرعون بھی صاحب یقین تھا۔ اس کو کبھی طرح معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کے فرستادہ رسول ہیں اور وہ جو نشانیاں اپنی رسالت کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں وہ برحق ہیں لیکن اس علم و یقین کے باوجود وہ مومن نہ تھا۔ اس کے علم و یقین کے متعلق خود قرآن مجید میں آیا ہے:

فَلَمَّا جَاءَهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۚ وَبَحَّذَا
بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (نمل ۱۳-۱۴)

جب ہماری نشانیاں ان کے سامنے آگئیں تو انہوں نے کہا "یہ تو کھلا جادو ہے" وہ علم اور بڑائی کے گمنام میں آیات کا انکار کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کے نفوس نے (ان نشانیوں کے من جانب اللہ ہونے کا) یقین کر لیا تھا۔

فرعون کے سلسلے میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی قرآن مجید میں موجود ہے:

لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا أَنْزَلْنَا هَؤُلَاءِ وَإِلَّا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصِيرٌ ۚ وَإِنِّي
لَأَكْظِمُّكَ يَفِزَعُونَ مَثُورًا ۝

تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں زمین اور آسمانوں کے رب کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں۔ اور اے فرعون میں تم کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔

اس علم و یقین کے باوجود وہ مومن کیوں نہیں تھا؟ صرف اس لیے کہ اس کے نفس

نے اقرار نہ کیا اور زبان تصدیق سے گریزاں رہی۔ اصل بات یہ ہے کہ جب نفس بے لگام ہو جاتا ہے اور آدمی کے قلب و دماغ میں سرکشی اور نخوت و استکبار سرایت کر جاتا ہے تو وہ علم و یقین کے باوجود صداقت کو تسلیم نہیں کرتا، کیوں کہ صداقت کو تسلیم کر لینے کے بعد نفس کی بے عنایتی اور تمرد و سرکشی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تصدیق کے بجائے تکذیب کی جو عمارت اس نے کھڑی کر رکھی ہے اس کے گر جانے کے بعد چونکہ خود اس کی اپنی ذات اور ساکھ کے گر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے علم و یقین کے باوجود وہ تکذیب کی روش نہیں چھوڑتا اور جھوٹی عزت و وقار کی خاطر وہ صداقت کا گلا گھونٹ دینے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتا۔

بعض اوقات آدمی علم و معرفت کے باوجود صرف بغض و حسد کی وجہ سے صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ نبی اسرائیل اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے فرستادہ اور اس کے آخری نبی اور رسول ہیں، لیکن اس کے باوجود صرف قومی افتخار اور نسلی غرور کی وجہ سے وہ آپ کی رسالت کے منکر بن گئے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ

(البقرہ: ۶۹)

پس جب وہ ان کے پاس آگیا جس کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے تو اس کے منکر بن گئے۔ منکرین حق پر خدا کی پھینکار ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجرد علم و یقین ایمان کے لیے کافی نہیں ہے۔ علم و یقین کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ جس بات کا اسے علم و یقین ہو چکا ہے دل سے اس کی صداقت تسلیم کرے۔

۲۔ اقرار باللسان

یہ تکمیل ایمان کی دوسری شرط ہے یعنی جس چیز کا یقین قلب کو حاصل ہو چکا ہے اس کا اقرار و اعتراف زبان سے بھی کیا جائے۔ زبان سے اقرار و اعتراف دراصل تصدیق قلب کی شہادت ہے اور اس بات کی علامت کہ مقرر کے جذبات اور ارادوں نے بھی اطاعت قبول کر لی ہے۔ اور یہی ایمان کی اصل ہے۔ قرآن کی درج ذیل آیات، علم و معرفت اور شہادت قلب کی ایک نہایت عمدہ مثال ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

وَإِذَا سَبَعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ
مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ، يَقُولُونَ رَبَّنَا كُنْتُمَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝
وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ ، وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا
رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ۝ فَأَنشَأَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّتِ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ، وَذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝

(انہ : ۸۵)

جب انہوں نے اس کلام کو جو رسول کی طرف نازل کیا گیا ہے، سنا تو تم نے دیکھا کہ معرفت حق کے نتیجے میں ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور وہ کہہ اٹھے ”اے ہمارے رب ہم ایمان لائے، ہمارا نام حق کے گواہوں میں لکھ لیجئے۔ جب حق ہمارے پاس آگیا تو پھر ہم اس پر ایمان کیوں نہ لائیں؟ یہ ہماری دنیٰ آرزو ہے کہ ہمارا رب ہم کو صلوات کے زمرہ میں داخل فرمائے۔ اللہ نے ان کے اس قول (شہادت) کے سبب ان کو جنت عطا کی جس میں نہریں رواں ہیں، اور جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ نیک عمل کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ معرفت حق کا اثر کس طرح اشکوں کی روانی کی صورت میں اظہار ہوا۔ ادھر قلب، جذبہ حق شناسی سے پر جوش ہوا اور ادھر زبان پر یہ کلمہ بے اختیار جاری ہو گیا۔ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُئِبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ

اس سے معلوم ہوا کہ قول جذبات دل کا ترجمان ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص دل میں اللہ اس کے رسول اور اس کی آیات کا علم و یقین تو رکھتا ہے لیکن زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتا تو ایسا شخص اہل ایمان کی نگاہ میں مومن نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ ایمان کا محل قلب ہے اور جب تک آدمی اپنی زبان سے اس کا اظہار نہ کرے کوئی شخص اس کے درون دل کا حال نہیں جان سکتا۔ علم و یقین کے بعد زبان سے اقرار و تسلیم لازماً ایمان ہے اور باہمتنا ہے چند اس سے کسی صورت سے بھی مفرک نہیں ہے۔ استثنائی صورت خوف جان کی ہے۔ اگر اظہار ایمان سے کسی شخص کو اپنی جان کا خوف ہو تو شریعت اس کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے ایمان کو مخفی رکھے، اور ایسے شخص کو قرآن نے مومن قرار

دیا ہے مثلاً ایک جگہ آیات :

وَأُولَٰئِكَ رَجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنَسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّنَّ تَعْلَمُوهُنَّ أَنْ تَطَّوُّهُنَّ

فَتُصْنِبِكُمْ مِنْهُنَّ مَعْرَةً يُغْنِيَنَّ عَنْكُمْ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن لَّشَاءَ

(فتح: ۲۵)

اگر ایسے مومن مرد اور مومن عورتیں جن سے تم واقف نہ تھے (مکین) موجود نہ ہوتے، جن کو

(لالائی کی صورت میں) تم یا مال کر ڈالتے، پس ان کے باعث تم پر لازم آتا ہے مصلحت کے سبب

(تو تم جنگ کی اجازت دے دیتے، لیکن خدا نے صلح کے ذریعہ اس مصلحت سے لڑائی نہ ہونے

دی کہ) خدا (اس عرصہ میں) جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔

اس آیت میں ان لوگوں کو بھی مومن قرار دیا گیا ہے جن کے ایمان کا حال کسی کو بھی معلوم نہ

تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوف جان کی صورت میں اگر کوئی شخص اپنے ایمان کا اظہار نہیں کرتا تو وہ

عند اللہ مومن سمجھا جائے گا خواہ بندوں کے نزدیک مومن نہ ہو کہ بندہ اظہارِ ایمان کے بعد ہی کسی

کے ایمان کے متعلق کچھ جان سکتا ہے۔

مذکورہ آیت کا تاریخی پس منظر سامنے ہوا تو احناف نے ایمان کی حقیقت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا

ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کا معاملہ اس وقت پیش آیا تھا جب مسلمان آنحضرت کے ہمراہ

۳۰ ص ۱۱ میں عمرہ کی غرض سے مکہ گئے تھے لیکن کفار مکہ نے قومی حمیت کے جوش میں آکر مسلمانوں کو

مکہ کے اندر داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ شہادت عثمان کی خبر اور بعض دوسرے محرکات کے

سبب قریب تھا کہ مسلمانوں اور کافروں میں آتش جنگ بھڑک اُٹھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی

قدرت کاملہ اور حکمت بانفہ سے اس جنگ کو روک دیا۔ جنگ روکنے میں اللہ کی مصلحت یہ تھی کہ

مکہ کے اندر ابھی ایسے لوگوں کی قابل ذکر تعداد موجود تھی جو اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن کفار مکہ کے جو

ستم اور خوف جان و مال کے سبب اپنے ایمان کو چھپانے ہوئے تھے، اس میں عورتیں اور مرد دونوں

شامل تھے۔ لڑائی کی صورت میں عین ممکن تھا کہ یہ صاحب ایمان افراد بھی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے

جاتے اور انہیں اس سے ندامت ہوتی اور تکلیف پہنچتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے جنگ روک دی

تاکہ جو لوگ ایمان لائے، وہ کشت و خون سے محفوظ رہیں، اس میں ایک حکمت اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ جو

ابھی ایمان نہیں لائے، ان کو بھی سعادت ایمانی سے بہرہ مند ہونے کا مزید موقع مل جائے۔ اسی بات

کواہت مذکورہ میں ”دخول فی رحمۃ اللہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اخٹائے ایمان کی ایک دوسری مثال سورہ مومن کے اندر موجود ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ: مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا
أَنْ يَقُولَ رِيقِي اللَّهِ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ؟ (المومن: ۲۸)

آل فرعون سے تعلق رکھنے والے ایک مرد مومن نے جو اپنا ایمان مخفی رکھے ہوئے تھا کہا: کیا تم ایک آدمی کو کھنص اس بنا پر قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ خدا ہی کو اپنا رب قرار دیتا ہے اور حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلائل بھی لایا ہے:

موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر قوم فرعون کا بھی ایک شخص ایمان لایا تھا۔ لیکن فرعون کے ظلم کی وجہ سے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا اس کے باوجود جب اس نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ضروری سمجھا تو اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ دعوت حق کی حمایت میں اس نے اپنی قوم کے سامنے جو پراثر تقریر کی وہ قرآن مجید میں اسی سورہ کے اندر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تقریر پند و موعظت اور دانش و بصیرت کا بے نظیر نمونہ ہے۔ تقریر کا ایک ایک لفظ اس کے ایمان کی شہادت دیتا ہے۔ اس تقریر کا آخری کلام اظہار ہو کس قدر دردناک و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَوْمَئِذٍ يُقَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِيكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ۚ يَوْمَ
لَا نُنَا هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۚ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۚ مَنْ
عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ دُونِ
أَوْ أُنْثَىٰ ۚ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرِزُونَ فِيهَا بِغَيْرِ
حِسَابٍ ۖ وَيَقَوْمٍ مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى التَّجْوَعِ وَ تَدْعُونَنِي إِلَى
النَّارِ ۚ تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَ أَشْرِكُ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ
وَ أَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْعَقَّارِ ۚ لَا جَرَمَ أَنَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ
لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ ۚ وَأَنْ مَّرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَ
أَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ فَتَذَكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُقْوِصُ
أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۖ (المومن: ۲۸-۳۸)

وہ شخص جو ایمان لایا تھا بولوا! اے میری قوم! میری بات مانو، میں تمہیں ہدایت و سعادت کی راہ بتاتا ہوں۔ اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی صرف متاعِ چند روزہ ہے اور آخرت ہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔ (یا رکھو) جس نے برائی کی ہے اس کو برائی کے بقدر بدلہ ملے گا اور جس نے اچھا عمل کیا ہے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے جہاں انھیں بے حساب روزی ملے گی۔ اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تو تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے دوزخ کی طرف بلاتے ہو۔ تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھہراؤں جن کا مجھے علم نہیں اور میں تمہیں اس ہستی کی طرف بلاتا ہوں جو نہایت ہی زبردست اور محانت کرنے والی ہے۔ بلاشبہ تم مجھے جس چیز کی طرف بلاتے ہو وہ نہ تو دنیا میں پکارسے جانے کے قابل ہے اور نہ ہی آخرت میں، اور بلاشبہ ہم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں وہ دوزخ میں جائیں گے۔ میں آج جو کچھ تم سے کہتا ہوں مفتریب تم اسے یاد کرو گے (کہ میں اپنے قول میں کتنا سچا تھا) اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اللہ ہی اپنے بندوں کا گہیان ہے۔

جس استثنائی صورت کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یعنی خوفِ جان، اس کے سوا ہر حال میں ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ تصدیقِ قلب کے ساتھ زبان سے بھی ایمان کا اقرار و اعتراف کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ علم و یقین کے باوجود مومن نہیں ہو سکتا۔ ایسا علم و یقین خود صاحبِ یقین کے خلاف حجت ہے۔

۳۔ اثباتِ بالعمل

یہ تکمیلِ ایمان کی تیسری شرط ہے یعنی یقینِ قلب اور اقرارِ لسان کے ساتھ مومن اپنے عمل سے بھی ایمان کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے، کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک آدمی کے قلب میں تصدیق موجود نہ ہو لیکن وہ زبان سے تصدیقِ ایمان کر رہا ہو۔ چونکہ قولِ جھوٹ ہو سکتا ہے اس لیے تکمیلِ ایمان کے لیے اس تیسری شرط کی تکمیل ناگزیر ہے۔ اس کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی

واقعی مومن ہے، کیونکہ اعمال کا تعلق انسان کے قلب سے ہوتا ہے جو جذبات اور ارادوں کا مصدر و منبع ہے۔ گویا اعمال کے آئینہ میں قلب کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے کہ اس میں فی الواقع تصدیق ہو چوڑے یا نہیں۔ اگر صرف زبان سے اقرار ایمان کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝
يُخَدِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا، وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝

(بقرہ: ۹۸)

کہے لگ ایسے بھی ہیں جو (زبان سے) اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں مگر حلاکہ وہ مومن نہیں ہیں وہ (زبان سے) اقرار ایمان کر کے اللہ اور مومنوں کو فریب دینا چاہتے ہیں مگر اللہ وہ خود مبتلائے فریب میں اور اس کو سمجھتے نہیں۔

قرآن مجید کی یہ آیت سورہ بقرہ کی بالکل ابتدائی آیات میں ہے اور اس میں جس گروہ کو ایمان کے زبانی اقرار کے باوجود مومن نہیں کہا گیا ہے وہ یہودیوں کا ایک گروہ تھا۔ ان کے ایمان کی نفی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ آخری نبی کی رسالت کے منکر تھے اور دوسری وجہ اقرار ایمان کے باوجود ان کی سرکشی و نافرمانی تھی۔ اللہ نے ان کو خبردار کیا کہ تم صرف زبان سے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے سے مومن نہیں سمجھ لیے جاؤ گے جب تک کہ ان کے تقاضوں پر صدق دل کے ساتھ عمل نہیں کرتے۔ آگے کی آیات میں ان کے تمام جرائم کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ کر بیان کر دیا گیا ہے یعنی فساد فی الارض:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ إِلَّا أَنَّهُمْ هُمُ الْفٰسِدُونَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (بقرہ: ۱۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری دوزخوں کا مقصد فتنہ و فساد نہیں، ہم تو اصلاح چاہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہی اصل مفسد و بدکار ہیں مگر جہالت و نفس پرستی کی وجہ سے اپنی مفسدانہ حرکات کو فتنہ و فساد نہیں سمجھتے۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ بھی صرف زبان سے اقرار ایمان کو کافی قرار نہیں دیا گیا ہے،

ارشاد ہے:

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ

مَنْ بَعْدَ ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ (سورہ نور: ۴۰)

اور دیکھو یہ لوگ کہتے ہیں: ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کی۔ پھر اس اقرار کے بعد انہی میں ایک ذریعہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی تعمیل سے، روگردانی کرتا ہے۔ فی الحقیقت ایسے لوگ سرے سے مومن ہی نہیں ہیں۔

اس آیت میں زبان سے اقرار ایمان اور اظہار اطاعت کے باوجود کچھ لوگوں کو مومن تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اس لیے کہ انہوں نے اقرار ایمان کے بعد اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل سے روگردانی کی۔

قرآن میں ایک اور جگہ ایسے لوگوں کو مومن قرار نہیں دیا گیا ہے جو زبان سے کہتے تھے کہ وہ مومن ہیں، اور یہ لوگ عرب کے بدو تھے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ نُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَآتِيَنَّكُمْ مِنَ اللَّهِ عَفْوَ وَرِجْءٌ

(حجرات: ۱۴)

بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے (سیاسی) اطاعت قبول کر لی ہے، اور ابھی تک ایمان تمہارے قلب میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم (واقعی دل سے) اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو تو وہ تمہارے اعمال میں کثر بونت دکرے گا۔ بیشک اللہ درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایمان کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ انسان کے قلب سے ہے یعنی آدمی صرف زبان سے اقرار تسلیم کی بات نہ کرے بلکہ دل سے اقرار واعتراف کر لے اور عمل سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے۔ اللہ نے بدوں کو بتایا کہ تم زبان سے تو ایمان کا اقرار کرتے ہو اور تم نے ظاہر میں اطاعت بھی قبول کرنی ہے، لیکن اس کے باوجود تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے سے جی چراتے ہو، اور اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ اور اس کے رسول کے حکموں سے زیادہ عزیز سمجھتے ہو، یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارا ایمان سچا نہیں ہے۔ تم نے دل سے اللہ اور اس کے رسول کو نہیں مانا ہے بلکہ صرف حالات کے دباؤ کی وجہ سے سیاسی اطاعت قبول کر لی ہے، اور

مومنوں کے زمرہ میں شامل ہو کر صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہو۔
 قلب میں دخول ایمان سے قرآن مجید کی مراد خلوص دل اور جذبہ نیک نیتی کے ساتھ
 ایمان الٹا ہے نہ کہ صرف دکھاوے کے لیے زبان سے اظہار ایمان کرنا۔ اگر بہتہ دل سے ایمان لائے
 ہوتے تو پھر ان کی خواہشات اور ارادے جن کا مصدر قلب ہے، اللہ اور اس کے رسول کے حکم
 کے تابع ہو جاتے، اور وہ اپنے برغل میں اپنی خواہش و مرضی کے بجائے اللہ اور اس کے رسول کی
 خواہش و مرضی کو مقدم رکھتے۔

قرآن میں ایک اور مقام پر زبان سے اقرار ایمان کی نفی کی گئی ہے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا
 آمَنَّا بِأَمْوَالِهِمْ وَالَهُمْ قُلُوبُهُمْ

(سورہ: ۱۰۷)

اے رسول وہ لوگ جو انکار حق میں سرگئی دکھا رہے ہیں تم ان کی حرکات سے بخندہ مت ہو۔
 یہ تو وہ لوگ ہیں جو صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور ان کے دل حقیقی ایمان سے
 قطعاً محروم ہیں۔

اس آیت میں ان کے ایمان کی نفی ان کے اعمال کی وجہ سے کی گئی ہے۔ اگر ان کے
 قلوب واقعی لذت ایمان سے آشنا ہوتے تو پھر ان کی روش منکرین حق کی روش سے قطعاً
 مختلف ہوتی۔ ان کی ساری سعی و طلب حق کے لیے اور صرف حق کے لیے ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں
 ہے۔ ان کی تمام جدوجہد اور شب و روز کی مصروفیات صاف بتا رہی ہیں کہ وہ حق کے مقابلے
 میں کفر کے ہاتھی ہیں۔ وہ حق کا فروغ نہیں چاہتے بلکہ کفر (انعام باطل) کا بول بالا چاہتے ہیں
 (يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ) یہ چیز سرسر ایمان کے منافی ہے۔ اگر وہ دل سے ایمان لائے ہوتے تو
 ان کی ساری تگ و دو اور جانفشانی اللہ کے راستے میں ہوتی اور اپنی جان اور مال سے کل حق کی
 سربلندی کے لیے کوشاں ہوتے، کیونکہ یہی مومن کی ہی شان امتیاز ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔
 إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَنُوتُوا بَأَيِّ
 جَهْدٍ دَا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ

الضُّدِ قَوْلًا ۞ (حجرات: ۱۵)

بیشک مومن تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر دل سے ایمان رکھتے ہیں اور خدا بھی شک نہیں کرتے اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کے راستہ میں جدوجہد کرتے ہیں یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب قلب میں ایمان داخل ہوتا ہے تو اس کا ہر عمل اس کے صدق و اخلاص کی شہادت دیتا ہے۔ عمل دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تو وہ جس کا تعلق صرف خارجی اعضاء، بدن سے ہوتا ہے، اور دوسرا وہ جس میں اعضاء کی حرکت کے ساتھ جذبہ دل کی حرارت بھی شامل ہوتی ہے۔ جب فعل کا صدور صرف اعضاء و جوارح سے ہوگا تو اس میں سرگرمی، جوش و ولولہ اور تسلسل نہیں ملے گا، اور اسی حالت کو ہم بے دلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب فعل کا صدور دل سے ہوگا یعنی اعضاء کی حرکت میں جذبہ دل کی تپش اور روح کا سوز و گداز بھی شامل ہوگا تو اس میں جوش و ولولہ، مگر جوشی و مستعدی، ایثار، جان و مال اور تو اتر عمل کی شان ملے گی۔

اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ مومن ہے تو اس کی روزمرہ کی زندگی اور اس کے معمولات و مشاغل کو دیکھ کر آسانی کے ساتھ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کا دعوائے ایمان صرف زبان سے بے یا اس میں اخاص اور جذبہ دل بھی شامل ہے بشرطیکہ وہ مومن ہونے کا حقیقی مفہوم بھی جانتا ہو۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصود آپ کو صرف یہ بتانا تھا کہ فقط زبان سے یہ کہہ دینا کہ ہم ایمان لائے کافی نہیں ہے۔ آپ کا ایمان اُسی وقت مقبر سمجھا جائے گا جب قول کے ساتھ آپ کا فعل بھی ایمان کی شہادت دے۔ اگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ سنکھیا مہلک شے ہے تو لازماً اس کا عمل بھی اس کے قول کے مطابق ہوگا یعنی وہ کبھی بقیہ ہوش و حواس سنکھیا کو حلق کے نیچے نہیں لے جائے گا۔ اسی طرح جو شخص اپنی زبان سے خدا کو اپنا خالق و مالک تسلیم کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی حکم عدلی کے نتائج ایک دن مہلک نکلیں گے، وہ کیونکر دیدہ و دانستہ خدا کی نافرمانی کر سکتا ہے؟ اور اگر نافرمانی کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے قول میں جھوٹا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے جزیرہ کے عامل عدی ابن عدی کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں ایمان کی حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ فرمان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

ایمان چند عقائد، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے جس شخص نے ان تمام اجزاء کی تکمیل کر لی اس نے ایمان کو مکمل کر لیا اور جو ان کی تکمیل نہ کر سکا اس نے ایمان کو مکمل نہیں کیا۔ اگر میں بقید حیات رہا تو ان تمام اجزاء ایمان کو کھول کر تمہارے سامنے بیان کروں گا تاکہ تم لوگ ان پر عمل کرو۔ اور اگر میں اس دار فانی سے رحلت کر گیا تو مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی کوئی خواہش بھی نہیں۔“

اس سے یہ بات واضح ہے کہ ایمان نہ صرف یقین قلب کا نام ہے اور نہ صرف اقرار زبان کا بلکہ ایمان قلب اور اظہار عمل تینوں سے عبارت ہے۔ بقدر استعداد ان امور ثلاثہ کی تکمیل کے بعد ہی ایمان کامل ہوتا ہے اور ایک شخص حقیقی مومن کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔

ایمان کے اجزائے ترکیبی

ایمان جن اجزائے مرکب ہے ان کی تعداد پانچ ہے:

۱۔ اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان۔

۳۔ رسولوں پر ایمان۔

۴۔ آسمانی کتابوں پر ایمان۔

۵۔ یوم آخرت پر ایمان۔

جہی پانچ امور ایمان کے اجزائے ترکیبی کہلاتے ہیں اور انہیں کو ہم عقائد سے موسوم کرتے

سہ تاریخ نبوی ص ۲۰۳۔

سہ قرآن مجید میں انہیں پانچ امور کو ایمان کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے لیکن قرآن مجید کے بعض اشعار اور چند احادیث سے معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ حدیث عشر سے بھی واضح ہے) کہ فقہاء بھی جزو ایمان ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ایمان کے ایک مستقل جزو کی حیثیت سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ ایمان بالقرآن دراصل ایمان باللہ ہی کا ایک جزو ہے۔ اس پر ایمان سے مقصود اللہ کے لائتہا علم و قدرت کو تسلیم کرنا ہے۔ شانہ ولی اللہ محدث دہلوی (بقیہ ماثر اعلیٰ ص ۱۰۶)

ہیں۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے جس سے ایمان کے اجزائے ترکیبی پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

” ایک دن ہم کچھ صحابہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت آؤں گا میں حاضر ہوں کہ دفعتاً ایک ایسا شخص داخل ہوا جس کا لباس غیر معمولی طور پر سفید تھا اور بال گہرے سیاہ۔ اس پر سفر کے اثرات ذرا بھی نمایاں نہیں تھے اور ہم میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا (کہ کون ہے) آتے ہی وہ بڑی تکلفی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا اور تھیلیاں اپنی رانوں پر رکھ لیں پھر سوال کے انداز میں بولا:

” اے محمدؐ مجھے خبر دیجئے اسلام کیا ہے؟“

حضور نے جواب دیا: ”اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کا رسول ہے۔ اور یہ کہ تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور استطاعت ہو تو خانا کعبہ کا حج کرو۔“
یہ شخص بولا ”آپ نے ٹھیک کہا۔“

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ شخص خود ہی سوال کر رہا ہے اور خود ہی جواب کی تصدیق اور توثیق بھی کر رہا ہے۔

اس نے حضورؐ سے پوچھا ”اچھا یہ بتائیے ایمان کیا ہے؟“

حضورؐ نے ارشاد فرمایا ”ایمان یہ ہے کہ تہ دل سے یقین رکھو اللہ کا، اس کے فرشتوں کا اس کی نازل شدہ کتابوں کا اس کے رسولوں کا، یوم آخرت کا اور اس بات کا کہ خیر ہو یا شر ب کچھ پہلے سے مقدر ہے۔“

اس شخص نے پہلے ہی کی طرح اس کی بھی تصدیق کی۔

حدیث کافی طویل ہے جس میں احسان اور علامات قیامت کے متعلق بھی سائل کی

طرف سے استفسار کیا گیا ہے۔ یہ مسائل حضرت جبرئیل تھے۔ اس کی خبر خود حضور نے صحابہ کو مسائل کے چلے جانے کے بعد دی۔

یہی حدیث تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ بخاری اور ترمذی میں بھی روایت ہوئی ہے۔ بخاری میں اس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور ترمذی میں حضرت ابن عمرؓ، لیکن انھوں نے حضرت عمرؓ کے واسطے سے ہی اسے روایت کیا ہے۔

ایمان کے اجزائے ترکیبی کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

اَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَ الْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ اَمِنَ بِاللّٰهِ وَ
 مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ (البقرہ: ۲۸۵)

جو کچھ اللہ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان رکھتا ہے اور
 مومنین بھی سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر ایمان
 رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم رسولوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لَكِنَّ
 الْبِرَّ مَنَ اَمِنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلَائِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيِّنَّ
 یعنی اس کا نام نہیں ہے کہ تمہارا رخ مشرق کی طرف ہو یا مغرب کی طرف بلکہ اللہ، یوم آخرت
 فرشتوں، کتابیں، اور نبیوں پر ایمان رکھنا ہی اصل نیکی ہے۔

حدیث عمرؓ اور قرآن مجید کی مذکورہ آیتوں سے آپ نے اچھی طرح جان لیا ہو گا کہ ایمان
 کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؛ انہیں اجزا پر دل سے ایمان رکھنے اور زبان سے ان کا اقرار کرنے
 اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام شریعت میں ایمان ہے۔ جس نے ایمان کے ان بنیادی اُمور
 کو یقین قلب کے ساتھ تسلیم کر لیا اور ان کے مقتضیات پر عمل پیرا ہو گیا وہ مومن ہے۔

اجزائے ایمان کی مختصر تشریح

ایمان کے لغوی اور شرعی مفہوم کی وضاحت نیز اجزائے ایمان کے ذکر کے بعد اب ہم

اجزائے ایمان کی مختصر تشریح کریں گے تاکہ آپ کا ذہن و قلب ایمان کی اصل حقیقت سے آشنا ہو سکے کیونکہ ان کی حیثیت اساس دین کی ہے۔ ان کی اصل حقیقت کو سمجھ بغیر نہ تو آپ کا ایمان مکمل ہوگا اور نہ آپ فکر و عمل کی لہزشوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔ صحیح فکر اور حسن عمل کا تمام تراخضار ایمان کے صحیح تصور پر ہے۔ آج مسلمانوں اور دیگر اقوام عالم کی تمام فکری اور علمی کمزوریوں کی واحد وجہ حقیقت ایمان کی غلط تعبیر ہے۔

سب سے پہلے ہم ایمان باللہ کی حقیقت پر روشنی ڈالیں گے۔

ایمان باللہ

خدا پر ایمان لانے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ خود خدا کی ہستی کیا ہے؟ یہ سوال میں نے اس لیے قائم کیا ہے کہ ایک ناخواندہ شخص تو بلاشبہ خدا کے متعلق کچھ جانے بغیر اس پر ایمان رکھتا ہے، لیکن دور جدید کا تعلیم یافتہ انسان خدا پر ایمان لانے سے پہلے یہ ضرور جاننا چاہتا ہے کہ وہ ہستی کیا ہے جس پر ایمان لانا اس کے لیے ناگزیر ہے؟

تصورات

اللہ جس ہستی کا نام ہے وہ فی الواقع انسانی عقل و حواس کے لیے بالکل ناقابل ادراک ہے اب تک کی تمام عقلی و فکری کاوشیں اسی بات کا ثبوت ہیں کہ اس ہستی کا ادراک انسانی عقل و حواس کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ سینٹ وکٹر کی خانقاہ کا ایک راہب جس کا نام بلینکن برگ سے (۱۱۴۰ - ۱۰۹۴) ایک عالم بالبعد الطبیعات (Metaphysician) اور عبرانی صوفی گزرا ہے، وہ خدا کے متعلق کہتا ہے:

”خدا اس درجہ فوق العقل ہے کہ ہم تمثیل سے بھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیا چیز خدا کے مثل ہو سکتی ہے؟ زمین، آسمان، روح، نفس، ان میں سے کوئی چیز خدا نہیں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں یہ چیزیں خدا نہیں لیکن اس سے کچھ نہ کچھ مشابہت ضرور رکھتی ہیں اس لیے ان سے خدا کے تصور میں مدد

لی جاسکتی ہے۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ روح کا تصور قائم کرنے کے لیے تم جسم کو میرے سامنے پیش کر دو جو تصور روح کے لیے ایک ناموزور مثال ہوگی، اور پھر خدا اور نفس کا بُعد تو نفس و جسم کے تفاوت سے بھی زیادہ ہے۔ انتہائی مخالف الفطرت مخلوقات میں بھی اتنا فرق نہیں جتنا خالق اور مخلوق میں ہے۔ لہذا عقل سے خدا کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس کا تعلق صرف ایمان سے ہے۔

اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات بھی ملاحظہ ہوں، وہ لکھتے ہیں:-
 ”اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تجربے اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی ذات مطلق کی ہستی میں غور و غوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی برہمتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وہ معلوم کرنے کا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے۔“

اے بڑوں از وہم و قال و قیل من خاک برفرق من و تمثیل من
 جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی ہے وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رنگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہی مرتبہ ہمیشہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک ہو جانے عرفا کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ رب زدنی تھیر آ (خدا یا ایسا کر کہ تیری ہستی میں ہمارا تجریر بڑھتا ہی رہے) اور حکما، کی حکمت و دانش کا فیصلہ بھی ہمیشہ یہی ہوا کہ:
 معلوم شد کہ تیج معلوم نہ شدتہ“

قرآن کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ ذات، انسانی عقل کے لیے ایک حقیقت مستور ہے جس کی

۱۔ تاریخ فلسفہ صفحہ ۱۹۹ (مصنف الفیڈو ویر) مترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۵ء)

۲۔ ترجمان القرآن، سورہ فاتحہ صفحہ ۱۸ (مطبوعہ ساجدہ اکاڈمی، نئی دہلی ۱۹۶۷ء)

نقاب کشائی کی ہر کوشش کا نتیجہ ناکامی و نامرادی کی صورت میں منتج ہوگا۔ سورہ بقرہ کی بالکل ابتدائی آیات میں ایک مومن کے انداز فکر کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔

اپنے لیے غیب کا لفظ استعمال کر کے اللہ نے اپنے بندوں کو یہ بتا دیا کہ وہ انسانی عقل و فہم کے لیے ناقابل ادراک ہے، اور اس طرح اس نے انسانوں کو ان تمام عقلی ترکتازیوں سے روک دیا جو اس کی ذات کے ادراک کے لیے بردور میں کی گئی ہیں اور صاف سیدھے لفظوں میں بتا دیا کہ تم اس پر یعنی غیب پر ایمان لاؤ۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے لیے ایسا غیب ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس پر ایمان لانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ کسی شے کی غیبت کے یہ معنی نہیں کہ وہ ناقابل فہم بھی ہے۔ اگر خدا کی ہستی پوشیدہ ہے تو ہمارے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی یہ وسیع کائنات اور خود ہماری ذات تو ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر انسان ان پر سنجیدگی سے غور کرے اور اس کے باطن میں اتر کر دیکھے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کائنات ہستی کا ہر گوشہ ایک صالح کامل کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر کوئی صنعت بنیر کسی صانع کے اور کوئی تنظیم بنیر کسی ناظم کے قائم نہیں ہو سکتی تو پھر یہ بیکراں کائنات اور عقل و شعور کا حامل انسان بنیر کسی عاقل و جاننا ہستی کے کیسے وجود میں آسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مشہور سائنس دان ڈاکٹر میچل پوپن (Dr. Michael pupin) جو امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں الیکٹرو میکانکس کے پروفیسر رہے ہیں، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

”سائنس نے کائنات کے جس گوشے کی بھی تحقیق کی ہے اسے وہاں ایک

قانونِ نظم و عدل (Coordinating Principle) کا فرما دیا ہے۔ اس

سے یہ ایک ناگزیر نتیجہ نکلتا ہے کہ کائنات کی ہر شے کی پشت پر ایک رہنما اصول

موجود ہے جو اسے احتمال اور بے نظمی کے بجائے نظم و ترتیب عطا کر کے اس

کے وجود کو قائم رکھتا ہے۔ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو ہم اس

عالم وجودت کو جو بے نظمی و قانون رکھتا ہے، محض ایک اتفاقی واقعہ قرار دیں

یا اسے کسی خاص ذہن کا نتیجہ سمجھیں۔ تم بحیثیت ایک عاقل اور باشعور ہستی کے ان دو باتوں میں سے کس بات کو پسند کرو گے؟

جہاں تک میرا تعلق ہے میں قانونِ عدل و توازن یعنی الہیاتی ذہن و شعور (Divine Intelligence) پر یقین رکھنا پسند کرتا ہوں۔ کیوں؟ صرف

اس لیے کہ یہ سب سے آسان تر معقول اور قابلِ فہم ہے، اور یہ میرے تمام تجربات سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ نظریہ کہ باشعور مخلوق، جیسے ہم میں، اور باشعور طرزِ عمل جیسے ستاروں کی رفتارِ حرکت کا ہے، محض بے شعور اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہو، میری فہم سے بالاتر ہے۔ اور پھر میں کیوں اس نظریے کو قبول کروں جبکہ میں ہر روز براہِ راست ذہن و شعور کے حامل متعدد واقعات و آثار کا مشاہدہ کرتا رہتا ہوں۔

جب تم تاروں کو دیکھتے ہو کہ ہر تارا اپنے ہی دائرہ حرکت میں گردش کر رہا ہے، اور ایک بیج کو دیکھتے ہو کہ وہ ایک متعین منصوبہ کے تحت ترقی کر کے درخت بن جاتا ہے، یا جب تم دیکھتے ہو کہ ایک طفل نوزائیدہ ایک خود کار نظامِ عمل کے تحت نشوونما پا کر رفتہ رفتہ ایک مکمل شخصی وجود میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو کیا تم ان تمام واقعات کو محض اتفاقی حادثات کا نتیجہ سمجھتے ہو؟ یقیناً میں ایسا نہیں سمجھتا۔ ہر قدم پر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام واقعات کے پیچھے ایک ناظم و آمر ذہن و شعور کام کر رہا ہے۔ سائنس کا اب تک کوئی ایسا انکشاف سامنے نہیں آیا ہے جو اس بات کی تردید کرے، بلکہ سائنس جس قدر گہرائی کے ساتھ کائنات کے قوانین کا مطالعہ کرتی جاتی ہے اسی قدر یہ یقین پختہ تر ہوتا جاتا ہے کہ یہ کائنات ایک الہیاتی ذہن و شعور کی حامل ہے۔

خدا کی ذات کے سلسلے میں متعدد دیگر سائنس دانوں نے بھی اسی طرح کے خیالات کا

انہما کر کیا ہے چنانچہ دی گریٹ ڈزائن نام کی کتاب میں جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی، یورپ اور امریکہ کے چودہ بڑے بڑے سائنس دانوں نے اپنی یہ متفقہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ دنیا ایک کسے روح مشین نہیں ہے اور نہ یہ محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(There is a mind behind the veil of matter, give it what name you will.)

مادہ کے پس پردہ ایک دماغ کا فرما ہے تم اسے جو نام بھی چاہو دے لو۔
دنیا کے عظیم سائنس دان البرٹ آئنسٹائن کا یہ فقرہ تو اب شہرت عام کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

(I believe in God who reveals himself in the orderly Harmony of the Universe.)

میں خدا پر اکتفا دیکھتا ہوں جو اس کائنات کی باضابطہ ترتیب اور ہم آہنگی میں خود کو ظاہر کر رہا ہے۔
انگلینڈ کے مشہور ماہر علم نجوم، سر آر تھور ایس ایڈنگٹن نے لکھا ہے:-

(The old atheism is gone) religion belongs to the Realm of spirit and mind, and can not be shaken)

قدیم انکار خدا کا نظریہ اب داستانِ اضمیٰ بن چکا ہے۔ مذہب کا تعلق روح اور عقل کی دنیائے ہے اور اس تعلق کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ہم نے سطور بالا میں دنیا کے جن نامور سائنس دانوں کے خیالات کا ذکر کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سائنسی دور میں بھی ارباب علم و خرد کی ایک بڑی تعداد خدا کے وجود پر اعتقاد رکھتی ہے۔ اور یہ میرا یقین کامل ہے کہ جیسے جیسے سائنسی علوم ترقی کی منزلیں طے کرتے جائیں گے، خدا کی ہستی پر انسانوں کا اعتقاد کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتا جائے گا۔ اس کا ثبوت عصر جدید کے بعض نامور سائنسدانوں کے خیالات میں ہم یہاں صرف دو سائنسدانوں

کے خیالات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ایک سائنسدان کا نام پروفیسر فرڈ ہائل (Prof. Sir Fred Hoy le) ہے ان کی عمر اس وقت ۶۶ سال ہے۔ اپنے جدید نظریات (New Theories) کی وجہ سے یہ سائنس دنیا میں ایک ہنگامہ خیز شخصیت سمجھے جاتے ہیں، اور اسی لیے انہیں اس دور کا متنازعہ فیکانٹاتی پیشین گو (Controversial Cosmic Prophet) کہا جاتا ہے۔ دوسرے سائنسدان کا نام پروفیسر چندر وکر ماسنگھی ہے۔ ان کا وطن مالوف سری لنکا ہے اور پیدائشی طور سے بدھسٹ ہیں۔ یہ یونیورسٹی کالج کرڈیف (Cardiff) میں ریاضیات اور علم نجوم کے استاد ہیں، اور ۱۹۶۳ء سے یہ سر فرڈ ہائل کے رفیق کار کی حیثیت سے متعدد کتابوں کی تصنیف میں ان کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ یہ دونوں سائنس دان ابتداء ہی سے منکر خدا اور مذہب بیزار تھے۔ اور ایک سائنس دان کی حیثیت سے ان کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ کسی حلالق (Creator) کا تصور سائنس کے بالکل خلاف ہے، لیکن اب ان کا یہ خیال یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔

پروفیسر سر فرڈ ہائل اور پروفیسر وکر ماسنگھی نے جب اپنی کتاب ”خلا سے ارتقاء“ کے سلسلے میں آغاز زندگی پر یعنی کیا زمین پر زندگی (Evolution from space) کا آغاز ریاضیاتی اتفاق کے طور پر ممکن ہے؟ تحقیقی کام شروع کیا تو اختتام تحقیق پر دونوں ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین پر زندگی کا آغاز اچانک اور اتفاقی واقعے کے طور پر ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم ایک (سندر) کے آگے ۱۰ ہزار نقطے اور بڑھا دو تو یہ ایک ایسا عدد بن جائے گا جو ناقابل ہے۔ یعنی زمین پر زندگی کا آغاز خود بخود اتفاقی طور پر ہونا قابل تصور ہے۔ پروفیسر وکر ماسنگھی لکھتے ہیں:

”زمین پر زندگی کو ایک کیمیادی حادثہ (Chemical Accident)

خیال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مخصوص ریت کے ذرے کو تمام اجرام سماویہ کے کناروں پر تلاش کرنا اور پالینا ہے۔“

وہ مزید لکھتے ہیں:

”محض اتفاقی طور پر بالکل اچانک زندگی کے آغاز کا احتمال ایک فنول سی

بات ہے۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ طبیعیات کے مطلوبہ خواص (Favourite properties) جن پر زندگی کا انحصار

ہے، اعتبار سے ارادی (Deliberate) ہیں۔

یہ خیالات کسی مذہبی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے کسی عالم دین کے نہیں ہیں کہ ہم انھیں مذہبی فحش اعتقادی اور کورانہ تقلید کا نتیجہ قرار دے کر رد کر دیں، بلکہ یہ خیالات ایک معروف سائنسدان کے ہیں، ایک ایسا سائنس دان جو ابھی تک خود کو اپنے نتائج تحقیقات سے ہم آہنگ نہیں کر سکا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

”ایک برتر ذی شعور (Higher Intel ligence) خالق کا اعتراف

مجھ سے کہیں زیادہ سرفرڈ ہائل کو ہے۔ میں نے اس تصور کے خلاف ان سے طویل بحث و مباحثہ کیا لیکن میری ہر دلیل رائگاں گئی۔ فی الحال میں کوئی ایسی عقلی دلیل نہیں پاتا جو اعتراف خدا کے تصور کی نفی کر سکے۔ اگر میں کوئی دلیل پاتا تو خواہ کر دیتی سہی، تو اس کتاب کے لکھنے میں سرفرڈ ہائل کا شریک صلاحیت بنتا۔ میں اب بھی پُر امید ہوں کہ شاید کسی دن اس نظریے کے ماسوا، زندگی کی کوئی میکانکی تشریح کر سکوں، کیوں کہ میں ابھی تک ذہنی اعتبار سے اس انقلاب سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا ہوں۔

فی الواقع میرے لیے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا کیوں کہ میں ایک بدستور ہوں اور بدھ مذہب ایک بے خدا مذہب ہے جس میں تخلیق اور خالق کا کوئی

تصور موجود نہیں ہے، لیکن اعتراف خالق تک مجھے منطق (Logic)

نے پہنچایا ہے۔ کوئی دوسرا ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم کیمیائی اشیاء

(Chemicals) کے متعین نظم و ترتیب (Precise ordering)

کو سمجھ سکیں بجز اس کے کہ ہم کائناتی سطح (Cosmic scale) پر تخلیق کے عمل کو قبول کر لیں۔

لہ ہندوستان ٹائمس، سنڈے میگزین، ۶ ستمبر ۱۹۵۸ء، صفحہ ۵

حقیقت یہ ہے کہ تخلیق عالم پر غور و فکر ہمارے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ یہ کائنات کوئی حادثہ اور اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ بلند ترین حکیم و علیم ہستی کی بے نظیر تخلیق ہے۔

تعبیرات کا اختلاف

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فلسفی اور سائنس دان وجود خدا کے منکر ہوتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر دور میں ایسے فلسفی اور سائنس دان موجود رہے ہیں جو خدا کی ذات پر انتقاد کرتے تھے، اور آج بھی ایسے فلسفیوں اور سائنس دانوں کی تعداد کم نہیں ہے جیسا کہ ہم گزشتہ سطر و پارہ میں بیان کر چکے ہیں۔

دراسل فلسفی اور سائنس دان خدا کے وجود اور اس کی ذات و صفات کے اظہار کے لیے جو الفاظ، اصطلاحات اور اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں، وہ مذہبی الفاظ و اصطلاحات اور تعبیرات سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے اور اسی اختلاف سے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ خدا کے منکر ہیں۔ اگر تعبیرات کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا جائے تو دونوں جگہ ایک ہی حسن حقیقت کی جلوہ گری ملے گی۔

اہل مذہب جس فوق العقل ہستی کو خدا کہتے ہیں اسی کو ہر برٹ اسپنسر "نامعلوم" (Unknown) اور ناقابل ادراک (Unknowable) اسپینوزا "کائناتی جوہر" (Universal Substance) ایمرسن "روح کائنات یا روح کل" (Oversoul) اور کانت "فوق تجربی" (Transcendental) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کیا حقیقت "مطلق" کی ان مختلف تعبیرات سے خود حقیقت بھی مختلف ہو گئی یا اس کا وجود مشتبہ ہو گیا، کیا ایک "گور" کی حقیقت، انگریزی میں گرپ، عربی میں عنب، فارسی میں انگور، ترکی میں ازم، رومی میں استفییل اور سنکرت میں درکشا نام پڑ جانے کی وجہ سے مختلف ہو سکتی ہے، یا اس کا وجود ان ناموں کے اختلاف کی وجہ سے ناقابل تسلیم ہو سکتا ہے؟

سہ مزید تفصیل کے لیے مصنف کی کتاب "تجلیات حق" ملاحظہ فرمائیں۔

تعبیرات (Interpretations) کا اختلاف کچھ فلسفیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، خود ارباب مذہب کے یہاں بھی تعبیرات کا یہ اختلاف موجود ہے۔ دنیا کا ہر مذہب کسی نہ کسی انسانی زبان سے رشتہ رکھتا ہے۔ زبانوں کے اختلاف سے ہر زبان میں اس ہستی مطلق کے نام بھی مختلف ہو گئے۔ لہذا ہر ایک کوئی اہم بات نہ تھی لیکن ناموں کے اسی اختلاف کی وجہ سے حقیقت کی تعبیر بھی ہر مذہب میں مختلف ہو گئی۔ اور یہی اختلاف تعبیرات، مختلف ادیان و مل کے درمیان ان کے پیروؤں کی جہالت و بے بصیرتی کے سبب شدید مذہبی نزاعات و کشاکش اور کشت و خون کا باعث بن گیا اور آج بھی اہل مذہب باہم مصروف پیکار ہیں۔

فلسفہ و سائنس کی زبان ہو یا ادیان و مذاہب کی، ہر زبان میں ہستی مطلق کے جو اسماء و صفات (Names and Attributes) تجویز کیے گئے ہیں وہ دراصل تفہیم و تعبیر کی ایک

صورت ہے ورنہ وہ ہستی ان اسماء و صفات میں مقید نہیں ہے۔ اسی طرح اسماء و صفات کے ساتھ جو غلط تصورات ہر دور میں وابستہ ہو گئے ہیں، وہ ہستی ان سے بھی مترا ہے۔ فی الواقع اس ہستی مطلق کے لیے تمام ہی اچھے نام موزوں ہیں خواہ وہ کسی زبان اور کسی مذہب کے ہوں۔ ہم افہام و تفہیم کی غرض سے اس ہستی کے شایان شان اس کا جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآنی تعلیم حد درجہ حقیقت پسندانہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

وَيَلِدُ الْأُنثَىٰ الْمُسْنَىٰ فَادْعُوهُنَّ بِمَا وَدَّوْنَ الَّذِيْنَ يُلْحِدُونَ فِيْ أَسْمَائِهِنَّ (اعراف)

اور اللہ ہی کے لیے صن و خوبی کے نام ہیں، تم انہی ناموں سے اس کو پکارو، اور ان لوگوں کو ان

کے حال پر چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے سلسلے میں کج فکری میں مبتلا ہیں۔

تعبیرات کے اختلاف کے باوجود ہر دور کے اصحاب علم و خردیہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہ کائنات کوئی بے روح و بے عقل مادوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ حیرت انگیز عقل و شعور کی حامل ہے۔ پروفیسر ہیگل جو ایک مشہور جرمن فلسفی گزرا ہے، اپنی کتاب ”مبدأ کائنات“ میں وحدت جوہر (Monism) کے نظریہ کی وضاحت

کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”وحدت جوہر کا نظریہ تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی جوہر (substance)

موجود ہے جو بیک وقت خدا اور فطرت، اور جسم اور روح (مادہ اور توانائی) دونوں ہے۔ یہ نظریہ ان دونوں کو ناقابل تفریق سمجھتا ہے۔ خالص وحدت

جوہر کا نظریہ نہ تو اس نظری مادیت (Theoretical Materialism)

کے مماثل ہے جو روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کائنات کو بے روح جوہر کا ایک انبار قرار دیتا ہے۔ اور نہ ہی یہ نظری روحانیت (Theoretical

spiritualism) کے مماثل ہے جو حرکتِ مادہ کے تصور کو رد کرتی ہے۔ اور کائنات کو توانائیوں کا یا غیر مادی فطری قوتوں کا ایک مجموعہ خیال کرتی ہے۔ اس کے برخلاف ہم نظریہ وحدت جوہر کے قائلین گوٹے کے اس نظریے کے قائل ہیں کہ مادہ روح کے بغیر اور روح مادہ کے بغیر نہ تو صورت پذیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی موثر بن سکتی ہے۔ ہم اسپینوزا کے غیر مبہم وحدت جوہر کے نظریے پر مضبوطی سے قائم ہیں یعنی یہ کہ مادہ یا میکران پھیلا ہوا جوہر، اور روح یا توانائی یا حساس اور غور و فکر کا حامل جوہر دراصل دو اساسی صفات

پیر، یا کائناتی جوہر (Universal substance) کے اہم ترین اوصاف

ہیں۔ اسپینوزا نے اس کائناتی جوہر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: وہ جو اپنے وجود کے قیام کے لیے کسی شے کا محتاج نہ ہو، قائم بذات لامتناہی، غیر مشروط اور غیر محدود و لامتناہی کا تعدد ناممکن ہے۔ یہ

آپ اس اقتباس پر غور کریں۔ آخر میں اسپینوزہ نے کائناتی جوہر کی جو تعریف بیان کی ہے۔ کیا وہ اسی جی و قیوم سستی کی عین صفات نہیں جسے ہم عربی زبان میں اللہ کہتے ہیں۔ یہ صرف تعبیر کا اختلاف نہیں تو اور کیا ہے؟

تعبیر کا اختلاف نہیں تو اور کیا ہے؟

تصور صفات

انسان کے فہم و ادراک کی حقیقت کا اگر آپ گہرائی سے جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ وہ اس

عالم مادی کی ہر چیز کا علم اس کی صفات کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ماہیت اشیاء کے علم سے عاجز ہے۔ اگر آپ کسی شخص سے سیب کی حقیقت دریافت کریں تو وہ فوراً اس کی صفات بیان کرنے لگے گا یعنی سیب کی شکل ایسی ہوتی ہے، رنگ ایسا ہوتا ہے، بو ایسی ہوتی ہے اور مزہ اس طرح کا ہوتا ہے وغیرہ۔ اس نے سیب کی جن مختلف کیفیات کا ذکر کیا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی بذات خود سیب نہیں ہے، بلکہ اس کی کسی نہ کسی صفت کی منظر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم صفت یا صفات کے مجموعہ ہی سے اشیاء کا علم حاصل کرتے ہیں۔ جب عالم محسوسات کی اشیاء کے متعلق ہمارے فہم و ادراک کی رسائی کا یہ حال ہے تو عالم غیر محسوس کی حقیقت کا ادراک تو ہمارے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ہم عالم غیر محسوس کے سلسلے میں جب بھی تصور کو پر پر راز عطا کریں گے تو بالآخر مجبور ہوں گے کہ اس عالم کے خال و خط کا مشاہدہ عالم محسوس کے آئینہ ہی میں کریں۔

بالکل یہی حال صفات خداوندی کا ہے۔ چونکہ خدا ایک لامحدود اور غیر محسوس ہستی کا نام ہے اور ہمارے تمام علم و احساس کا ذریعہ ہماری محدود عقل و حواس ہیں، اس لیے ہم مجبور ہیں کہ اس کی ذات کا مشاہدہ اس کی صفات کے آئینہ میں کریں۔ اگر ہم اس کے وجود کو صفات کا پیکر عطا کریں یا دوسرے لفظوں میں اسے محسوس، مشخص اور معین نہ کریں تو وہ ہمارے دائرہ فہم و ادراک میں نہیں آسکتا۔ اب ایک طرف خدا کی ذات لامحدود ہے جو فہم انسانی کے لیے ناقابلِ ادراک ہے، اور دوسری طرف انسان کی فطرت میں ایک خالق و مالک کا تصور اور اس کی طلب و جستجو اور اس کا شوق دیدار اتنا سخت و شدید ہے کہ وہ کسی صورت سے اس خالق و مالک کے تصور سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔

اب اس کی دوسری صورتیں تھیں، یا تو اسے ذات مطلق کی تلاش میں سرگرداں چھوڑ دیا جاتا جس کا لازمی نتیجہ گم رہی کی صورت میں نکلتا یعنی انسان معبود حقیقی کو نہ پا کر غیر معبود، ستیوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا جیسا کہ تاریخ کے ہر دور میں معبود حقیقی کے صحیح تصور کے نہ ملنے کی وجہ سے ہو چکا ہے، اور اس کی دوسری صورت یہ تھی کہ اس کی فطری طلب کی تسکین کا کوئی سامان کیا جاتا یعنی اسے معبود حقیقی کے صحیح تصور سے آشنا کر کے اسے غلط روی کے نتائج سے بچایا جاتا۔ خدا کی

ذات جو رحمت و بربوبیت میں کامل ہے، انسان کی اس فطری ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے انسان کی فطری طلب کی تسکین کے لیے اپنے لامتناہی وجود کو صفات کا پیر من عطا کر کے خود کو انسانی عقل و فہم کے لیے قابل ادراک بنا دیا۔

لغوی صفات

صفات خدا کے سلسلے میں ہر دور میں معرکہ الآرا زبٹیں بھونکی ہیں اور اس سلسلے میں انسانی فکر نے ہمیشہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ارباب علم و خرد کے ایک گروہ نے خدا کو ہر صفت سے منزہ قرار دیا۔ اس نے کہا کہ اگر ہم خدا کو کسی صفت سے متصف کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے محدود کر دیا حالانکہ وہ غیر محدود ہے، مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ وہ رحیم ہے تو گویا ہم نے اسے صفت رحیم میں محدود کر دیا جبکہ وہ رحمت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس کے علاوہ جب ہم کہتے ہیں کہ وہ رحیم والا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مخلوق ہستیوں کی طرح رحیم سے بہرہ مند ہوا ہے۔ اس گروہ کا تئز یہی تصور خدا اس حد تک نازک ہے کہ وہ خدا کے لیے وجود کا لفظ بولنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ جہاں وجود کا لفظ بولا گیا وہ محدود ہو گیا، کیونکہ کسی وجود کا تصور ہم زماں اور مکان کے تصور سے ہٹ کر نہیں کر سکتے اور وہ ذات زماں اور مکان سے پرے ہے۔

ہندو ارباب علم نے اس معاملے میں زیادہ نزاکت خیال کا مظاہرہ کیا ہے۔ ذاتِ خدا کے سلسلے میں ان کا قدیم فلسفیانہ تصویر یہی ہے کہ وہ ہر صفت سے پاک ہے۔ اس کی طرف کسی صفت کی نسبت کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اپنشد کے الفاظ میں ”اس کے متعلق جو کچھ کہا جاتا گا میں اس کا ایک ہی جواب دوں گا: نیٹی نیٹی یعنی یہ ایسا بھی نہیں، یہ ایسا بھی نہیں“ ظاہر ہے کہ اس طرز فکر کے مطابق ہم نہ صرف ذاتِ مطلق کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے بلکہ اس کا وجود عدم کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ جب وہ کچھ بھی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عدم ہے۔

اثبات صفات

اس سلسلے میں دوسرا گروہ ان اہل علم کا ہے جو صفاتِ خدا کا قائل ہے۔ یہ گروہ اثبات

صفات کے جوش سے اس حد تک مغلوب ہوا کہ افراط کی کھائی میں جاگرا۔ اس نے خدا کو صفات کا جامہ اس طرح پہنایا کہ اسے ہر تشبہ اور تجسم سے آلودہ کر دیا۔ اس کو بالکل انسانی جذبات و احساسات رکھنے والی ہستی قرار دیا یہاں تک کہ اس کو انسانی شکل و صورت کے قالب میں بھی ڈھال دیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کا تصور خدا کسی نہ کسی پہلو سے تشبہ اور تجسم سے آلودہ ہے۔ ان کے مذہبی صحائف کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس ہستی کو خدا سمجھتے ہیں وہ اپنے اعمال و افکار کے لحاظ سے انسان سے کچھ زیادہ مختلف واقع نہیں ہوئی ہے۔ انسان ہی کی طرح وہ تخت حکومت پر بیٹھتا ہے اور سران مقررین و خدام کی ایک جہانت اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتی ہے۔ انسان ہی کی طرح وہ مغلوب الغضب ہے۔ ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا ہے اور پھر نذر و نیاز اور چند مذہبی رسوم کی ادائیگی سے وہ خوش بھی ہو جاتا ہے۔ جب غضبناک ہوتا ہے تو انتقام کے جوش میں پوری کی پوری آبادی کو تہ و بالا کر ڈالتا ہے، اور جب خوش ہوتا ہے تو انعام و اکرام سے نوازتا ہے حتیٰ کہ اپنے بیٹے کو انسانوں کے گناہوں کا گناہ ادا کرنے کے لیے مصلوب کر دیتا ہے۔ غرضیکہ ہر وہ کام کرتا ہے جو ایک انسان جو جوش غضب اور عالم مرتہ میں کرتا ہے۔

قرآن حکیم کا تصور صفات

صفات خداوندی کے سلسلے میں قرآن مجید نے جو راہ اختیار کی ہے وہ حد درجہ اعتدال و توازن کی راہ ہے۔ اس نے ایک طرف تو خدا کی ذات کو ہر صفت اور مثل سے بالاتر قرار دیا، لیس کمشلہ شیئ (اس کے مانند کوئی چیز نہیں) یہ دراصل نبی نبی کی صدائے بازگشت ہے اور دوسری طرف روح انسانی کی تسکین کے لیے اس کو صفات کے ذریعہ مشخص کیا۔ اس مقصد کے لیے قرآن نے وہ تمام الفاظ اور تعبیرات اختیار کیں جو انسانی فہم کے لیے قابل گرفت ہو سکتی تھیں لیکن ان کی حیثیت صرف تفہیم و تعبیر کی ہے نہ کہ حقیقی۔

فی الواقع تشریحہ صفات کی راہ تو آسان ہے لیکن اثبات کی راہ بڑی مشکل اور پُرخطر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے ہر دور میں انسان کی تمام فکری و علمی گم راہیوں کے پس پردہ صفات

خداوندی کا غلط تصور ہی کارفرما رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اثباتِ صفات کے ساتھ ہی صفاتِ خداوندی کا صحیح اور متوازن تصور بھی پیش کیا، اور اس راہ کی تمام کج اندیشیوں کے سدباب کے لیے ہر وہ تدبیر اختیار کی جو ایک انسانی زبان اور طریقِ تفہیم میں ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر اس نے خدا کی صفتِ رحمت کا ذکر کیا تو یہ بھی بتا دیا کہ وہ شدید العقاب بھی ہے۔ تاکہ کوئی شخص رحمت کا غلط تصور نہ قائم کرے۔ اسی طرح اگر اس کی صفتِ ربوبیت کا ذکر کیا تو یہ بھی واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس کائنات میں اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جو رب کہلانے کی مستحق ہو۔ اگر خود کو صفتِ ملک سے متصف کیا تو یہ بھی کہہ دیا کہ اس کائنات کا وہ تہا حاکم و آمر ہے، اور اس کا جہان بینی میں کوئی بھی اس کا شریک و ہمہم نہیں ہے۔ غرضیکہ ہر صفت کی حقیقت سے ہم کو باخبر کر کے فکر و عمل کی ہر لغزش کا دروازہ بند کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج اسی کتاب پر ایمان رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد صفاتِ خدا کے سلسلے میں بے شمار فکری اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہے۔

بریں عقل و دانش بیابید گریست

قرآن پاک میں جس کثرت سے توحید فی الذات کا ذکر ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ توحید فی الصفات کا ذکر ملتا ہے۔ عقل و بصیرت کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ جو ہستی اپنی ذات میں یگانہ ہوگی

سَلِّمُوا أَنْ اللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۹۸﴾ (۹۸:۹۸)

سَلِّمُوا النَّاسِ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۝ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا ۚ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۰﴾ (البقرہ ۲۰) اے لوگو! اپنے پروردگار کی اطاعت و بندگی کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو پیدا کیا۔ جب نہیں کہ تم (عذابِ جہنم سے) بچو جو — اور جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا، اور آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے مختلف قسم کے پھل اگانے تمہارے لیے بطور غذا، اس لیے تم یہ وہ دو الٰہ (دوسروں کو) اللہ کا مقابل نہ بناؤ۔

سَلِّمُوا لِلْحَمْدِ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يُتَّخَذْ لَهَا وَلَمْ يُكُنْ لَهَا شَرِيكًا فِي الْعِلْمِ وَالَّذِي لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلِيًّا مِنَ الدَّرَجَاتِ وَالَّذِي تَكْبِيرَاتُ (یعنی اسرائیل ۱۱۱) اور کہہ دو کہ ہر حمد و ستائش اس لئے ہے جو خدا اور اللہ کے ساتھ ہے اور اس کی عظمت پر کوئی شریک ہے۔ اور یہ کسی کلمہ کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی ذمہ داری بیان کر رہے۔

وہ لازماً اپنی صفات میں بھی یگانہ ہوگی کیوں کہ صفات ذات سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتیں بلکہ ذات ہی کا پرتو ہوتی ہیں۔

ایمان باللہ کے تقاضے

ایمان باللہ صرف یہی نہیں ہے کہ ہم اس کے وجود کو تسلیم کریں بلکہ اس ہستی پر ایمان لانے کے بعد ہم پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہم اسی کو تنہا اس کا ناسخ کا خالق مالک و زینم و حکم ال سمیعین اور جب وہی آقا اور فرماں روا ہے تو پھر وہی ہماری اطاعت و پرستش کا بھی مستحق ہے اس کے سوا اس کائنات میں کوئی زندہ و متحرک وجود ایسا نہیں ہے جو ہمارے لیے کسی طرح بھی قابل پرستش اور لائق حمد و ثناء ہو کیونکہ اس عالم رنگ و بلوکی ہر شے مخلوق اور فانی ہے اور اپنے وجود کے بقا اور اپنی تمام حاجات کی تکمیل کے لیے اسی ایک ہستی کی دست نگر ہے جب کہ ہستی مطلق غنی اور تمام خواہشات اور حاجات سے مکمل منتزہ ہے، نیز وہی ہی و قیوم بھی ہے اور اپنے وجود کے قیام و بقا کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے۔

اس اعتراف حقیقت کے بعد ہم کو چاہیے کہ ہم اپنا سراہی کے آگے جھکائیں اور اس کے آستانے کو چھوڑ کر کسی غیر کے آستانے کو اپنے جدوں سے زینت نہ بنائیں۔ صرف اسی کو اپنا حاجت مند مشکل کشا اور فریاد رس سمجھیں، اور اپنی تمام جسمانی اور روحانی احتیاجات میں اسی کی طرف رجوع کریں۔ مشکلات و مصائب میں دست گیری کے لیے اسی کو آواز دیں، اور زندگی کے ہر موڑ پر اسی ایک ذات پر کمال اعتماد و توکل کریں، کیونکہ تنہا وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ہماری تمام حاجتیں پوری کر سکتی اور ہر غم و ابتلا سے ہم کو نجات دے سکتی ہے۔ ہمارا یہ بچتہ عقیدہ ہو کہ نفع و نقصان، راحت و رنج، عزت و ذلت، مال و منال، ملک و حکومت اور طاقت و عظمت کا سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ کسی کے ساتھ خیر کا ارادہ کر لے تو پھر ساری دنیا مل کر بھی اس کو اس ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی، اور اگر کسی کے کر تو توں کے سبب اس کو رنج و اذیت میں مبتلا کر دے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کو اس اذیت سے گلو خلاصی بخش سکے۔ وہ خود فرماتا ہے:

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِنَّ الظَّالِمِينَ ۝ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْ لَكَ بِضُرٍّ

فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (یونس ۱۰)

اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو نہ پکارو جو تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان دہ اگر تو نے ایسا کیا تو تمہارا شمار ظالموں (مشرکوں) میں ہو گا۔ اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف میں مبتلا کر دے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس تکلیف سے تم کو نجات دے سکے۔ اور اگر تمہیں کسی بھلائی سے نیازنے کا ارادہ کرنے تو پھر کوئی نہیں جو اس کو ایسا کرنے سے روک دے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے اپنے فضل و کرم سے نیازتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وہ تنہا ہر حال میں دعاؤں کا سننے والا اور اس کو قبول کرنے والا ہے۔ اس لیے بندوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے بلا واسطہ اسی کی طرف رجوع کریں، اور ہر مشکل وقت میں اسی کو پکاریں کہ وہی قسمتوں کا بنانے والا اور بگاڑنے والا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌۢ أٰجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا۟نَا فَلَيْسَ جَنُوبًاۙ وَلَيْسَ مُؤْتًاۙئِي ... (بقرہ: ۱۸۶)

جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو انھیں بتلا دو کہ میں (ان سے) کچھ دور نہیں، ان کے بالکل قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو اس کی پکار کو میں سنتا ہوں۔ پس ان کو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:

أَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُنْتَظِرَ إِذَا دَعَا۟هُ وَيَكْشِفُ السُّوٓءَ (نمل: ۶۲)

اس کے سوا کون ہے جو کسی بے قراری کی پکار سنتا ہے جب کہ وہ اسے پکارتا ہے، اور اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔

ہم اس بات پر دل سے یقین رکھیں کہ وہ ذات مطلق ہمارے ظاہر و باطن اور کائنات کے ہر پرت و بند اور عیاں و نہاں سے بخوبی آگاہ ہے یعنی وہ عالم غیب و شہادت ہے۔ یہ ہمہ گیر علم غیب اس کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے خواہ وہ فرشتے ہوں، خواہ انبیاء ہوں اور خواہ کوئی صالح بندہ خدا ہو۔ وہی سینوں کے مخفی رازوں اور دل و دماغ میں اٹھنے والے تمام وساوس کا جاننے والا ہے۔ خدا کے اس ہمہ گیر علم غیب کا تقاضا ہے کہ ہم کھلے اور پھپھے ہر حال

میں اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں اور اس کے سوا کسی سے بھی نہ ڈریں کہ یہ ایمان باللہ کے منافی ہے (واخشونی ولا تخشوا الناس)

اسی کے ساتھ ہم یہ بھی یقین رکھیں کہ اس کا رخاؤ عالم کا سارا نظام اسی کے حکم سے چل رہا ہے، کسی بھی مخلوق کو اس پر ادنیٰ تصرف بھی حاصل نہیں ہے، تصرف تو کجا نظام عالم ان کی مشورت کا بھی محتاج نہیں ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے کاروبارِ سلطنت میں شریک و ہمیم ہو۔ وہ ہر شے و نسب سے پاک اور یاری و مددگاری سے بے نیاز ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

وَقُلِ الْعَصْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذَّلَالِ وَكَتَبْنَا لَهُ الْكِتَابَ (دنی الرحمن)

کہر دوساری تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو نوا اولاد رکھتا ہے، اور نہ اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے، اور نہ ہی کسی کمزوری کے سبب کوئی اس کا یار و مددگار ہے۔ اور اس کی

خوب بڑی بیان کرو۔

اللہ کی حاکمیت ناقابل تقسیم ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آسمانوں میں تو اس کی حاکمیت کا رُخا ہو اور زمین پر انسان کی حاکمیت چلے۔ ارض و سادونوں کا وہی تنہا حاکم ہے، اس لیے ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس کی اطاعت سے آزاد نہ ہو۔ اس کو حاکم و فرمان روا مان کر عطا اس کے حکموں سے انحراف یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم نے حقیقی معنوں میں اسے اپنا حاکم و آقا تسلیم نہیں کیا ہے کیا یہ بات عجیب نہیں کہ ساری کائنات تو اس کے حکموں کا اتباع کرے لیکن انسان دین فطرت یعنی اسلام سے روگردانی کرے، اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی چلانے کے بجائے اپنے قانون اور اپنی مرضی کو نافذ کرے۔ انسان کا یہ طرز عمل صریح بغاوت ہے۔ ایمان باللہ کے ساتھ اس طرز عمل کا تصویب بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں حاکم و حکم لازم و ملزوم ہیں۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (اعراف: ۵۴) من لو خلق یحییٰ کی ہے اور حکم بھی اسی کے ہے۔

فرشتوں بجا ایمان

فرشتے دراصل خدا کی خیر مادی مخلوق یا غیر مادی ارواح مجرّدہ ہیں۔ خدا نے ان کو اس لیے محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

خلق کیا ہے کہ وہ اس کی تقدیس و تجید کریں اور اس کے متین احکام و قوانین کے مطابق نظام عالم کی نگہبانی کریں، اور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان پیغام رسانی کا ذریعہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی میں اطاعت و انقیاد کی تڑپ رکھ دی ہے، تمرد و سرکشی اور ذاتی ارادہ و اختیار کے اوصاف سے وہ بالکلیہ محروم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وہ کوئی ذاتی ارادہ و اختیار نہیں رکھتے تو پھر حکم خدا سے سرتابی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں فرشتوں کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ صابئی انھیں اجرام فلکی کی صورت میں مانتے ہیں۔ قدیم اہل فلسفہ انھیں عقول عشرہ قرار دیتے ہیں، پارسیوں کے یہاں ان کا نام "امشا سپنتہ" ہے اور یہودیوں کے یہاں "کروبیلم" اور خاص خاص فرشتوں کو جبرائیل اور میکائیل بھی کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے یہاں جبریل و روح القدس کی صورت میں ان کا وجود ملتا ہے۔ ذہن مبنی انھیں دیوی اور دیوتا قرار دیتا ہے۔ خود اہل عرب دور جاہلیت میں انھیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ (زخرف - ۱۹)

ناموں کے اس اختلاف کے باوجود ایک حقیقت سب کے یہاں مسلم تھی کہ یہ با اختیار اور قابل تعظیم ہستیاں ہیں۔ اختیار اور عظمت کے ساتھ ان کی پرستش ناگزیر ہے۔ چنانچہ تقریباً ہر مذہب میں کم و بیش ان کی پرستش کی گئی ہے۔ صابئی ان کے بیکل بناتے اور ان کو منظر خدا تسلیم کرتے تھے۔ عرب انھیں خدا کی بیٹیاں قرار دے کر ان کی عبادت کرتے تھے اور خدا کے دربار میں انھیں اپنا شفیع قرار دیتے تھے۔ یہی حال زانہ قدیم میں یونانیوں اور دیگر اقوام عالم کا تھا۔ اہل ہنود کے یہاں تو آج بھی ان کی پرستش دیویوں اور دیوتاؤں کی صورت میں جاری ہے۔ ان کو چھوڑنے کے ان کا شمار اہل کتاب میں نہیں ہے، تعجب تو یہ ہے کہ اہل کتاب کے یہاں بھی اس سلسلے میں کافی غلو سے کام لیا گیا ہے۔ یہودی صحیفوں میں فرشتوں کی تقدیس اور تعظیم جن الفاظ میں کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں صاحب اختیار سمجھتے تھے۔ جسد بشری میں جو فرشتے کبھی زمین پر آجاتے تھے ان کی تعظیم کی جاتی تھی، ان کے آگے جھک کر انھیں خداوند کے لفظ سے جو ان کے یہاں خدا کے لیے بھی مستعمل ہے، خطاب کیا جاتا تھا۔ عیسائیوں نے تو صاف صاف ایک فرشتے کو عقیدہ تثلیث کا ایک

لہ مکون: ۱۸، ۱۹، ۲۲، ۲۳۔

جزو قرار دے کر شریک الوہیت کر لیا۔

فرشتوں کے بارے میں یہ تھے مختلف مذاہب کے تخیلات اور ان کے پیروؤں کا طرز عمل اسلام نے ان تمام باطل عقائد اور تصورات کو یک قلم مٹوا کر فرشتوں کی اصل حیثیت کو دنیا کے سامنے رکھا۔ اس نے بتایا کہ فرشتے بھی انسان ہی کی طرح مخلوق ہستیاں ہیں۔ ربانی صفات اور خدائی اختیارات کا حامل ہونا تو درکنار وہ سرے سے کسی اختیار کی مالک ہی نہیں ہیں۔ ان کا کام صرف خدا کے احکام کو بجالانا اور اس کی بے چون و چرا اطاعت کرنا ہے۔ وہ نہ تو انسان کی تقدیر بنانے اور بگاڑنے کا کوئی اختیار رکھتی ہیں اور نہ ہی خدا کے حضور اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے مجاز ہیں، غرض یہ کہ وہ بالکل عاجز و بے اختیار ہستیاں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بے اختیار آدمی کی عبادت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ انھیں بے اختیار اور ناسزاوار پرستش قرار دیا، بلکہ خود انھیں کو انسان کے آگے سربسجدہ کر دیا۔ فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا فی الواقع انسان کی عظمت و برتری اور فہم و سر بلندی کا منظر ہے۔ اس تبلیغ کے ذریعہ اللہ نے انسان کو بتایا کہ وہ کس مقام و منصب پر فائز ہے۔ اب یہ انسان کی نادانی و کم نظری ہے کہ مسجد ملائک ہو کر وہ اپنے سے کم تر مخلوقات کی پرستش کرنے لگے یا اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا سجدہ گاہ شوق بنا لے یا خود فرشتوں ہی کو اپنا سجدہ بنا لے۔ اللہ کا یہ کتنا احسان عظیم ہے کہ اس نے انسان کو صرف اپنے آستانے پر جھکنے کا حکم دے کر ساری کائنات کو اس کے آگے سرفاگندہ کر دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کا مقام و مرتبہ نہایت بلند ہے۔

ایمان بالملائک کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم ان کو خدا کی مخلوق اور بے اختیار ہستیاں سمجھیں، اور صرف خدا کی ذات کو ہر حمد و ستائش کا مستحق اور اسی کو لائق پرستش قرار دیں۔ رہا فرشتوں کے وجود کا عقلی ثبوت تو اس سلسلے میں ہم بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا وجود ہمارے لیے خدای کی طرح ناقابل مشاہدہ ہے۔ ان پر ہمارے علم و یقین کا سارا مدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر ہے۔ آپ نے خدا کے فرشتہ کو نہ صرف انسانی شکل و صورت میں دیکھا بلکہ اسے اس کی خلقی صورت میں بھی دیکھا ہے۔ یہ خدا کا فرشتہ ہی تو تھا جو آپ کے پاس کلام ربانی لاتا تھا۔

اس فرشتہ کا نام جبرئیل ہے۔ یہ وہی فرشتہ ہے جو انسانی صورت میں پہلی بار غار حرا میں آپ کے پاس آیا تھا، اور اسی فرشتہ کی معیت میں سفر معراج پیش آیا تھا۔ مختصر یہ کہ ہمارے رسول کا ذاتی مشاہدہ اس بات کی صداقت کے لیے کافی ہے کہ فرشتے موجود ہیں، کیونکہ ہم رسول کو ان کی تاریخ حیات و کردار کی روشنی میں ایک صادق اور استباز انسان سمجھتے ہیں۔ جو شخص اپنی پوری زندگی میں ایک بار بھی کسی انسان سے جھوٹ نہیں بولا وہ خدا اور اس کے فرشتوں کے سلسلے میں دروغ گوئی اور افترا پر دازی کا مرتکب ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے فرشتوں کے وجود، ان کی حیثیت اور ان کے فرائض منصبی کے سلسلے میں ہم اپنے رسول کی تعلیمات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ہر شخص کا مشاہدہ یعنی ضروری نہیں ہے، بلکہ دوسروں کا مشاہدہ بھی یقین کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر اس کو اصولاً تسلیم نہ کیا جائے تو پھر خلقت کائنات کے متعلق سائنس کے بیشتر انکشافات ناقابل تسلیم قرار پائیں گے، کیونکہ وہ عام انسانوں کے لیے ناقابل مشاہدہ ہیں بلکہ بہتوں کے لیے ناقابل فہم بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ہر سائنسی تحقیق کو تسلیم کرتے ہیں کہ آج کے سائنس دان بغیر تجربہ و مشاہدہ کے کوئی بات نہیں کہتے، یہ دوسری بات ہے کہ کوئی مشاہدہ اور تجربہ بعد کے کسی مشاہدہ و تجربہ سے غلط قرار پائے۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بلا پس و پیش غلطی کو تسلیم کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے غلطیوں اور دیانتِ فکر و نظر کو ہر شک و شبہ سے بالاتر سمجھتے ہیں۔

لیکن دین کے معاملہ میں ہمارا یہ انداز فکر بدل جاتا ہے، اور کتنے ہی جدید تعلیم یافتہ حضرات بلا توقف یک لختہ مذہبی اعتقادات کو لایعنی کہہ کر رد کر دیتے ہیں گویا کائنات کی ہر حقیقت کا انھیں پورا علم حاصل ہو چکا ہے۔ یہی طرز عمل وہ فرشتوں کے وجود کے متعلق بھی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ وہ ناقابل مشاہدہ و تجربہ ہیں اس لیے ناقابل تسلیم ہیں، حالانکہ تاریخ کے ہر دور میں انسانی سماج کے صالح ترین انسانوں نے جنھیں مذہب میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے، ان کے وجود کی خبر دی ہے۔ اگر ہم انھیں صادق اور اپنی تعلیم میں مخلص سمجھتے ہیں تو پھر ان کا یہ کہنا کہ ہم نے فرشتوں کو دیکھا ہے، ہمارے لیے کیوں قابل تسلیم نہ ہو؟

ایک شخص جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ انبیاء کی دلی ہوئی خبروں پر بھی ایمان رکھے۔ یہی فرشتہ تو ہے جو وحی و ہدایت ربانی کا وسیلہ ہے۔ اس کے وجود کو تسلیم نہ کرنا گویا پورے سلسلہ ہدایات ربانی سے انکار کرنا ہے۔ اور ایسا کر کے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، کیوں کہ وہ ایمان کے ایک جزو کی تکذیب کرتا ہے اور جو ایمان کے ایک جزو کی بھی تکذیب کرے وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

تمام ہی انبیاء و رسل خواہ وہ کسی قوم میں مبعوث ہوئے ہوں ان کا زائے بعثت ماضی بعید ہے۔ خود خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس طویل ترین مدت میں نسل انسانی ذہنی انقلابات کے متعدد مرحلوں سے گزر چکی ہے، اور فکر و نظر کی دنیا میں سینکڑوں تبدیلیاں آپہنچی ہیں۔ آج اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ جو انبیاء و رسل ماضی بعید میں گزر چکے ہیں ان کی نبوت و رسالت کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟ یعنی یہ ہم کیسے مان لیں کہ وہ واقعی خدا کے فرستادہ رسول اور نبی تھے، اور یہ کہ ان پر وحی الہی نازل ہوتی تھی، اور انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ خدائی تعلیمات ہیں؟

یہ سوال کچھ اسی دور کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ تاریخ کے ہر دور میں ہر نبی کی بعثت کے وقت اس دور کے انسانوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو چکا ہے۔ سوال کی اہمیت کے پیش نظر سب سے پہلے ہم اسی کا جائزہ لیں گے، مکیوں کہ اگر رسول کی رسالت یا یہ نبوت کو پہنچ جائے تو بقیہ دوسرے عفتا نڈ کی صحت و صداقت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔

ثبوت رسالت

ثبوت ہمیشہ دعویٰ کے اعتبار سے طلب کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کہے کہ وہ شاعر ہے تو اس دعویٰ کے ثبوت میں یہی کہا جائے گا کہ اچھا اگر تم شاعر ہو تو شعر کہہ کر سناؤ۔ اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم بڑے کا اوزار بنا کر دکھا دو تو تمہارا دعوائے شاعری تسلیم کر لیا

جائے گا شاعری کا حتمی سے کیا تعلق؟ دعویٰ تو اس نے شاعری کا کیا تھا نہ کہ حتمی کا۔ اگر کسی کو اس کے دعوئے شاعری میں تردد ہو تو ثبوت میں شعر کہلا کر دیکھ لے۔ اسی طرح اگر کوئی کہتا ہے کہ وہ معمار ہے تو آپ اس سے ایک مکان تعمیر کرا کے دیکھ لیں کہ اس کا دعوئے معماری کہاں تک صحیح ہے؟ لیکن اگر آپ دعوئے معماری کے ثبوت میں اس سے معالجہ کا مطالبہ شروع کر دیں تو وہ غریب اس کے سوا اور کیا کہے گا کہ بھائی میں نے طیب ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا جو آپ مجھ سے اس کا ثبوت مانگتے ہیں۔ میں نے تو فن تعمیر کی بات کہی تھی اس میں اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ ایک مکان بنا کر دیکھ لے کہ میں واقعی معمار ہوں یا نہیں؟

یہی معاملہ ایک نبی اور رسول کا بھی ہے۔ ایک نبی اور رسول کا دعویٰ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے منصب رسالت پر مامور کیا گیا ہے، اور کار رسالت، انسانوں کو پہلی کی راہ دکھانا اور بری راہ سے بچانا اور ان کے نتائج سے ہر شخص کو خبردار کر دینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک رسول کا کام تبشیر و انذار ہے جیسا کہ آخری رسول کی رسالت کے سلسلے میں قرآن میں آیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (ذی اسرئیل: ۱۰۵)

(اے محمد) ہم نے تم کو صرف ایک مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے)

یہی بات قرآن مجید میں دوسرے متعدد مقامات پر کہی گئی ہے، لیکن اس حقیقت کے باوجود کفار نے دعوئے رسالت کے ثبوت میں جو فہرست مطالبات پیش کی وہ یہ تھی:

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا مِنَ السَّمَاءِ آيَةً أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ

خَيْلٍ وَعَذِيبٍ فَتُنزِلُ عَلَيْنَا نَهْرًا مُّغْتَبَرًا يَلْبَسُ حُلِيًّا أَوْ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا سَمَاوَاتٍ مُّطَوَّرَاتٍ كَمَا زَعَمْتُمْ عَلَيْنَا كَمَا

أَوْتَاتِنَا بِآيَاتِهِ وَالْمَكِيدَةُ قَيْدِ اللَّحْيِ أَوْ تَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرِفٍ أَوْ تَنْزِيلٌ فِي

السَّمَاءِ مَوْجٌ مِّنْ مَّوْجٍ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرُؤُهُ... (ذی اسرئیل: ۹۲-۹۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ تم زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ

لے یہ طرز استدلال ترکانِ قرآن سے اخذ ہے۔

کردو، یا تمہارے لیے کھجور اور انگوروں کا کوئی باغ ہو اور اس باغ کے بیج بیج میں تم
 نہریں جاری کرو یا جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، تم آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو، یا اللہ اور
 اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کر کرو، یا تمہارے پاس سونے کا ٹھہر ہوا تم (ملکے
 سامنے) آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کا بھی اعتبار نہ کریں گے جب تک کہ تم
 (آسمان سے) کوئی تحریم کو لا کر نہ دے دو جسے پڑھ کر ہم تمہاری صداقت کا یقین کریں۔
 کفار کے ان مطالبات کے جواب میں وحی الہی نے زبان رسالت مآب سے جو
 کچھ کہلایا وہ بس یہی کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّمَّا يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ اٰمُوْلًا وَّ اَنْۢبِيَاۡءًا مِّمَّنۡ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عِنۡدَ اللّٰهِ اَلۡسَوۡءُ الَّذِيۡ يَكْفُرُ بِاللّٰهِ وَ اَلۡسَوۡءُ الَّذِيۡ يَكۡفُرُ بِالرَّسُوْلِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِلِقَآءِ الرّٰسُوْلِ ۙ (نبی اسرائیل: ۹۲)

پاک ہے میرا رب (ہر نقص سے) کیا میں ایک بشر اور صل کے علاوہ بھی کچھ ہوں؟
 قرآنی بلاغت کا یہ اعجاز دیکھیے کہ چند لفظوں میں کفار کے تمام مطالبات کا جواب دے
 دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی میں نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ میں خدائی
 اختیارات کا مالک ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک بشر ہوں اور کوئی بشر خدائی اھنسا
 و اختیارات کا مالک نہیں ہوتا۔ میرا کام تو پیغام رسانی ہے یعنی میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ
 بندگان خدا کو اس کے خالق و مالک کی مرضی و نامرضی سے آگاہ کر دوں، اور اسے وہ راہ بتا دوں
 جو سعادت و کامرانی کی راہ ہے اور وہ راہ بھی بتا دوں جو بدبختی اور خسران کی راہ ہے۔ تم اگر
 میری آزمائش کرنا چاہتے ہو کہ میں مامور من اللہ ہوں کہ نہیں تو یہ دیکھو کہ جس صداقت کی راہ
 پر تم کو چلنے کی دعوت دیتا ہوں خود اس پر عمل پیرا ہوں کہ نہیں؟ اور تمہارے روحانی امراض
 کے لیے جو نسخہ شفا میں نے تجویز کیا ہے اس کو استعمال کر کے تمہارے روحانی امراض دور ہوتے
 ہیں یا نہیں؟ اور راہ صداقت پر چلنے کے نتیجے میں دنیا اور آخرت میں جس فوز و فلاح اور رفعت و
 سر بلندی کا میں نے تم کو یقین دلایا ہے تم اس دولت گراں بہا سے بہرہ ور ہوتے ہو یا نہیں؟
 ظاہر ہے کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جو رسول بھی دنیا میں آیا اور انسانوں کو صداقت کی راہ
 دکھائی وہ اس پر خود کامل طور پر نہ چلا ہو، اور جو امور صداقت اس نے بیان کیے وہ آگے چل کر انسانی
 علم و تجربہ کی روشنی میں غلط ثابت ہو گئے ہوں۔ اس کے علاوہ غیر صداقت کی جو راہ نوح انسانی

کو دکھائی اس پر چل کر انسانوں کو فوز و فلاح حاصل نہ ہوئی ہو۔ فی الواقع ایک رسول کی صداقت کی بنیاد انھی تین باتوں پر ہے یعنی رسول کی سیرت و کردار، رسول کی تعلیمات کا مصدر و ماخذ، خود رسول یا اس کے پیروؤں کی دینی و دنیوی فوز و فلاح۔

ان تین باتوں کو سامنے رکھ کر جب ہم انبیاء و رسل کی زندگیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو تینوں ہی باتیں یکجا نظر آتی ہیں۔ تمام انبیاء و رسل اپنے معاشرے کے بہترین انسان رہے ہیں اور تمام ممکنہ اوصاف حمیدہ ان کے اندر موجود تھے۔ دشمنوں نے ان کی تعلیمات کو تسلیم کرنے سے انکار تو کیا لیکن کبھی ان کی سیرت و کردار پر انگشت نمائی کی جرأت نہیں کر سکے۔ ہم کو کوئی نبی اور رسول بھی ایسا نہیں ملتا جس کی زندگی شان و شوکت کی زندگی رہی ہو، شان و شوکت تو درکنار انھوں نے اپنی پوری زندگی عسرت و تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی حالت میں گزاری۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جن انبیاء و رسل کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر غلبہ و اقتدار بخشا ان کا طرز زندگی بھی انتہائی سادہ اور فقیرانہ تھا، اور وہ زندگی کی آخری سانس تک زہد و قناعت اور استغناء کی شاہراہ سے سرمو منحرف نہیں ہوئے۔

کیا ایسے صالح ترین اور نیکو کار اشخاص سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ دعوغ گوئی کے مرتکب ہوں گے یعنی خدا کے رسول نہ ہوتے ہوئے بھی اس بات کے دعویٰ دار ہوں گے کہ وہ خدا کے رسول ہیں؟ اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس دعویٰ سے ان کا مقصود کسی مادی منفعت کا حصول بھی نہ تھا، کیوں کہ اس دعویٰ کے نتیجے میں وہ ہر طرح کے شدید مصائب و آلام سے دوچار ہوئے، اور کتنوں ہی کو دار و رسن کی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء و رسل کی پاکیزہ زندگیاں اور ان کا بے مثال کردار خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ غیر معمولی انسان تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس سیرت و کردار کے مالک صرف وہی خدا کے بندے ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ منصب نبوت کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے سیرت و کردار کی اس بلندی پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

ابن سعادت بزور بازو نیست تازہ بخشد خدائے بخشندہ

اس پہلو سے جب ہم پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو

وہ ہم کو بالکل منفرد نظر آتی ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ آپ کی پوری زندگی حسن کردار کا ایک مثالی نمونہ تھی یہاں تک کہ آپ کے دشمن بھی آپ کے کردار کی بلندی اور حسن اخلاق کے قائل تھے۔ آپ سارے عرب میں امین و صادق کے لقب سے مشہور تھے۔ بچپن سے لے کر آغاز نبوت تک کوئی ایک ایسا واقعہ بھی نہیں ملتا جو آپ کی بیغیرانہ حیثیت کے منافی یا اس سے کم تر ہو۔ میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ آپ کی زندگی کا ایک ایک عمل تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ آپ کی سیرت و کردار سے متعلق چند غیر مسلم اہل علم کے خیالات پیش کروں گا۔

جرمن مصنف ڈاکٹر گسٹاف وائل (Gustav well) نے اخلاق نبوی کی تصویق

ان الفاظ میں کھینچی ہے:

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم میں ایک روشن مثال تھے۔ آپ کا کردار پاک اور بے داغ تھا، لباس اور غذا میں ایک انوکھی سادگی تھی، مزاج میں اتنی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ اپنے ساتھیوں سے کوئی خاص تعظیم و تکریم قبول نہیں فرماتے تھے، اور اپنے غلام سے کوئی ایسی خدمت نہ لیتے تھے جو خود انجام دے سکتے، آئے دن آپ بازاروں میں سودا خریدتے اور گھر میں کپڑوں میں پیوند لگاتے اور بکری دوہتے نظر آتے تھے، ہر وقت ہر شخص کی آپ تک رسائی ہو سکتی تھی۔ بیماروں کی عیادت کرتے تھے اور ہر ایک سے ہمدردی رکھتے تھے، آپ کی سخاوت اور خیر و خیرات کی کوئی حد نہ تھی، باوجود ان بے اندازہ تحائف کے جن کی آپ پر ہر وقت بارش ہوا کرتی تھی، آپ نے نہایت مختصر ترک چھوڑا اور وہ بھی بیت المال کو بہرہ فرمائے تھے۔“

شہرہ آفاق مورخ جو سلطنت روما کے زوال (Down and Fall of Roman Empire) کا مصنف بھی ہے، آپ کی بلندی کردار کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

۱۲۸، ۱۲۹، مصنف ڈاکٹر محمد آصف قدوائی۔

”اپنی ذنیوی طاقت کے عروج پر بھی محمد کی شرافت نفس نے شاہانہ
تذکر و احتشام روانہ رکھا۔ خدا کا پیغمبر گھر کے ادنیٰ کام اپنے ہاتھ سے کرتا
تھا، آگ روشن کرتا تھا، جھاڑو دیتا تھا، بھیڑوں کا دودھ دوہتا تھا، اور
اپنے کلب اور جوتوں کی مرمت خود کر لیا کرتا تھا۔ تاک الدنیارہامیوں کے
مجادلوں سے نفرت کرتے ہوئے آپ بلا تصنع و تکلف ایک عرب اور
سپاہی کی طرح سادہ غذا استعمال فرماتے تھے، خاص خاص مواقع پر
آپ صحابہ کی دل کھول کر ضیافت کرتے تھے، مگر نجی زندگی میں اکثر آپ
کے گھر میں بفقوں چوٹا نہیں جلتا تھا۔“

کیا اس سیرت و کردار کے مالک انسان کے متعلق ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گمان
کر سکتے ہیں کہ وہ جھوٹا بھی ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا شخص بھی جھوٹا ہو سکتا ہے تو پھر تسلیم کرنا ہوگا
کہ آج تک تاریخ انسانی میں کوئی سچا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اگر یہ بات ناقابل تسلیم ہے تو
پھر پہلی بات بھی ناقابل تسلیم ہے۔

ایک رسول کی رسالت کا دوسرا بڑا ثبوت اس کی تعلیمات کا مصدر و ماخذ ہے۔ دنیا
کے وہ تمام ارباب علم و خرد جنہوں نے علم و دانش کے میدان میں اپنی عقلی برتری اور علمی عظمت
کے لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے کسی صاحب علم
سے علمی استفادہ نہ کیا ہو اور جس کے سارے علمی نظریات و افکار مختلف مراحل لغیرات سے
نہ گزرے ہوں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تضاد و نقص سے محفوظ رہے ہوں۔ اس
سلسلے میں استثنائی حیثیت صرف پیغمبروں کو حاصل رہی ہے۔ انہوں نے نہ تو کسی انسان
سے علمی استفادہ کیا اور نہ ہی ان کے افکار و نظریات کسی مرحلہ میں بھی ادنیٰ تغیر و تبدل سے آشنا
ہوئے۔ جو دعوت حق انہوں نے پہلے دن دی وہ آخر تک اسی صورت میں قائم رہی۔ ابتدا اور
انتہا میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ملتا ہے۔ پھر انہوں نے جو کچھ علمی حیثیت سے دنیا

۱۴۸، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱

کے سامنے پیش کیا وہ ہر طرح کے نقص اور افراط و تفریط سے پاک رہا ہے، اور تاریخ کے کسی دور میں ان کی ایک بات بھی غلط ثابت نہ ہو سکی۔

اس پہلو سے بھی سب سے نمایاں حیثیت نبی اُمّی کی ہے جو نہ گھسنا جاتے تھے اور نہ پڑھنا آپ جس ملک و معاشرہ میں پیدا ہوئے وہ بھی علم و حضارت کے اعتبار سے کوئی ترقی یافتہ ملک نہ تھا۔ لیکن اصلاح معاشرہ اور فلاح آخرت کی جو دعوت آپ نے دی وہ اخلاقی حیثیت سے اتنی بلند، انسانی فطرت و مزاج سے اتنی ہم آہنگ، اور علمی اعتبار سے اتنی پختہ اور کامل ہے کہ چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی افادیت اور کمالیت آج بھی کسی پہلو سے داغدار اور بے اثر نہیں ہو سکی ہے۔ جو علمی حقائق اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں وہ زمانہ ماضی اور حال کے بر علمی انکشاف کے باوجود اپنی جگہ پر قائم ہیں، بلکہ یہ انکشافات اس کی معجزانہ حیثیت کو نمایاں سے نمایاں تر کرتے جا رہے ہیں۔ سائنس کے جدید انکشافات ہوں یا محکمہ آثار قدیمہ کی تحقیقات، ان میں سے ایسی کوئی چیز بھی اب تک سامنے نہیں آئی ہے جو قرآن میں بیان کردہ حقائق اور تاریخی واقعات کے خلاف ہو۔

کسی ناخواندہ شخص کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ دنیا کو ایک ایسا ضابطہ اخلاق اور نظریہ زندگی دے جائے جو ہر حیثیت سے کامل ہو اور ہر عہد کی ضروریات کے عین مطابق بھی ہو۔ خود تو ناخواندہ ہو لیکن اپنا مخاطب اہل علم و عقل کو بنا لے اور صاف کہہ دے وما یذکر الا اولی الالباب (فیصمت تو صرف اہل عقل و فکر ہی قبول کرتے ہیں) انہا ینفشی اللہ من عبادہ العلماء (اللہ سے تو صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں)۔ اور جو عقل سے کام نہ لے اس کو جانور قرار دے صد بکم عسی فہم لایعقلون (گوگئے، بہرے اندھے ہیں وہ عقل سے کام نہیں لیتے) اور جو علم کے باوجود بے علمی اور بے راہ روی کی زندگی گزارے اس کی تمثیل میں حسن تمثیل کا حق ادا کر دے:

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا الثَّوَابَةَ ثُمَّ لَمْ يُعْمَلُوهَا كَمَثَلِ الْجَمَادِ يَخْمَلُ

لہ تفصیل کے لیے دیکھئے ہدای کتاب "تجلیات حق" (منون دلائل قرآن)

انسفاً آزاد (جمعہ: ۵)

جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بوجھ نہ اٹھایا (یعنی اس کے حکموں پر عمل نہیں کیا) ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتائیں لدی ہوئی ہوں۔

ایک رسول کی رسالت کا تیسرا بڑا ثبوت اس کی تعلیمات کا اثر و نفوذ اور اس کا یا اس کے پیروؤں کا دنیوی غلبہ و سر بلندی ہے۔ اس اعتبار سے بھی ہم کو انبیاء و رسل کی زندگیاں بڑی ہمت با نشان دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی دعوت و تعلیمات کے غلبہ و نفوذ کو باطل طاقتیں کبھی نہیں روک سکیں اور خود ان کی زندگی میں یا ان کے بعد ان کے پیروؤں کو ہر طرح کا دنیوی عروج و سر بلندی حاصل ہوئی۔ اس پہلو سے بھی آخری پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کو جو سرخروئی اور عظمت و سرفرازی ملی وہ تاریخ انسانی کا ایک روشن باب ہے۔

آنحضرت نے جس مشرکانہ ماحول میں دعوت توحید کا آغاز کیا وہ کسی پہلو سے بھی اس دعوت کے لیے سازگار نہ تھا۔ آغاز دعوت ہی میں باشندگان مکہ نہ صرف آپ کی دعوت کے مخالف ہو گئے بلکہ آپ کی جان کے بھی دشمن بن گئے۔ لیکن آپ ان کی مخالفت اور ایذا رسانی سے ذرہ برابر ہراساں نہ ہوئے، اور اپنی دعوت کو کامیابی کی منزل سے ہٹانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ اس راہ میں جو بھی شائد و مصائب پیش آئے آپ نے ان کو خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کیا، لیکن اپنے نصب العین سے کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوئے یہاں تک کہ ۲۳ سال کی مختصر مدت میں آپ اس مخالف ماحول پر غالب آ گئے، اور مرکز کفر و شرک (مکہ) پر قبضہ کر کے مخالفین و اعداء کی قوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ قرب و جوار کی حکومتیں بھی یکے بعد دیگرے آپ کے زیر نگیں ہو گئیں۔

یہ انقلاب محض کوئی سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر انقلاب تھا جس کے اثرات سے زندگی کا کوئی شعبہ بھی خواہ وہ اخلاقی ہو، خواہ معاشی اور خواہ معاشرتی، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو ملک و معاشرہ اخلاقی اعتبار سے پست تر تھا اس اسلامی انقلاب کے نتیجے میں اس کے رہنے والوں کا اخلاق انتہائی بلند ہو گیا، اور وہ تمام اخلاقی معائب جو ان کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے ان کی زندگی سے ایک ایک کر کے

رضت ہو گئے، جس ملک کے اکثر باشندے معاشی زبوں حالی میں مبتلا تھے وہ دفعۃً خوش حالی سے ہلکنار ہو گئے اور غریب و امیر کے درمیان معاشی عدم مساوات کی جو بلند دیواریں حامل تھیں وہ سب منہدم ہو گئیں، جس معاشرے میں ظلم و ستم اور قتل و خون ریزی کا ہر طرف دور دورہ تھا اب وہ عدل و اخوت کا ایک مثالی نمونہ بن گیا، نیز جو خطہ ارض سیاسی اعتبار سے انتہائی غیر منظم اور پراگندہ تھا وہ متحد اور منظم ہو گیا، ایسا متحد اور منظم کہ جس کی مثال پیش کرنے سے زمانہ قاصر ہے کیا اتنا بڑا سیاسی اور روحانی انقلاب تنہا ایک شخص برپا کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے یہ بے مثال سیاسی و روحانی انقلاب برپا کیا وہ یقیناً خدا کا رسول تھا، کیونکہ خدائے بزرگ و برتر کی نصرت و تائید کے بغیر کوئی شخص اتنی قلیل مدت میں اس طرح کا ہمہ گیر سیاسی اور روحانی انقلاب برپا نہیں کر سکتا ہے۔

آپ ایک رسول کی رسالت کا انکار صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ان تمام حقائق کو نظر انداز کر دیں، اور یہ بات بھی فراموش کر دیں کہ خدا ہر دور میں ایسے اشخاص تو پیدا کر سکتا ہے جو انسانی دماغ کے ارتقائی عمل میں معاون بنیں اور اس کی تمدنی ضروریات اور مادی حاجات کی فراہمی کی نئی نئی راہیں نکالتے رہیں لیکن وہ ایسے اشخاص پیدا نہیں کرے گا جو انسان کی روحانی زندگی کی تعمیر و تہذیب کا کام انجام دیں اور اسے اخلاق و انسانیت کے پیکر میں ڈھال کر انسانی معاشرہ کو اطمینان و سکون اور خیر و عدل کی دولت سے بہرہ ور کریں۔ آج بھی خیر و عدل کے جو باقیات انسانی معاشرے کے کسی گوشے میں نظر آجاتے ہیں وہ انبیاء و رسل کی مسائی اور ان کی دعوت حق ہی کا ثمرہ ہے۔ دنیا میں جو بھی مصلح اخلاق گزرا ہے اس نے داعیانِ حق ہی کی تعلیمات اخلاقی سے خوشہ چینی کی ہے۔

اگر ہم انسان کی روحانی زندگی اور اخلاقی فضیلت کے تصور کو تسلیم کرتے ہیں تو ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم رسول کی رسالت پر ایمان لائیں اور یہ مان لیں کہ جس طرح اللہ نے انسان کی جسمانی ضرورتوں کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح روحانی ضرورت یعنی رشد و ہدایت کا بھی نظم فرمایا ہے، اور اس رحمت خداوندی سے کوئی قوم بھی محروم نہیں رہی ہے۔

تفریق بین الرسل

ان تمام نیک ترین انسانوں پر جن کو مذہب میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے، ایمان لانا فرضی ہے۔ یہ بھی اسلام کا ایک امتیازی وصف ہے کہ اس نے صداقت کے عالم گیر ہونے کا اعلان کیا، اور صرف اعلان ہی نہیں کیا بلکہ اپنے ماننے والوں پر لازم کیا کہ وہ صداقت کے حاملین یعنی پیغمبروں پر بلا تفریق مذہب و ملت ایمان لائیں اس لیے کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے اور سب ایک ہی سرچشمہ ہدایت سے نکلے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

أَمَّنَ الرَّسُولَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ
أَمَّنَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَكُتِبَ لَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بَيْنَ يَدَيْهِمْ لَئِنْ كَفَرُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ مِنْهُمْ لَعَنَّا

رسول اس چیز پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس کے پاس بھیجی گئی ہے (بقرہ: ۲۸۵)

اور مومنین بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ وہ سب اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (ان کا کہنا یہی ہے کہ ہم رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید تفریق بین الرسل کا قائل نہیں ہے۔ وہ صاف طور پر کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو انبیاء و رسل بھیجے گئے ہیں ان سب پر ایمان لانا ایک مومن صادق کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو مانا جائے اور دوسرے کا انکار کر دیا جائے۔ قرآن مجید کے نزدیک وہ شخص مومن نہیں ہے جو کسی ایک نبی و رسول کی رسالت کا بھی منکر ہو، وہ ایسے شخص کو عذاب دردناک کی بشارت دیتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْ يَقُولُوا بَعْضُ الْمُؤْمِنِينَ يَكْفُرُونَ بَعْضُهُمْ أَكْفَرُ مِنْ بَعْضِهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا

لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا (بقرہ: ۱۵۰، ۱۵۱)

بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے

رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم فلاں پر ایمان رکھتے ہیں اور فلاں پر نہیں اور وہ ایک درمیانی راستہ کا لٹنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ حقیقت میں نرسکافر ہیں۔ اور کافروں کے لیے ہم نے رسواکن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفریق بین الرسل صرف یہی نہیں ہے کہ آپ کسی رسول کی رسالت کا انکار کر دیں بلکہ یہ بھی تفریق بین الرسل ہی ہے کہ آپ ایک کی تعلیم کو صحیح مابین اور دوسرے کی تعلیم کو رد کر دیں۔ ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام انبیاء و رسل کی اصولی تعلیمات کو درست تسلیم کرے کیوں کہ انبیاء و رسل کی اصولی تعلیمات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان اصولی تعلیمات کو قرآن مجید نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ ہم ان کی روشنی میں دوسرے انبیاء و رسل کی بنیادی تعلیمات کا سراغ آسانی کے ساتھ لگا سکتے ہیں۔

ایک نبی کی حیثیت اور اس کا فرض منصبی

ایک نبی اور رسول، خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ کا کام کرتا ہے۔ انسانوں کی ہدایت و اصلاح نیز اعمال خیر و شر کے عواقب سے ان کو خبردار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر ملک و قوم کے صالح ترین افراد کو منتخب کیا اور ان کے ذریعہ اپنا پیغام ہدایت اپنے بندوں تک پہنچایا۔ انبیاء و رسل کا کام صرف انہی پیغامات ربانی کو ٹھیک ٹھیک بندوں تک پہنچا دینا تھا۔ جو لوگ اس پیغام کو قبول کر لیں انھیں نجات اخروی اور سعادت ابدی کی بشارت دیں اور جو انکار و تمرد کی روش اختیار کریں انھیں تزد و سرکشی کے نتائج سے ڈرا دیں، دوسرے لفظوں میں وہ بشیر اور نذیر ہوتے ہیں۔

پیغام ربانی سے مراد وہ قانون زندگی اور ضابطہ حیات ہے جس کی پیروی کر کے ایک انسان دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ قانون زندگی کیا ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ اسلام یعنی اطاعت کا قانون ہے، اور یہی دین فطرت بھی ہے۔ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے انسانوں کو اسی دین اسلام یعنی خدائے واحد کی اطاعت اور فرماں برداری اور اس کی پرستش کی دعوت دی، عیسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ قرآن مجید میں

موجود ہیں:-

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۶۳﴾

(نہر، ۶۳)

اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی اطاعت و بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔

اسی پیغام کو انسانوں تک پہنچانے اور اس کے قبول و عدم قبول کے نتائج سے ان کو خبردار کرنے کے لیے تمام انبیاء مبعوث کیئے گئے تھے، کسی پیغمبر نے بھی یہ نہیں کہا کہ خدا کو چھوڑ کر اس کی اطاعت و بندگی کی جائے۔

یہ ہے نبی کی حیثیت اور اس کا فرض منصبی۔ اس کے سوا ایک نبی اور رسول کی کوئی دوسری حیثیت نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ تمام انبیاء انسان تھے، کسی نہ کسی انسان کے گھر میں اور کسی نہ کسی انسان ہی کی صلب سے پیدا ہوئے، انسانوں ہی کی طرح فطری طریقے پر ان کی پرورش ہوئی، جوانی اور کہولت کی منزلیں طے کیں اور پھر موت کی نیند سو گئے۔ تمام بشری خصوصیات ان کے اندر موجود تھیں۔ وہ بھی انسانوں ہی کی طرح سوتے اور جاگتے تھے، کھاتے اور پیتے تھے، بیوی اور بچے رکھتے تھے، خوشی کی بات سے خوش اور رنج دینے والی بات سے رنجیدہ و ملول ہوتے تھے، غرضیکہ تمام بشری اوصاف و خصائص سے متصف تھے، البتہ یہ تمام اوصاف و خصائص حدود اعتدال کے اندر تھے۔

اس امر کی وضاحت سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ وہ بشری تھے خدا نہ تھے، اور نہ بشر کے لباس میں خدا کا ظہور جسمی تھے جیسا کہ عیسائی، ہندو اور دوسری قومیں عقیدہ رکھتی ہیں۔ جب قرآن مجید کہتا ہے کہ تمام انبیاء بشر تھے تو اس سے مقصود اسی عقیدہ باطل کی تردید ہوتی ہے ورنہ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ بشر تھے۔ یہ تو منکرین حق بھی تسلیم کرتے تھے بلکہ ان کے انکار و کفر کی ایک بڑی وجہ ان کا بشر ہونا ہی تھا۔ چنانچہ وہ تعجب سے کہا کرتے تھے:

أَبَشَرٌ يَّمُذُنُنَا (تانب، ۶) کیا ایک بشر ہماری رہبری کرے گا۔

وہ بشریت اور رسالت کو دو متضاد چیزیں سمجھتے تھے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا

اور انہی کی کیا بات ہے آج کے علمی دور میں بھی کتنوں کے دماغ میں یہ بات نہیں گھستی کہ بشریت اور رسالت میں کوئی تخالف نہیں ہے، ایک بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ بہر حال قرآن پاک نے جہاں بشریت انبیاء کا ذکر تاکیداً انداز میں کیا ہے اس سے اس کا مقصود مشرکین عالم کے اس عقیدہ باطل کی تردید ہے کہ خدا خود انسانی لباس میں ظہور کرتا ہے۔

ایک سچے مومن کا عقیدہ یہی ہونا چاہئے کہ رسول بھی ایک انسان ہوتا ہے لیکن انتہائی بلند ترین انسان جس میں تمام ممکنہ اعلیٰ انسانی کمالات اور اوصاف پائے جاتے ہیں۔ وہ علم و عقل، فکر و نظر، فہم و فراست اور زہد و تقویٰ کا ایک ایسا کامل ترین نمونہ ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ کامل اور بلند نمونہ کا تصور عقل انسانی نہیں کر سکتی ہے۔ لیکن یہ سارے کمالات اور ساری عقل و روحانی فضیلت بشریت ہی کے دائرے میں ہوتی ہے بشری حدود و کمال سے باہر ان کا تصور کرنا دراصل ان کو بشریت کے مقام سے اٹھا کر الٰہیت کے مقام پر فائز کر دینا ہے جو کھلا ہوا ظلم ہے۔ ہمارا ایمان ہر قسم کے غلوئے عقیدت سے پاک و صاف ہونا چاہیے۔ ہم بشریت کے حدود میں رہ کر اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی فضل و کمال کی نسبت ان کی طرف کریں، لیکن ان کو کسی ایسی صفت اور کمال سے متصف نہ کریں جو صرف خدا کی صفت کمال ہو مثلاً ہم بینی اور ہم دانی جسے مذہبی اصطلاح میں علم غیب کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کسی نبی اور رسول کی طرف نہ کریں، کیونکہ مطلق، ذاتی اور حقیقی علم غیب صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ یہ مقام نہ فرستوں کو حاصل ہے اور نہ کسی نبی اور رسول کو جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (غل: ۶۵)

کہہ دو کہ خدا کے سوا زمین اور آسمان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو غیب کا علم رکھتا ہو۔

انبیاء کو اتنا ہی معلوم تھا جتنا کچھ اللہ نے اپنے خزانہ غیب سے ان کو عطا فرما دیا تھا:

وَلَا يُخْطَوْنَ يَهْتَفِ بِهِنَّ عَيْنٌ اِلَّا بِمَا سَاءَ (بقرہ: ۲۵۵) ایک دوسری جگہ فرماتا ہے۔

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰی غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَسُوْلٍ

(۲۴: ۲۶)

وہ منتخب رسولوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنے امور غیب کی خبر نہیں دیتا۔

ایک بشر کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ خدا سے

اپنے امور غیب پر مطلع کرنے کے لیے منتخب کر لے۔ خدا کے وہ بندے کتنے بختاوار اور بلند اقبال تھے جن کو اللہ نے اس نوازش خاص کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ اللہ کے لطف و کرم کی تحقیر ہے کہ ہم اسے کم تر درجہ کی چیز سمجھ لیں، اور ہماری عقیدت کو تشفی اسی وقت ملے جب ہم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عالم الغیب قرار دے لیں۔ غلو کے عقیدت کے مرض سے دنیا کی کوئی قوم محفوظ نہیں ہے مگر افسوس کہ مسلمان جن کے پاس قرآن مجید جیسی نظیر کتاب موجود ہے وہ بھی اس مرض سے محفوظ نہ رہ سکے۔

بنی اور رسول کو عذاب و ثواب اور نفع و ضرر کا مالک بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر طرح کے نفع و ضرر کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے کہ وہ مالکِ ارض و سما اور عالم غیب و شہادت ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تمام پیغمبروں نے خود اپنی زبان سے کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ، وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ
الْغَيْبَ لَأَسْتَكْبِرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ
وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۸﴾ (اعراف: ۱۸۸)

کہہ دو کہ میں خود اپنے نفع اور نقصان کا مطلق اختیار نہیں رکھتا۔ سب کچھ اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔ اگر میں غیب کا علم رکھتا تو خیر تیرے جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچتا۔ میں تو صرف ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو بات مانیں۔

ایک دوسری جگہ آیا ہے:

لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ (جن: ۲۱)

کہہ دو کہ میں نہ تو تمہارے لیے کسی ضرر کا کوئی اختیار رکھتا ہوں اور نہ ہدایت کا۔

یہ بات اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا مرتبہ گرانے کے لیے نہیں کہی ہے بلکہ اس کا ذکر صرف اس لیے کر دیا ہے کہ انسان رسول اور نبی کو صرف اس کا پیغام رساں سمجھے اور تمہا اسی کی ذات کو ہر خوف اور امید کا محور مرکز قرار دے کہ ہر رسول کی بعثت کلمہ ہی مقصد تھا۔ وہ زمین پر اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ خود اپنے نام کا کلمہ بلند

کریں، اور بندوں کے خوف اور اُمید کا محور و مرکز خود بن جائیں۔ ہر نبی نے یہی تعلیم دی کہ بخشش و عذاب، راحت و رنج، عزت و ذلت اور ملک و اقتدار کی کلید صرف خدا کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے:

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ
مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعْزِذُ مَنْ تَشَاءُ وَتُنْزِلُ مَنْ تَشَاءُ بِإِذْنِكَ الْخَيْدُ
إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۶﴾ (آل عمران: ۲۶)

کہہ دو کہ اے اللہ مالک الملک تو ہی جس کو چاہتا ہے زمین کی بادشاہت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اسے چھین لیتا ہے۔ اور تو ہی جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہر خیر کا سرشتہ ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اطاعت رسول

خدا کے ساتھ اس کے رسول کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ اس بات کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا:

قُلِ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ، فَإِن تَوَلَّوْا فَمَا لَكُمْ إِذْ لَمْ يَخُذِ الْكُفْرِينَ ﴿۳۲﴾ (آل عمران: ۳۲)

کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر وہ اس بات سے روگردانی کریں تو اللہ ایسے منکرین (حق) کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

خدا کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو اس لیے لازم کیا گیا ہے کہ رسول خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ کا کام کرتا ہے یعنی اس کے احکام و ہدایات کو اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ اس لیے جو شخص خدا کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس کے رسول کی اطاعت کرے۔ رسول کو رسول ماننا اور اس کی اطاعت سے روگردانی کرنا دراصل خدا کی اطاعت سے روگردانی کرنا ہے، اور ایسا کر کے کوئی شخص مومن

نہیں ہو سکتا۔

احادیث رسول

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جس قول کی نسبت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وہ حدیث ہے۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ آپ اللہ کے رسول بھی تھے اور بشر بھی، اس لیے آپ کا ہر قول حدیث کا درجہ نہیں رکھتا۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے جب لوگوں نے حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:-

”میں آپ کا پیڑوسی تھا اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا۔ لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟“

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے صرف وہی اقوال حدیث کا درجہ رکھتے ہیں جو توضیح احکام اور تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی حقیقت کا ترجمان ہے:

اذا امرتکم بشئ من دینکم جب میں تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم
فخذوا به واذا امرتکم بشئ دوں تو اسے لے لو اور جب میں تم کو اپنی
من رائی فانما انا بشر رائے سے کوئی حکم دوں تو ذرا سمجھو کہ میں

بھی ایک آدمی ہوں۔

احادیث دراصل قرآن پاک کی شرح و تفصیل یا دوسرے لفظوں میں منشاء و تالیف

سیرت النبی جلد چہارم ص ۵۵ (علامہ سید سلیمان ندوی) رحمہ اللہ، رواہ رافع بن خدیج، فضائل منہ

کی وضاحت ہیں۔ ایک رسول کا کام صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ مجرد کلام الہی کو لوگوں تک پہنچائے بلکہ یہ بھی فریضہ رسالت ہے کہ وہ کلام الہی کے حقیقی مفہوم و منشا کی تشریح و توضیح بھی کرے تاکہ اختلاف عمل واقع نہ ہو۔

کسی کلام کے منفی گوشوں کو نمایاں کرنے اور اس کے حقیقی مفہوم کے تعین کا حق صرف قائل کلام کو ہے، یہ حق کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا۔ قرآن مجید رسول پر نازل ہوا اور آپ ہی کے توسط سے یہ دنیا کو ملا، اس لیے کلام ربانی کے حقیقی منشا، و مفہوم کی تشریح و توضیح کا حق صرف رسول کو حاصل ہے۔ آج کوئی شخص اس بات کے لیے مجاز نہیں کہ وہ تشریحات رسول سے ہٹ کر قرآن کی کوئی دوسری تشریح کرے۔ اگر رسول نے کہہ دیا ہے کہ صلوٰۃ کا مطلب ایک مخصوص بدنی عبادت یعنی نماز ہے تو اب ساری دنیا مل کر بھی صلوٰۃ کا کوئی دوسرا مفہوم متعین نہیں کر سکتی۔ یہی صورت دوسرے تمام احکام اور ہدایت ربانی کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشتر تشریحات کا تعلق قوانین و احکام اور روح احکام سے ہے جسے قرآن مجید میں کتاب اور حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ان تشریحات یعنی احادیث کی صحت کی دلیل کیا ہے؟ یعنی یہ ہم کیسے مان لیں کہ آج جو باتیں اقوال رسول کہہ کر پیش کی جا رہی ہیں وہ فی الواقع اقوال رسول ہی ہیں اور ان میں کوئی حذف و اضافہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اکثر احادیث لفظاً نہیں معناراً وایت ہوئی ہیں۔ معانی کی صحت کا دار و مدار قائل کے الفاظ کی صحت پر ہوتا ہے جب الفاظ ہی محفوظ نہ رہے تو پھر بالیقین یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ منشا، قائل یہی تھا۔

اعتراض و قیاس ہے، لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی قرآن کی علمی شرح و تفسیر تھی تو پھر آج ہم آسانی کے ساتھ یہ جان سکتے ہیں کہ کون سا قول، قول

۱۔ ایک بلچند صحابہ ائمہ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس گئے اور پوچھا: انھوں نے کہا خلیق کیسا تھا؟ آپ نے جواباً پوچھا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد آپ نے یہ بیخ جملہ ارشاد فرمایا:

ان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن (ابوداؤد، باب الصلوٰۃ) (بقیہ حاشیہ صفحہ منفرہ)

رسول ہے اور کون سا نہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی قول ایسا ہے جو قرآنی تعلیمات سے ماخوذ یا اس کے کسی پہلو کی تفسیر و تشریح نہیں ہے یا وہ قرآن کی اصولی تعلیمات کے خلاف ہے تو ایسا قول، قول رسول نہیں ہو سکتا اور وہ اس قابل ہے کہ اسے رد کر دیا جائے خواہ اس کی پشت پر قوی اسناد ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ حدیث صحیحہ اور قابل اتباع ہے جو متواتر المعنی ہو اور ساتھ ہی قرآن کی کسی اصولی تعلیم کے خلاف بھی نہ ہو بلکہ کسی نہ کسی پہلو سے اس کی شارح و مفسر ہو۔ اگر مسلمانوں نے روز اقل سے ان دو اصولوں کو تسلیم کر لیا ہوتا تو اُمت مسلمہ نہ تو اختلافات کا شکار ہوتی اور نہ مذہب کے نام پر متعصب فرقتے ہی وجود میں آتے۔

www.KitaboSunnat.com

مجموعہ احادیث

حدیث پر اصولی گفتگو کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کتب احادیث پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جو ہمارے یہاں قرآن کے بعد قوانین اسلامی کا دوسرے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

احادیث کا مجموعہ، متعدد کتب پر مشتمل ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دوسری اور تیسری صدی ہجری کے مختلف ادوار میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی جن کتابوں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ تعداد میں چھ ہیں: بخاری (مولف امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ)، مسلم (مولف امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ)، ابوداؤد (مولف امام ابوداؤد متوفی ۲۶۴ھ)، ترمذی (مولف امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ)، سنن نسائی (متوفی ۳۰۳ھ)، سنن ابن ماجہ (متوفی ۲۴۱ھ)۔

(بغیر گزشتہ حاشیہ) بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق، قرآن تھا۔

حضرت عائشہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ آنحضرت کی پوری زندگی کا ایک ایک عمل قرآنی تعلیمت کے عین مطابق تھا۔ ۱۷ھ دوسری صدی ہجری کی پہلی کتاب موطا ہے۔ اس کے بعد حدیث کی جو دوسری کتابیں مرتب کی گئیں وہ تیسری اور بعض چوتھی صدی ہجری کی ہیں۔

انہی چھ کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ امام مالک کی موطا اس میں شامل نہیں ہے حالانکہ یہ حدیث کی سب سے پہلی کتاب ہے اور ۵۰۰ احادیث پر مشتمل ہے۔ امام مالک (متوفی ۱۸۱ھ) نے اس کتاب کو تعامل اہل مدینہ کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ تمام اہل حدیث اس امر پر متفق ہیں کہ موطا کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ اس میں جو احادیث مرسل اور منقطع ہیں وہ بھی دیگر طرق سے متصل ہیں۔ امام شافعی موطا کے متعلق فرماتے ہیں:

”کتاب اللہ کے بعد سب کتابوں سے زیادہ صحیح کتاب امام مالک کی موطا ہے۔“

عام طور پر بخاری اور مسلم کا درجہ سب سے بلند تسلیم کیا جاتا ہے اور انہیں صحیحین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تمام محدثین متفق ہیں کہ ان دونوں کتابوں کی تمام مشعل مرفوع احادیث صحیح ہیں، اور یہ دونوں کتابیں اپنے مولفین تک بالتواتر پہنچی ہیں۔

محدثین کی اس رائے اور تحقیق کے باوجود یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ کیا حدیث کی ان کتابوں میں مندرج تمام روایات صحیح اور درست ہیں، اور کیا ان کو نقد و نظر کی کوئی ٹیپا پر اب مزید پرکھے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟

ہمارے یہاں غور و فکر کا عام انداز یہی ہے کہ ان کتابوں میں مندرج تمام حدیثیں صحیح اور درست ہیں اور ان کی حیثیت اور عظمت مسلم اور عقیدے سے بالاتر ہے، اسی لیے تو احادیث کو وحی غیر متلو بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے تمام عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں کتب احادیث کو نہایت اہم مقام حاصل ہے، اور دوران تعلیم انہی کتابوں پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے، اور ان کا درس بڑے اہتمام سے دیا جاتا ہے جسے دورہ حدیث کہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل قرآن کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ اس کی تعلیم بس جلاہین اور بیضاوی تک محدود ہے۔ صحیح بات یہ کہ ہمارے مدارس کے علماء تدبر فی القرآن سے زیادہ

سلہ یہاں صحیح سے ننوی مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ یہ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب حدیث کی وہ قسم ہے جس کی سند راوی سے لے کر حضرت تک متصل ہو اور میں کوئی راوی چھوٹا نہ گیا ہو، اور اس کے سب راوی صادق اور پختہ حافظ رکھتے ہوں۔

۱۔ امام مالک و شافعی، نور الممالک - تاریخ، امام جلال الدین سیوطی، جلد اول ص ۲۶
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تدبیر فی الاحادیث کرتے ہیں، اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن قرآن مجید، جو دین کی اولین بنیاد ہے، اس سے غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ آج امت کا ایک بڑا طبقہ احادیث کو قرآن ہی کی طرح صحیح اور بر نقض سے پاک سمجھتا ہے، اور اس کے خلاف ایک لفظ سننا بھی خلاف ایمان سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز فکر سراسر غلط اور بالکل بے بنیاد ہے۔ آج بھی کتب حدیث میں ایسی متعدد احادیث موجود ہیں جو روایت اور درایت کے اصولوں پر پوری نہیں اترتیں، اور بعض ایسی بھی ہیں جو اسناد کے اعتبار سے تو صحیح ہیں لیکن قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

میری ان گزارشات کا یہ مفہوم بالکل نہیں ہے کہ ان احادیث کی بنیاد پر ہم سارے ہی ذخیرہ احادیث کو غرق مئے ناب کر دیں جیسا کہ منکرین حدیث کرتے ہیں، بلکہ اس سلسلے میں صحیح طرز فکر و عمل جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں، یہ ہے کہ ہم متواتر المعنی احادیث پر اپنے قول و عمل کی بنیاد رکھیں کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہر دور میں کثیر انسانوں نے ایک جھوٹ پر اتفاق کر لیا ہو۔ تو اتر روایت خود دلیل صحت ہے بشرطیکہ یہ قرآن کی کسی نص صریح سے متعارض نہ ہو۔ مستفیض احادیث کی یہی حیثیت ہے۔ ان کے علاوہ جو غیر متواتر احادیث ہیں اور جن کی تعداد کافی ہے، ان کو صرف اس لیے درست تسلیم نہ کر لیا جائے کہ وہ مجموعہ احادیث میں شامل ہیں۔ ان کو از سر نو روایت اور درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور پھر قرآن کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے، اور پھر ان کی صحت اور عدم صحت کا حکم لگایا جائے۔ ایسی تمام احادیث کو عمل کی بنیاد نہ بنایا جائے جو روایت اور درایت کے مسلمہ اصولوں پر پوری نہ اترتی ہوں یعنی جو ضعیف، منقطع یا مغلوب السند یا مغلوب المتن یا مجہول الحال لوگوں سے مروی ہوں یا قرآن کی کسی نص کے خلاف ہوں۔

یہ کوئی کار بدعت نہ ہوگا۔ یہ کام تو تمام جامعین احادیث اپنی اپنی زندگی میں کرتے رہے ہیں، لیکن بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ نقد و نظر بند ہو گیا اور ہم نے سارے ذخیرہ احادیث کو منزل من اللہ قرار دے کر ان سب کو صحیح تسلیم کر لیا۔ روایت بالمعنی میں غلطیوں کا امکان

سہ مستفیض وہ احادیث کہلاتی ہیں جن کو متن یا اس سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہو۔

بہر صورت موجود ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ذخیرہ احادیث کا از سر نو علمی جائزہ لیا جائے تاکہ احادیث کی صحت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو جائے اور منکرین احادیث کو کسی فتنہ پر داری کی کوئی مقبول بنیاد نہ مل سکے۔

سنت رسول

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، حدیث قرآن مجید کی قوی تشریح کا نام ہے اور اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے جس میں عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، مواعظ و نصائح اور اخبار معاد وغیرہ سب ہی شامل ہیں، اور سنت قرآن مجید کی فعلی تشریح کا نام ہے اور اس کا دائرہ محدود ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید اصول احکام کی کتاب ہے اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح و توضیح ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں آیا ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ یہ عبادت کے دو اصولی احکام ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کر کے اس کی عملی شکل و صورت متعین کی اور یہی سنت ہے، اسی پر قرآن کے دوسرے تمام اصولی احکام کو قیاس کرنا چاہیے۔ امام شاطبی فرماتے ہیں:

فكانت السنة بمنزلة التفسير

والشرح لمعاني الاحكام الكتب

سنت در اصل احکام کتاب کے معانی کی شرح و تفسیر ہے۔

(المواقف ج ۲ ص ۱۰)

سنت کا وہ محدود مفہوم کسی طرح صحیح نہیں ہے جو آج کل دینی حلقوں میں سمجھا جاتا ہے۔ ہم یہاں تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف چند اصولی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

سلہ ہمارے بیان دین دار لوگ سنت سے صرف ظاہری شکل و صورت اور بعض ثانوی اعمال عبادت ہی مراد لیتے ہیں اور انہی کو دین و تقویٰ کی علامت سمجھتے ہیں۔ سنت کے اس عملی مفہوم کی ترویج میں ہلکے ہلکے علماء کرام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی سنتوں کو کسر فراموش کر دیا ہے۔ آج کون عالم دین ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سادہ لباس پہنتا ہو، سادہ غذا کھاتا ہو، معمولی مکان میں رہتا ہو۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اعمال جن کا تعلق معاشرتی امور سے ہے مثلاً اشیاء خورد و نوش، لروف، فروش، لباس، مکان اور سواری وغیرہ، ان میں سے کسی چیز کو بھی حقیقی معنوں میں سنت کا رتبہ حاصل نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق ملکی عادات اور مقامی تمدن سے ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جداگانہ معاشرت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ اس وقت جو مقامی عربی معاشرت رائج تھی اسی کو بعض ضروری اصلاحات کے بعد اختیار کر لیا مثلاً جو لباس ایک مومن عرب کا تھا وہی کافر کا بھی تھا اس میں فرق صرف اس قدر تھا کہ مومن کے لباس میں

(بھیگز نہ حاشیہ) اپنا جو ناپے ہاتھ سے گانٹھ لیتا ہو، بکریاں خود دوہ لیتا ہو، پیڑھیوں کی خبر گیری کرتا ہو، ان کا سودا سلف بازار سے لاتا ہو، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہو، غریبوں، یتیموں اور یتیموں کی داسے درے سخنہ دکر تا ہو، حق گو اور راست باز ہو، کسی حال میں بھی خدا کے سوا کسی انسان سے نہ ڈرتا ہو، حق کا کلمہ بلند کرنے والا ہو، اور منکرات کو مٹانے کے لیے لگی لگی، اور شہر شہر دوڑتا پھرتا ہو اور لعلک با مح نلفک الا یکونوا صومنین کی تصویر ہو۔ جھوٹ نہ بولتا ہو، غیبت نہ کرتا ہو، عیب چینی اور عیب جوئی نہ کرتا ہو، بہتان طرازی سے پرہیز کرتا ہو، اور غرور و تکبر میں مبتلا نہ ہو۔ اُسوہ رسول تو خیر بڑی چیز ہے اُسوہ صحابہ بی پر عمل پیرا ہو۔ حضرت ابو بکر صدیق کی طرح اس دار فانی سے کوچ کرے تو اس کے گھر میں تجسینہ و تکفین کے لیے نقد رقم موجود نہ ہو، فاروق اعظم کی طرح جن کے قدموں پر روم و ایران کی دولت کا دھیر لگا رہتا تھا، بیوند لگا پڑا ہینتا ہو، غریبوں کے گھروں پر غلہ اپنی پشت پر لا کر لے جاتا ہو، جس کے خوف خدا کا یہ عالم ہو کہ تنکا اٹھا کر کہے کہ کاش میں تنکا ہوتا تو روز آخرت میں اسے سے بچ جاتا، جس کے انکسار اور ضبط و تحمل کا یہ عالم ہو کہ ایک بڑیا بھی برس برس نہ ٹوک دے تو پیشانی پر بل نہ آئے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرات سر علما و ائمہ ہیں۔ اللہ کے نیک بندے ہر دم میں ہیں آج بھی اور تاقیامت میں گے۔ خدا کے ان نیک بندوں کو مستحق کر کے دیکھیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ آج ہمیں ہمارا کرام اور شیوخ نظام کی زندگیوں آن حضور و آپ کے عقیدہ صحابہ کے اس سے بڑی سنگ ٹھی ہوئی ہیں۔ اس قسم کی مثالیں کئی کئی ہیں ہے جن پر یہ آیت صادق آتی ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَقُولُوْنَ الْكُتُبُ اَفَلَا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ: ۲۲۰)

کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو در آخر ایک تم کتاب (الہی) کو پڑھتے ہو۔ کیا تم ذرا بھی سمجھ نہیں رکھتے؟

سترپوشی، سادگی اور انکسار کا رنگ غالب تھا۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ ہر قوم کے شرفاء کا قومی لباس اسلامی لباس ہے بشرطیکہ اس میں سترپوشی کا خیال رکھا گیا ہو، اور اس سے فخر و غرور اور تشابہ مردوزن کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ اسی طرح جو کھانا ایک مومن عرب کھاتا تھا وہی کافر بھی کھاتا تھا فرق صرف حرام اور حلال کا تھا یعنی مومن کی غذا اور کسب غذا کے ذرائع دونوں ہی حرام عنصر سے پاک تھے۔ یہی حال دیگر معاشرتی امور کا بھی ہے۔

معاشرتی امور کے علاوہ بعض دوسرے دنیاوی معاملات کا بھی سنت سے امتداد کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً زراعت، تجارت، ذرائع حمل و نقل، آلات حرب اور طریق معاہدہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں ایک مومن کو ہر دور کے مفید تجرباتی طریقوں کو اختیار کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جنگ عظیم اول میں علماء ترکی نے ترک فوجوں کے لیے بندوق کے استعمال کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اسی طرح خود ہندوستان میں ہمارے بعض علماء نے مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دے دیا تھا۔ سنت نبوی کے حقیقی مفہوم کی وضاحت کے لیے ہم یہاں دور نبوی کے ایک واقعہ کا ذکر کریں گے۔

مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر رزق چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں پر ڈالے جاتے تھے۔ آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو ایک رسمی بات سمجھ کر فرمایا: "اگر ایسا نہ کرو، تو اچھا ہوگا" اہل مدینہ نے آپ کا یہ ارشاد سن کر اس سال یہ ترکیب نہیں استعمال کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہو گئی۔ لوگوں نے جب اس کی خبر دی تو آپ نے فرمایا: "میں نے ایسا خیال کیا تھا، انتم اعلم بامورد دنیاکم" تم اپنے دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔"

اس تاریخی واقعہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال جن کا تعلق عقائد، اعمال اور اخلاق کے بجائے دنیوی امور سے ہو، ان کو ہر دور

سہ صحیح مسلم۔ اس پر امام نووی نے یہ عنوان باندھا ہے۔ باب وجوب امتثال ما قالہ مشرعاً

دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معاش الدنیا علی مسیئہ الی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

میں جوں کاتوں واجب العمل سنت قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔ مستقل اور غیر متبدل وہی سنت ہے جو قرآن کے کسی اصولی حکم پر مبنی ہو۔

وہ متشرع لوگ جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو سنت قرار دے کر ان پر عمل کی تلقین کرتے ہیں لیکن حقیقی سنتوں کو نظر انداز کرتے ہیں، وہ اپنے اس رویے سے وہی بات یاد دلاتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودی احبار کے متعلق فرمائی ہے۔ یہودی علماء نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی کہ ان کے شاگرد بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھاتے ہیں اور یہ بزرگوں کی سنت کے خلاف ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

”تم اپنی روایت سے خدا کا حکم کیوں ٹال دیتے ہو؟ کیونکہ خدا نے فرمایا ہے تو اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کرو اور جو ماں یا باپ کو برا کہے وہ دنہ ورجان سے ملا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو کوئی باپ یا ماں سے کہے کہ جس چیز کا تجھے مجھ سے فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ خدا کی نذر ہو چکی۔ تو وہ اپنے ماں باپ کی عزت نہ کرے۔ پس تم نے اپنی روایت سے خدا کا کلام باطل کر دیا۔ اے یا کارو، یسعیاہ نبی نے تمہارے حق میں کیا خوب نبوت کی ہے:

یہ امت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے
مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے۔

اور یہ ب فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیوں کہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔

پھر اس نے لوگوں کو پاس بلا کر کہا کہ سنو اور سمجھو۔ جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی مگر جو منہ سے نکلتی ہے وہ آدمی کو ناپاک کرتی۔ اس پر شاگردوں نے اس کے پاس آ کر کہا: کیا تو جانتا ہے کہ فریسیوں نے یہ بات سن کر ٹھوکر کھائی۔ اس نے جواب میں کہا: جو لوگوں کو دیر سے آسانی

باب نے نہیں لگایا ہے اسے کھا دیا جائے گا۔ انہیں چھوڑ دو۔ وہ اندھے مجھم کلائے سے یزید، مروج و منکرہ، موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

راہ بتانے والے ہیں، اور اگر اندھے کو اندھا راہ بتانے کا تو دونوں گڑھے میں گریں گے۔ پطرس نے جواب میں اس سے کہا یہ تمہیں ہمیں سمجھا دے۔ اس نے کہا کیا تم بھی اب تک بے سمجھ ہو؟ کیا نہیں سمجھتے کہ جو کچھ منہ میں جاتا ہے وہ بیٹھ میں پڑتا ہے اور مزہل میں پھینکا جاتا ہے۔ مگر جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیوں کہ برسے خیال، نوحی ریزیاں، زنا کاریاں، حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں دل ہی سے نکلتی ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں مگر ہاتھ دھوئے بغیر کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا، اللہ

کتابوں پر ایمان

جس طرح ہم تمام انبیاء و رسل پر یکساں ایمان رکھتے ہیں اسی طرح جو کتابیں وہ لے کر آئے ان پر بھی ہم یکساں طور پر ایمان رکھتے ہیں یعنی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تمام کتابیں خدا کی طرف سے مختلف عہد کے انسانوں کی فکری و عقلی ہدایت کے لیے نازل ہوئی تھیں جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

قُلُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا مِنْ رَبِّهِمْ وَأَسْمِعُوا
وَأَسْمِعُوا وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا
أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ
مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۶﴾ (بقرہ: ۱۳۶)

کہہ دو کہ ہم تو ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر اتاری ہے، اور اس پر جو
ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل کی گئی تھی اور اس پر بھی جو موسیٰ و
موسیٰ اور دیگر انبیاء کو دی گئی تھی۔ ہم ان پیغمبروں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور

ہم اللہ کے صلح و فرماں بردار ہیں۔

تمام مذہبی کتابوں اور تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان رکھ کر ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ خدا کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور تمام داعیان حق ایک ہی دین کے علم بردار تھے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

شَرَعْنَا لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّ بِهِ نُوحًا وَ الَّذِي آوَحَيْنَا
إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقْبِلُوا
الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ (شوری: ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جسے ہم نے بذریعہ وحی تمہاری طرف بھی بھیجا ہے اور ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی اسی کا حکم دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں تفرق نہ ہو جاؤ۔

قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی حیثیت سے تمام ادیان درحقیقت ایک ہی اصل پر مبنی ہیں اور ہر قوم کے پیغمبر ایک ہی دین یعنی دینِ قیم کی طرف بلانے والے تھے یہ دین قیم کیا تھا؟

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَا حُفَاةَ وَ يُعْتَمُوا الصَّلَاةَ وَ
يُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَ ذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ ۝ (بینہ: ۵)

اور ان کو بس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں طاعت کو اسی کے لیے خاص کرتے ہوئے بالکل کیسے ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سیدھا دین ہے۔

ہم تمام مذہبی کتابوں پر ایمان رکھ کر دراصل اسی دینِ قیم کی تصدیق کرتے ہیں جو تمام پیغمبروں کا متفق علیہ دین ہے۔

ایمان بالکتاب کے تقاضے

آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے کا صرف اتنا ہی مفہوم نہیں ہے کہ آپ ان کو منزل من اللہ اور صداقت کا حامل سمجھ لیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے زمانے کے لیے جس

کتاب کو نازل فرمایا گیا ہے آپ اس کی تعلیمات پر بھی عمل کریں۔ اگر آپ ان میں بیان کردہ احکام خداوندی پر عمل نہیں کرتے ہیں تو آپ حقیقی معنی میں مومن نہیں ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

وَ كَيْفَ يُعْذِرُكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمٌ اللَّهُ ثُمَّ
يَتَوَكَّنُونَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۳﴾ (المائدہ: ۴۳)

اور وہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جب کہ اس میں (تورہ) خدا کا حکم موجود ہے۔ پھر بھی وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ فی الواقع مومن نہیں ہیں۔

آگے چل کر فرماتا ہے کہ ایسے لوگ فی الواقع منکر حق ہیں۔

وَمَنْ لَمْ يَخُفْ يَمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ ﴿۴۴﴾ (المائدہ: ۴۴)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی منکر حق ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا:

وَمَنْ لَمْ يَخُفْ يَمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۴۵﴾ (المائدہ: ۴۵)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ دراصل ظالم ہیں۔

مذکورہ آخری دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر یعنی منکر حق بھی ہے اور ظالم بھی۔ کافر تو اس لیے کہ وہ خدا کے قانون کو صحیح یا واجب العمل تسلیم نہیں کرتا، اور ظالم اس لیے کہ خدا کا قانون تو عدل و انصاف پر مبنی ہے، اس کو چھوڑ کر وہ نہ صرف اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بناتا ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے تو خدا کے قانون کو تسلیم کرتا ہے لیکن خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کر اپنے معاملات کا فیصلہ خدا کے قانون کے بجائے کسی دوسرے قانون کے مطابق کرتا ہے تو ایسا شخص فاسق یعنی گنہگار ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل انجیل کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

وَلِيَخُفْكُمْ أَهْلَ الْاِنْجِيلِ يَمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَنْ لَمْ يَخُفْ يَمَّا

أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۴۶﴾ (المائدہ: ۴۶)

اہل انجیل کو چاہیے کہ وہ انجیل میں خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے اس کے مخاطب صرف اہل کتاب ہیں۔ ایسا سمجھنا صحیح خود فریبی ہوگی۔ اگر کسی فعل کا ارتکاب اہل کتاب کو مجرم قرار دے سکتا ہے تو پھر اگر کوئی مسلمان اسی فعل کا ارتکاب کرے تو وہ کیوں نہ مجرم قرار پائے، خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے کسی نے کہا کہ یہ تین آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں یعنی اگر بنی اسرائیل کا کوئی شخص خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اس کے جواب میں حضرت حذیفہؓ نے فرمایا:

نعم الاخوة لکم بنو اسرائیل کتنے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل
ان کانت لہم کل مرۃ ولکم کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے اور میٹھا میٹھا سب
کل حلویۃ کلا واللہ لتسلکن تمہارے لیے ہر گز نہیں، خدا کی قسم تم سب انہیں
طریقہم قدر الشراک کے راستے پر قدم بدم چلو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خدا کی کتاب ایمان لکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس میں بیان کردہ احکام کو بھی تسلیم کرے اور حتیٰ الوسع خدا کے قانون کے مطابق اپنے معاملات زندگی کا فیصلہ کرے۔ حتیٰ الوسع کی بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ انسان اپنی واقعی استطاعت کی حد تک ہی مکلف ہے۔ اور یہ واقعی استطاعت غیر اسلامی ریاستوں میں خصوصیت کے ساتھ متاثر ہو رہی ہے۔ مثلاً مقدمے کا ایک فریق تو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ چاہتا ہے لیکن فریق ثانی اس کے لیے تیار نہیں ہے، وہ ملکی قانون کے مطابق فیصلہ چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں فریق اول یا تو اپنے حق سے دست بردار ہو جائے، اور یا غیر اسلامی عدالت میں اپنے حق کے دفاع کے لیے جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخصوص حالات میں بدرجہٴ نبوری صرف اپنے حق کے دفاع کے لیے ایک شخص غیر اسلامی قانون کو اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ تو خدا کے قانون کے مطابق فیصلہ چاہے لیکن فریق ثانی اس کے لیے تیار نہ ہو اور حکومت غیر اسلامی ہو۔

۱۔ تفہیم القرآن جلد اول سورہ مائدہ حاشیہ ۷۰

جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کتاب کی تلاوت کرے اور ٹھیک ٹھیک تلاوت کرے جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے:

الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَكْثَرُ عَلَىٰ حَقِّ تِلَاوَتِهِ ۗ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ

پہ (بقرہ: ۱۲۱)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کتاب کی تلاوت کرتے رہتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت

کرنے کا حق ہے۔ یہی لوگ درحقیقت کتاب پر پتلا ایمان رکھتے ہیں۔

ٹھیک ٹھیک تلاوت کتاب کا مطلب یہ ہے کہ تمام لوازم آداب کے ساتھ اسے پڑھا جائے، اور اس کے ہر امر و نہی پر عمل کیا جائے اگر کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت کے باوجود اس کے ادا و نواہی کی پروا نہیں کرتا ہے تو اس تلاوت سے کوئی فائدہ نہیں، اور اللہ کی کتاب پر اس کا ایمان صرف زبانی ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی حق تلاوت ادا نہیں کرتا جو امر و نواہی پر عمل تو درکنار اس کے معنی و مفہوم سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ یہ دونوں باتیں حقیقی ایمان کے منافی ہیں۔ جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے ادا و نواہی کو کبھی جانتا ہے لیکن ان پر عمل نہیں کرتا، وہ فاسق ہے، اور جو شخص قرآن پاک کی تلاوت کے باوجود اس کے ادا و نواہی کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا وہ غیر شعوری طور پر قرآن کی بے قدری کرتا ہے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ تلاوت سے اس کا مقصد تطہیر قلب اور تہذیب اعمال نہیں بلکہ محض حصول ثواب ہے۔ ہر تلاوت کرنے والے کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ نبی اُمّی کی بعثت کا مقصد تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ تزکیہ باطن بھی تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (مجاد: ۲)

اسی نے ناخواندہ لوگوں میں خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

آخرت پر ایمان

قرآن مجید نے واشتکاف انداز میں اس حقیقت کا اظہار متعدد مقامات پر کیا ہے کہ ایک دن اس وسیع و عریض عالم مادی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم جداگانہ خصوصیات کے ساتھ معرض وجود میں آئے گا۔ اور اسی کے مطابق اس کو جزا یا سزا ملے گی۔ اسی دن کا نام اس کی اصطلاح میں یومِ آخرت یا یومِ جزا (Day of Reward) ہے۔

قرآن میں عقیدہ توحید کے بعد جس عقیدہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ عقیدہ آخرت ہے۔ کیونکہ تنہا یہی عقیدہ یعنی پرستش اعمال کا تصور ایک انسان کو ہمہ وقت اس کے اعمال کا نگران بناتا ہے اور اس کو نفس کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور اس کے قلب و ذہن کا تزکیہ کرتا ہے اور انسانی معاشرے کو ایثار و ہمدردی، غمخواری و غمگساری، وجود و سخاوت، رحمت، عدل و قسط، دیانت و امانت اور صداقت و حق گوئی کی جوہری صفات عطا کر کے اس کی بنیادوں کو مستحکم بناتا ہے۔ گویا اصلاح معاشرہ اور انسانوں میں مثالی کردار پیدا کرنے کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ عقیدہ آخرت کا صحیح تصور ہی ہے اگر آپ اس عقیدے کو انسانی زندگی سے نکال دیں تو پھر فساد معاشرہ اور فساد اخلاق دونوں کا وقوع ناگزیر ہے۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں جب بھی انسانی زندگی پر اس عقیدے کی گرفت ڈھیلی ہوئی ہے، انسانی معاشرہ ظلم و عدوان، خواہش لواری و اقربا پروری، خود غرضی و خود پرستی، سنگتلی و بے مروتی، عیش کوشی و نفس پرستی، خبیانت و بددیانتی، دجل و فریب اور ایسے ہی سیکڑوں نہاں و اخذق بد کی خرابیوں سے آلودہ ہونے بغیر نہیں رہ سکا ہے۔ عقیدہ آخرت کی اسی اہمیت کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔

روزِ جزا کا مفہوم

قرآن حکیم نے آخرت کے لیے ایک لفظ یوم الدین بھی استعمال کیا ہے جس کا مطلب

روز جزا ہے۔ یہ لفظ خود آخرت کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ سورہ فاتحہ جو نماز کا جزو لازم ہے اس میں یہ لفظ مالکِ یوم الدین کی شکل میں موجود ہے۔ سورہ فاتحہ میں خدا کی تین صفیوں کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ترتیب کے اعتبار سے یہ تیسری صفت ہے پہلی دو صفتیں ربوبیت اور رحمت ہیں۔ یہ تینوں صفتیں لازم و ملزوم ہیں۔ ربوبیت کے بغیر رحمت کا اور رحمت کے بغیر ربوبیت کا تصور محال ہے اور ان دونوں کا ناگزیر نتیجہ تصور عدالت ہے۔ اگر آپ ان میں سے ایک صفت کو بھی نکال دیں تو پھر دوسری صفتوں کا کوئی حقیقی تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ساری کائنات خدا کی انھیں تین عظیم صفتوں پر قائم ہے۔

ہم جیسے ہی مالکِ یوم الدین کہتے ہیں، ہماری نگاہ کے سامنے ایک عادل حکمراں صفتی کا تصور پھر جاتا ہے جو اپنی رعیت کی نزویات کا کفیل اور اس کے حال پر حد درجہ مہربان ہے لیکن وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کی رعیت اس کی ربوبیت اور رحمت سے فیض یاب ہونے کے بعد کیا طرز عمل اختیار کرتی ہے یعنی شاکرِ نعمت بنتی ہے یا کفرانِ نعمت کی مرگب بنتی ہے؟ اس عادل و رحیم ہستی نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیج کر بندوں کو واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اس کا کون سا عمل شکرِ نعمت کے درجہ میں آتا ہے اور کون سا عمل کفرانِ نعمت کے ہم معنی ہے اور یہ کہ شکرِ نعمت سے وہ بخش اور کفرانِ نعمت سے ناراض ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں انسان کو اعمال کے نتائج سے باخبر کر دیا ہے اور یہ اس کی رحمت و ربوبیت کا عین افضاء تھا۔ فی الواقع انسانی افعال کے نتائج کے ظہور کا نام ہی روزِ آخرت یا روزِ جزا ہے۔ جس طرح ہر عمل کا ایک ردعمل ہے اور ناممکن ہے کہ عمل واقع ہو اور اس کا ردعمل ظہور میں نہ آئے۔ اسی طرح یہ سبھی ناممکن ہے کہ انسان سے کوئی فعل سرزد ہو اور اس فعل کے نتائج ظاہر نہ ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ اشیائے غذائی اور پانی کا استعمال بقائے حیات کا ایک ذریعہ ہے، کیونکہ غذا اور پانی کا یہ لازمی خاصہ ہے۔ اسی طرح سنکھیا کا استعمال آدمی کو ہلاک کر دیتا ہے کہ یہ اس کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ان چیزوں کو استعمال کرے اور اس کے اثرات و نتائج سے دوچار نہ ہو۔

مادیات کی طرح معنویات کے بھی قوانین ہیں، چنانچہ روزِ آخرت اپنے افعال کا نتیجہ

روحانی مسرت اور خوشنودی رب کی صورت میں اور برے افعال کا نتیجہ حزن و ملال اور روحانی کرب و اضطراب اور خدا کی ناخوشی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ایسا ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس دنیا میں برے عمل کرے اور روزِ آخرت اس کے نتیجہ بد سے بچ جائے اور کوئی شخص اچھا عمل کرے اور اس کے صالح نتائج اسے حاصل نہ ہوں۔ اس دنیا میں تو ممکن ہے کہ بعض حالات میں اس کے خلاف بھی ہو جائے، لیکن روزِ آخرت نتائج اعمال اپنی حقیقی صورتوں ہی میں ظاہر ہوں گے۔ ان حقائق کو قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ سَوَاءٌ مَخْلَبًا لَهُمْ وَمَا تَأْتُهُمْ ۚ سَاءَ
مَا يَخْتُمُونَ ﴿۷۱﴾ (بخاری: ۷۱)

وہ لوگ جو برے کام کرتے رہتے ہیں، کیا انہوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے، ان کا جینا اور ان کا مرنا ایک ہی طرح کا ہوگا، یہ بڑا عجیب اور بڑا فیصلہ کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ أَمْ نَجْعَلُ
الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴿۷۲﴾ (ص: ۷۲)

کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے برابر کر دیں گے جو زمین میں فساد
فشاں پھیلاتے ہیں، یا کیا ہم متقی کو فاجر کے برابر رکھیں گے؟

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ افعال کے نتائج یکساں نہیں ہو سکتے یہی عقل کا فیصلہ
ہے اور یہی عدل و انصاف کا تقاضا بھی ہے۔ یومِ آخرت پر جو شخص یقین رکھتا ہے وہ اعمال
کے نتائج پر بھی یقین رکھے جو شخص نتائج اعمال کو تسلیم نہیں کرتا وہ فی الواقع روزِ جزا کے
مفہوم سے واقف نہیں ہے اور اس ناواقفیت کا نتیجہ ایک دن اس کی ہلاکت کی صورت
میں ظاہر ہوگا۔ سنگھیا کھانے والا یہ کہہ کر سنگھیا کے نتائج سے نہیں بچ سکتا کہ اسے
یہ معلوم: خاکہ سنگھیا ایک مہنک شے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کے

ذریعہ ہم کو اعمال کے اثرات و نتائج سے آگاہ کر دیا ہے اس لیے روزِ آخرت اعمال کے نتائج کو دیکھ کر کوئی شخص کسی طرح کی کوئی معذرت پیش نہیں کر سکے گا، اور اس سے صاف کہہ دیا جائے گا:

الْيَوْمَ نَجْزِيَنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۸﴾ (حاشیہ: ۲۸)

جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے رہے ہو آج کے دن اس کا پورا پورا بدلہ پارہے ہو۔

پھر وہاں معذرت کی گنجائش کہاں کہ اس کا پورا دفترِ اعمال اس کے سامنے کھد ہوگا:

وَكُلُّ إِنْسَانٍ أَلَمْنَهُ لِحَظِرَةِ رَبِّهِ ۚ وَ يُخْرِجُهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كَيْتَابًا يُقْلِقُهُ ۚ مَنْ شُورًا ۚ أَقْرَأَ كِتَابَكَ ۚ كَفَىٰ بِتَفْسِيكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿۱۳۰﴾ (بنی اسرائیل: ۱۳۰)

ہم نے ہر انسان کی بھلائی برائی کو اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم اس کے نامہ اعمال کو اس کے سامنے نکال کر رکھ دیں گے جس کو وہ اپنے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی صورت میں دیکھ لے گا۔ لے پڑھا اپنا نامہ اعمال، آج کے دن تو خود اپنے محاسب کے لیے کافی ہے۔

اس دن تمام مجرم اپنے اعمال کے نتائج کو اصل صورت میں دیکھ کر آئینہ حیرت بن جائیں گے اور تعجب سے کہیں گے:

يَوْمَ نَبْلَتْكُمْ مَالِ هَذَا الْكُتُبِ لَا يَعَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَ وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظْلَمُ سَرِيحًا أَحَدًا ۙ ﴿۴۹﴾ (کہف: ۴۹)

اے ہماری کم ہمتی! یہ کیسا نامہ اعمال ہے جس میں ہر چھوٹی اور بڑی بات قلم بند ہے۔ اور جو کچھ انھوں نے (دنیا میں) کیا وہ سب وہاں (لکھا ہوا) موجود پائیں گے۔ اور تمہارا رب کسی پر (ذمہ برابر بھی) ظلم نہیں کرتا۔

اور پھر عالمِ حسرت میں کہہ اٹھیں گے:

يَحْسُرُونَ عَلَىٰ مَا فَزَعَتْ مِنْهُمْ جَنَّتِ اللَّهُ (نمر: ۵۶)

افسوس ان کو تاہوں پر جو ہم نے اللہ کے بارے میں کس (اور آج ان کے نتائج جت رہے ہیں)

نتائج اعمال سے غفلت کے اسباب

اس دنیا میں ایک انسان دو وجودہ سے نتائج اعمال سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ پہلی وجہ یہ نظریہ ہے کہ اس دنیا کے بعد کوئی دنیا نہیں ہے۔ یہ نظریہ بالعموم جدید فلاسفہ اور تعلیم یافتہ طبقے میں ملتا ہے جنہیں ہم اصطلاحاً ملاحدہ کہتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ خیال باطل ہے کہ روزِ آخرت اعمال کے نتائج سے کسی بزرگ، ولی اور پیغمبر کی سنی و سفارش سے بچا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ کے حامی جاہل عوام اور نفس پرست مذہبی پیشوا ہوتے ہیں۔ عقیدہ و عمل کی یہ گمراہی عالم گیر ہے، یہودی، عیسائی اور مسلمان سب اس میں مبتلا ہیں۔ ہم سب سے پہلے الحاد کی ذہنیت رکھنے والے طبقے کے نقطہ نظر کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد دوسرے طبقے کے خیالات کی غلطی کو آیات قرآنی کی روشنی میں واضح کریں گے۔

آخرت کے بارے میں ملحدین کا نقطہ نظر

جو اہل علم صرف مادی زندگی کے قابل ہیں اور اس کے بعد کسی دوسری زندگی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے خیالات کی ترجمانی دورِ جدید کے مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل کی اس تحریر میں ملتی ہے:

”انسان ایسے اسباب و علل کی پیداوار ہے جن کا پہلے سے سوچا سمجھا اور متعین کوئی مقصد نہیں۔ اس کا آغاز اس کا نشوونما، اس کی امتیادیں، اس کے اندیشے، اس کی محبت اور اس کے عقائد سب محض جوہروں کی اتفاق ترتیب کا نتیجہ ہیں، کوئی تخیل، کوئی اولوالعزمی، کوئی عمیق خیال اور احساس آدمی کی زندگی کو قبر کے پرے قائم نہیں رکھ سکتا (یعنی قبر کے بعد کسی دوسری زندگی کا امکان خارج از قیاس ہے) صدیوں کی کوششیں جاں نثاریاں اور ریاضتیں، الہامی تخلیقات اور انسانی ذہانت کی تابناکیاں، یہ سب چیزیں نظام شمسی کی مکمل تباہی کے ساتھ یقینی طور پر فنا ہو جائیں گی،“

اور انسانی کامریوں کا پورا محل ناگزیر طور پر تباہ شدہ کائنات کے مہر کے نیچے دفن ہو کر رہ جائے گا۔ یہ تمام امور اگرچہ اختلاف سے بالاتر نہیں، لیکن پھر بھی یقین سے اتنے قریب ہیں کہ جو فلسفہ بھی ان کا منکر ہو گا وہ دیر پائانت نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے انسانی زندگی کے انجام کے متعلق ایک عظیم فلسفی کا نقطہ نظر۔ اب ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک علمی بات ہے، لیکن ذرا تحقیق سے کام لیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک نہایت ہی لچر بات ہے، یا زیادہ سے زیادہ اسے ایک شاعرانہ تخیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیات ثانی کے متعلق دو جدید کے ارباب علم و خرد کی ساری کاوشیں دور قدیم کے کم علم انسانوں کی فکری کاوشوں سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکی ہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کے بادیہ نشین بھی کہا کرتے تھے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں اور حیات و مرگ کا یہ سلسلہ گردش زمانہ کا نتیجہ ہے، اس کے پیچھے کسی حکیم و عظیم خالق کا دست قدرت کار فرما نہیں ہے۔ قرآن پاک نے ان کے اس خیال کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّاهِيَةُ (جاثیہ: ۲۴)

اور (مشرکین آخرت) کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دنیوی زندگی کے اور کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جہاں ہم مرتے اور جیتتے ہیں، اور صرف گردش زمانہ ہی ہماری موت کا سبب ہے۔

فی الواقع حیات بعد موت کے انکار کا تعلق کسی علمی تحقیق سے نہیں ہے، بلکہ ظن و گمان کی بنیاد پر ایسا کیا جاتا ہے، اور اس کے پس پردہ دراصل انسان کی نفس پرستی کام کرتی ہے، چونکہ زندگی بعد موت کا تصور انسان کی خواہشات نفس کو بے لگام نہیں ہونے دیتا، اور اس کی بے شمار آرزوؤں کی تکمیل میں سدراہ بنتا ہے اس لیے نفس پرست ارباب علم و خرد اس پر یقین نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ جب انسان مٹی میں رل مل جائے گا تو پھر

دوبارہ کس طرح حیات نو کا قالب اختیار کر سکتا ہے، حیات ثانی کے انکار کی یہ دلیل کوئی نئی دلیل نہیں ہے۔ سردیوں میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد نے اسی کچھ فکری کا ثبوت دیا ہے۔ عرب کے کفار و مشرکین بھی اسی دلیل کا سہارا لیتے تھے اور کہتے تھے:

بِشْنَانَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ؕ إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۱۰۳﴾ (دعا: ۱۰۳)

جب ہم جاشیں گے اور مٹی اور ہڈیوں کے سوا کچھ نہ رہ جائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

اثباتِ معاد

حیات بعد موت کا معاملہ اگرچہ اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں اس دنیا میں ناقابلِ تشبیہ و تجزیہ ہے تاہم اس عالم رنگ و بو کے بعض واقعات اور خود انسانی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں جو حیاتِ بعد موت کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی متعدد آیات میں ان واقعات و حقائق کی طرف انسانوں کی توجہ کو مبذول فرمایا ہے۔ ہم انہی واقعات و حقائق کی روشنی میں حیاتِ بعد موت کے اثباتی دلائل کا یہاں ذکر کریں گے تاکہ منکرینِ آخرت کے ذہنی شکوک کا ممکن حد تک ازالہ ہو سکے اور ساتھ ہی اہل ایمان کے قلوب و ذہان الطینان و یقین کی روشنی سے معمور ہو سکیں۔

۱۔ خلقِ اول

حیاتِ بعد موت کے ثبوت میں قرآن مجید کی ایک اہم عقلی دلیل خلقِ اول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس ہستی نے انسان کو پہلی بار پیدا کیا جب کہ وہ عدم محض تھا تو پھر وہی ہستی اسے دوبارہ زندہ اٹھا کھڑ کرے گی جب کہ وہ بیوند خاک ہو چکا ہو گا جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:

قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿۱۰۴﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ

مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿۱۰۵﴾ (یس ۷۹)

(منکرینِ آخرت) کہتے ہیں کہ جب ہم بو سیہ ہڈی ہو جائیں گے تو پھر ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا

عطا کرے گا؟ کہہ دو (اے محمد) کہ وہی ہستی اسے زندگی دے گی جس نے اسے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر ایک (طریقہ) تخلیق کا بخوبی علم رکھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَقَالُوا إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا ؕ إِنَّا لَنَسْبُحُوتُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۗ
قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۖ أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ
مَنْ يُعِينُنَا عَلَيْهِ الَّذِي أُوتِيَ قُطْرًا ۗ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ (نبی اسرائیل ۴۹-۵۱)

اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم گلی مٹری ہڈیاں بوجائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ یا تمہارے نزدیک اس سے بھی بڑی جو چیز ہو وہ تم بن جاؤ، تو وہ تم سے کہیں گے کہ کون ہم کو دوبارہ (پہلی حالت میں) لوٹائے گا۔ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس فعل کا وقوع مخصوص حالات میں ایک بار ہو سکتا ہے اسی فعل کا وقوع انھیں حالات میں دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی برہمی حقیقت ہے جس سے کوئی ہوش مند آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک سنگ تراش اپنے مخصوص علم کی بنا پر ایک سنگی مجسمہ بناتا ہے، کیا وہ دوسرا سنگی مجسمہ نہیں بنا سکتا یا پہلے مجسمہ کو توڑ پھوڑ کر اسی طرح کا دوسرا مجسمہ تیار نہیں کر سکتا، یقیناً کر سکتا ہے، تو پھر کیا خالق کائنات جس کے علم و حکمت اور اعجاز خلق پر اس عالم کا ذرہ ذرہ شاہد ہے، اور انسان جس کی صنعتگری کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے، انسان کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا؟ عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ ایسا باسانی کر سکتا ہے۔ اگر ہم پہلی تخلیق کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر خلق ثانی کو بھی لازماً تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہاں جو لوگ سرے سے خلق اول کے منکر ہیں ان کے پاس انکار کی کوئی علمی و عقلی دلیل نہیں ہے، وہ بس وہم و گمان کے پیرو ہیں، ان کا مبلغ علم بس اتنا ہی ہے کہ جس چیز کو آنکھوں سے دیکھا اسے تسلیم کر لیا اور جسے آنکھوں سے نہ دیکھ سکے اس کے منکر بن گئے گویا کسی چیز کا وجود ان کے مشاہدہ یعنی پر منحصر ہے اور ان کے دائرہ مشاہدہ سے باہر کسی حقیقت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز استدلال مغالطہ آمیز ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہم و

گمان انکار حق کی دلیل نہیں بن سکتا ہے:

وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي
عَنِ الْحَقِّ شَيْئًا ۗ فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ هَذَا عَنِ ذِكْرِنَا وَكَمْ يُرِيدُ إِلَّا
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۗ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (النجم: ۲۰)

انھیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور ظن، حق کا قائم مقام نہیں بن سکتا ہے۔ پس جو شخص ہمارے ذکر سے منہ موڑ لے اس سے تم اعراض کرو۔ وہ صرف حیات دنیوی کے طلب گار ہیں اور ان کا مبلغ علم بس اتنا ہی ہے۔

۲۔ آثار کائنات

حیات بعد موت کے اثبات میں قرآن پاک دوسری اہم دلیل آثار کائنات سے دیتا ہے۔ منکرین آخرت کے انکار کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انسان جب خاک میں مل کر نیست و نابود ہو جانے لگا اور اس کے وجود کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا تو پھر اس کو دوبارہ زندہ کر دینا ناممکن ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ کیا انسان نہیں دیکھتا کہ موسم گرما میں بے آب و گیاہ زمین جس پر کہیں بھی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے، بارش کے ایک ہی چھینٹے سے دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ جس زمین پر ابھی چند منٹ پہلے تک خاک اٹتی تھی وہاں دیکھتے دیکھتے سبز گھاسوں کا خملیں فرش بچھ جاتا ہے، اور خوشنما برے بھرے پودے ہر طرف لبہا ہانے لگتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ جس مردہ زمین میں بظاہر تمام اسباب حیات ناپید تھے اور ہمیں ڈھونڈنے سے بھی کوئی زندہ انسی وجود دیکھتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ بارش کے ساتھ ہی دفعتاً اسی مردہ زمین کے آغوش میں مختلف النوع کیڑے کوڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ حیات بعد موت کا ایک عینی ثبوت نہیں ہے؟ قرآن مجید نے اس اہم حقیقت کی طرف متعدد جگہوں پر اشارے کیے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَاللّٰهُ الَّذِيۡ اَرْسَلَ الرِّيۡحَ فَتُثَبِّتُۡ سَمَآتًا فَتُحْمَلُهُۥ اِلَیۡ بَلَدٍ مَّيۡتٍ
فَاٰخِیۡتٰیۡۤ اِلَیۡهِ الْاَرْضُ کَعَدَمٍ مُّوتۡتٰہَاۗ کَذٰلِکَ النُّشُوۡرُ (فاطر: ۹)

اور وہ اللہ تعالیٰ ہے جو بائبل کو سمجھتا ہے پس وہ بائبل کو اٹھاتی ہیں پھر ہم انہیں مردہ زمین تک ہٹا کر لے جاتے ہیں۔ پس اس کے ذریعہ ہم اس مردہ زمین کو حیات نو عطا کرتے ہیں اسی طرح انسانوں کو بھی ایک دن برائے اللہ ہوگا۔

دوسری جگہ آیات :

فَإِنظُرُوا إِلَىٰ آيَاتِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُخْرِجُ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعَلْفًا لِّمَنْ يَعْقِلُ ۝ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (مردم: ۵۰)

اللہ کے آثار رحمت پر ایک نظر ڈالو۔ وہ مردہ زمین کو کس طرح نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ کونئی شکل نہیں۔ وہی مردوں کو بھی جگانے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۳۔ زوجیت کا مقصدا

اس دلیل کی روشنی میں اگر آپ غور کیجئے تو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کا وجود بالکل یقینی معلوم ہوتا ہے، اتنا یقینی کہ اگر اس زندگی سے اس کے تصور کو نکال دیکھئے تو ہماری موجودہ مادی زندگی کی اشتریح و تعبیر ناممکن ہو جاتی ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اس عالم مادی کی ہر شے زوجین (Pair) کی شکل میں خلق ہوئی ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے :

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ جَعَلْنَا لَكُمْ زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ (ذرات: ۱۴)

اور ہم نے ہر چیز کو جو ملا جوڑا بنایا ہے تاکہ تم ڈر دہانی حاصل کرو۔

دوسری جگہ آیا ہے :

مِنْ خَلْقِ الْأَزْوَاجِ كُلِّهَا مِمَّا تُثْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ

وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ۝ (یسین: ۳۷)

پاک۔ یہ وہ ذات جس نے پیدا کیے ہر قسم کے جوڑے بنا مات زمین کی قسم میں سے اور خود ان کی اپنی قسم میں سے اور ان کی قسم میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

نگاہ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جوڑے کا ہر فرد دوسرے کا مد مقابل ہے لیکن

حیثیت اگیز تو افق و سازگاری سے وہ اپنی تخلیق کے مقاصد و مصالح کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ کائنات کے اندر فیضان و افادیت اور نفع بخشی کا جو حیران پایا جاتا ہے وہ زوجین کے وجود اور ان کے باہمی توافق ہی کا نتیجہ ہے۔ زوجین کے ایک کن کو بھی علیحدہ کر دیجئے تو یہ سلسلہ فیضان و بخشش یک قلم منقطع ہو جائے۔ اس سے معیوم ہوا کہ زوجین کا ہر کن بالذات ناقص اور نامکمل ہوتا ہے اور دوسرے کن کے ساتھ مل کر ہی اپنے خلقی نقص و ناتماہی کی تلافی کرتا ہے اور پھر نافع بنتا ہے۔ مثال کے طور پر رات اور دن کو دیکھئے دونوں ایک دوسرے کی ضد اور مقابلہ وجود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی نفع بخش اور با مقصد بنتا ہے۔ یہی حال مرد اور عورت کا ہے۔ زوجین کا ہر فرد ایک دوسرے سے انتہائی مختلف مگر اپنے وجود کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اس جوڑے کے ایک فرد کو سبھی انگ کر دیں تو دوسرے کا وجود ناقص نامکمل اور بے مقصد بن جاتا ہے۔ یہی حال کائنات کی ہر چیز کا ہے۔ اگر یہ کائناتی حقیقت ہم تسلیم کرتے ہیں تو پھر اس عالم ہادی کے ساتھ ایک دوسری غیر ہادی دنیا کا وجود ناممکن ہے۔ اس دوسری دنیا کو تسلیم کیے بغیر ہماری موجودہ دنیا متعدد پہلوؤں سے ناقص، ناتمام اور بے مقصد نظر آتی ہے۔ مولانا حمید اللہ فراہی لکھتے ہیں:

”جنہوں نے اس دنیا کی ہر چیز کو صرف اس کی الہی حالت میں دیکھا ہے
 دہری حالت میں نہیں دیکھا ہے یعنی ان کی نگاہ جوڑے کے صرف ایک ہی
 فرد پر پڑی ہے۔ دوسرے فرد کو وہ نہیں دیکھ سکے ہیں، ان پر اس کائنات کا
 اصل حسن و جمال بے نقاب نہ ہو سکا اور اس کے سبب سے وہ طرح طرح
 کی غلطیوں میں پڑ گئے جو شخص صرف اس دنیا کو دیکھے گا اور آخرت پر اس کی نگاہ
 نہ پڑے گی اس کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو گا کہ اس دنیا کی خالق کوئی
 ایسی ہستی ہے جو حکیم و رحیم ہے۔ کیونکہ دنیا میں ظلم و معصیت کے جو مشتاک
 مناظر ہیں وہ کسی طرح بھی اس کے دل کو اس بات پر جھنجھنے نہیں دیں گے کہ
 اس دنیا کا خالق حکیم و رحیم ہے۔“ (تقریباً سورہ الشمس ص ۱۷)

۳۔ عدل کامل کا تقاضا

آپ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ایک آدمی تقویٰ و طہارت، دیانت و امانت، راست بلدی و نیکو کاری اور عدالت و شرافت کی زندگی گزارتا ہے مگر اس کا کوئی مصلہ نہیں پایا بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا شخص رنج و کلفت میں مبتلا رہتا ہے، اس کے برخلاف ایک دوسرا آدمی جو زندگی کے ہر معاملے میں ظلم و زیادتی، دجل و فریب اور بددیانتی اور معصیت کوشی کا مظاہرہ کرتا ہے، خوش و خرم اور کامیاب و بامراد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جرائم پیشہ افراد اکثر و بیشتر حالتوں میں اپنے گھناؤنے جرائم کی کوئی سزا نہیں پاتے۔ ایک شخص کسی کو قتل کر دیتا ہے اور قاتل کا سراغ لگانے میں حکومت کی مشینری ناکام رہتی ہے۔ اگر صحت اتفاق سے قاتل گرفتار بھی ہو جاتا ہے تو وہ کبھی اربابِ حل و عقد کو رشوت دے کر اور کبھی واقعہ قتل کے عینی شاہدوں کو ڈرا دھکا کر قتل کے سنگین نتائج سے صاف بچ نکلتا ہے اور اگر کبھی اسے قید و بند کی سزا ملی بھی تو یہی پانچ دس سال کے لیے قتل جیسے سنگین جرم کی یہ سزا بالکل ناکافی ہے یہی حال دوسرے جرائم کا ہے۔

اس کے علاوہ اس دنیا میں کسی بھی جرم کی مکمل سزا ملنی ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر کسی آدمی نے دس آدمیوں کو قتل کر دیا آپ اس کے عوض میں اس کو جو سب سے زیادہ سزا دے سکتے ہیں وہ یہی کہ اس کو بھی قتل کر دیں، لیکن کیا یہ دس آدمیوں کے قتل کی سزا ہوگی؟ یہ تو صرف ایک آدمی کے قتل کی سزا ہوئی، باقی نو آدمیوں کے قتل کی سزا اسے کہاں ملی۔ اس کو جرم کی پوری سزا اسی وقت ملتی جب وہ بھی دس مرتبہ قتل کیا جاتا، اور یہ اس دنیا میں ناممکن ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا کا نظام عدالت، منصف اور حاکم سب ناقص ہیں اور اس ناقص نظام کے تحت حقیقی انصاف کے تقاضے کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ اس عدل ناقص اور انسانی فطرت میں عدل کامل کی طلب صادق کے پیش نظر عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس دنیا کے علاوہ ایک دوسری دنیا بھی ہو جہاں کی عدالت کامل میں مظلوم کی دادرسی ہو اور ظالم کیفر کر دیا کو پہنچیں، بد اطوار اپنی بد اطواری کی سزا پائیں اور نیک اطوار اپنی نیک اطواری کا صلہ

پائیں۔ اگر آپ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر یہ بھی تسلیم کریں کہ اس موجودہ دنیا میں نہ کبھی ظالم اور بدکردار کا سر نیچا ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی مظلوم کی دادی اور نیکو کار انسان کی اشک ثنویٰ ممکن ہے۔

عقل انسانی ایک لمحہ کے لیے بھی اس صورت حال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ فی الواقع تحقیق کا نجات کی حقیقی توجیہ اور عدل کامل کا نظہور اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم حیات بعد موت کے تصور کو قبول کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
بِالْقِسْطِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا
كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴۰﴾ (سورہ یونس: ۴۰)

بیشک وہی (اللہ) خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر وہی (ایک دن) اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ (اس دنیا میں) ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے، ان کو انصاف کے ساتھ پورا پورا بدلہ دے اور جن لوگوں نے کفر کیا انھیں ان کے کفر کے بدلہ میں کھوتا پورا پانی پینے کے لیے ملے گا اور دوسرے دردناک عذاب بھی۔

۵۔ عقیدہ آخرت ایک اخلاقی و سماجی ضرورت

عقیدہ آخرت صرف ایک عقیدہ ہی نہیں ہے، یہ ہماری ایک ناگزیر اخلاقی اور سماجی ضرورت بھی ہے۔ ایک ایسی سماجی ضرورت کہ اس کے بغیر نہ تو انسانی سماج کو پائیدار اور مستحکم بنیادیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی سماجی نظام بہت دنوں تک انتشار سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ انسان مختلف النوع داعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعض داعیات منفی اور بعض مثبت نوعیت کے ہیں۔ منفی داعیات کو کنٹرول کرنے کے لیے عقیدہ آخرت سے زیادہ موثر اور کارگر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ آج عقیدہ آخرت کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان کے منفی داعیات کو کھلی جھپٹی مل گئی ہے۔ چوری، زہرنی، عصمت دری، شراب نوشی، کذب و افتراء، مکر و فریب اور ساج کے کز و طبقات پر ظلم و ستم آئے دن کا معمول بن گیا ہے۔ ان جرائم کی رفتار جس تیزی

کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین اس کے منفی داعیات کو کنٹرول کرنے میں بالکل ناکام ہو چکے ہیں۔ لاکیشن کے چیرمین ایچ آر کھننا نے غنی گریجویٹ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ قانون کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

”کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم نے قانون کی حکم رانی کی جگہ آدمیوں کی حکم رانی قبول کر لی ہے۔ لیکن جو نبی انسانی فطرت کے سنگین حقائق نے دنیٰ کی خود غرضی، انانیت اور اس مقولے کی صداقت کو طشت از بام کر دیا کہ اقتدار اور باختصاص اقتدار مطلق انسان کو بد عنوان بنا دیتا ہے، ہم اسی وقت پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار اور باخبر ہو کر قانون کی حکم رانی کی طرف دوہرہ دہشت آنے لگے۔“

قانون کی حکم رانی ہو یا آدمیوں کی حکم رانی، اب تک کا تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ دونوں ہی انسان کے منفی داعیات (Negative Instincts) کو کنٹرول کرنے میں غیر موثر ثابت ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین خواہ کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں لیکن یہ اسی وقت موثر ہو سکتے ہیں جب ان کی تنفیذ کرنے والے افراد خود اپنے منفی داعیات پر قابو پا لیتے ہوں اور انسان کے منفی داعیات کو جو چیز قابو میں رکھ سکتی ہے وہ صرف روزِ آخرت محاسبہ اعمال اور اس کی جزا و سزا کا یقین ہے۔

یہ صورتِ حال اس بات کی دلیل ہے کہ عقیدہٴ آخرت انسان کی ایک نگہریہ اخلاقی اور سماجی ندرت ہے اور اس سے صرف نظر کر کے اس دنیا میں ایک صالح معاشرہ اور عادلانہ نظام حیات کا قیام ناممکن ہے۔

۶۔ ضمیر کا وجود

انسان کو برائیوں سے روکنے میں ضمیر انسانی کی بے غرضانہ خدمات سے کون انکار

کر سکتا ہے۔ ضمیر کا وجود بذات خود حیات بعد موت کا ایک اہم ثبوت ہے۔ اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا نہیں ہے تو پھر ضمیر انسانی کا امر و نہی کیا معنی رکھتا ہے، اور کیوں یہ انسانی زندگی کا ایک جز و لازم بن کر رہ گیا ہے کہ کسی حالت میں بھی انسان اس سے گلوغلائی حاصل نہیں کر سکتا۔ آدمی جلوت میں ہو یا خلوت میں، شب کے اندھیرے میں ہو یا دن کے اجالے میں، ویران چٹیل میدان میں ہو یا کسی آبادستی میں، خشکی پر ہو یا سمندر کی پشت پر، ہر حال میں وہ اس کو برائی سے روکتا اور اچھائی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس ناصح مشفق کا وجود بتاتا ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کا وجود بھی ضرور ہے جہاں انسان اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا پائے گا۔ اگر کسی فعل کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو پھر خیر و شر کی فعلی تقسیم اپنے اندر کوئی مننویت نہیں رکھتی، اور پھر انسان کے اندر نفس تو امہ کا وجود بے مقصد بن کر رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت میں نفس تو امہ کا وجود حیات بعد موت کی ایک مضبوط دلیل ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

لَا أَقْسِمُ بِبَوَاقِ الْغَيْثِ ۖ وَلَا أَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۗ أَيَسْبَبُ
الْإِنْسَانَ أَنْ تُتَمَّعَ عِظَامُهُ ۗ بَلَىٰ قَدِيرِينَ عَلَيَّ أَنْ تُسَوَّىٰ بَنَانُهُ ۗ

(قیامہ: ۳)

نہیں، میں روز قیامت اور نفس تو امہ کی قسم کھاتا ہوں (کہ منکرین آخرت اپنے دعویٰ میں سچے نہیں ہیں) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ یقیناً ہم ایسا کر سکتے ہیں ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کا پور پور بالکل درست حالت میں کر دیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ضمیر انسانی کوئی مستقل اور دائم بالذات چیز نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں اور ملکوں میں اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک ہی فعل کو ایک ملک کا آدمی برا سمجھتا ہے اور دوسرے ملک کا آدمی اسے اچھا سمجھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ضمیر کا وجود سماجی حالات کی پیداوار ہے۔ ہر سماج خود اپنا ایک معیار خیر و شر بنا لیتا ہے اور امتداد زمانہ کے ساتھ وہ انسانی فطرت کا ایک جزو بن جاتا ہے۔

یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ انسانی ضمیر بعض حالات میں خارجی دباؤ کے تحت

دب جاتا ہے اور اپنے فرض منصبی سے عارضی طور پر سبکدوش ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نفس لوآمرہ سکوت اختیار کر لیتا ہے اور نفس آمارہ کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اور ہم نفس آمارہ کے اسی غلبہ کو غلطی سے تائید ضمیر کا نام دے لیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ضمیر مردہ ہو جاتا ہے یا وہ نفس آمارہ کا قالب اختیار کر لیتا ہے، وہ ہر حالت میں زندہ رہتا ہے خواہ اس کی یہ زندگی عارضی طور پر محسوس نہ ہو۔ لیکن ہر قوم پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور معیار خیر و شر بھر وہی قائم ہو جاتا ہے جو ازل سے انسانی فطرت کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔

آج سے دو ہزار سال پہلے یعنی سقراط کے زمانہ میں بھی لوگ علانیہ کہنے لگے تھے کہ نیکی اور بدی اضافی چیزیں ہیں اور کسی فعل کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ ضمیر کے تغیر پذیر قانون سے نہیں ہوتا بلکہ اس فعل کی کامیابی سے ہوتا ہے۔ سقراط نے کمال جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ نیکی و بدی کا یہ تصور سراسر غلط ہے اس نے کہا:

”نیکی و بدی کا معیار انسانی ضمیر ہے۔ یہ ضمیر بعض حالات میں جو بدل جاتا ہے تو اس کا یہ بدلتا بالکل ظاہری ہے، اور کسی دباؤ یا جبر کا نتیجہ ہوتا ہے“

۷۔ دائمی مسرت کی فطری طلب

دنیا کا کون انسان ایسا ہے جو سکون و اطمینان کا طالب اور رنج و غم سے نجات کا خواہاں نہ ہو، لیکن آج کا انسان اپنی ہر ممکن سعی و جان فشانی کے باوجود دائمی سکون و اطمینان سے محروم ہے، اور رنج و آلام کل کی طرح آج بھی اس کے لیے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی اکثریت سکون کی دولت سے تہی دامن ہے، اور جن کو قدرے سکون و اطمینان حاصل بھی ہے وہ بالکل عارضی ہے۔ ایک شخص سخت جدوجہد کے بعد جب ایک پرسکون زندگی کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اس کی آسائشوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے تو کبھی اچانک موت

اس کی مسرتوں کی بساط الٹ دیتی ہے اور کبھی بیماری اور عالم پیری جو خود ایک عذاب ہے اس کی زندگی کو دردناک بنا دیتا ہے۔ غرض یہ کہ اس دنیا میں راحت و سکون کے لمحات بہت مختصر اور حزن و طلال کا دور نہایت طویل ہوتا ہے۔

اس غم کا صرف ایک ہی مداوا ہے کہ ہم اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کے وجود کو تسلیم کر لیں جہاں حزن و خوف اور رنج و الم کا کوئی نام و نشان بھی نہ ہوگا اور انسان کو مسرت ابدی اور حیات جاوداں حاصل ہوگی جیسا کہ اس کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ۝

الَّذِينَ أَحْلَنَّا دَارَ الْمَقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا

يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ﴿۵۰﴾ (فاطر: ۴۰-۴۳)

اور وہ کہیں گے: اللہ لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے رنج و غم دور کیا۔ بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا اور بڑا قدر داں ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے دار ابدی میں لانا جہاں نہ تو ہم کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی (کسی کام کی وجہ سے) کوئی سستی و خمستگی لاحق ہوگی۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَرَفِيهَا مَا كُنْتَ تَهْتَبُهَا الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۚ وَأَنْتُمْ فِيهَا أَخْلَدُونَ ﴿۵۱﴾

(زخرف: ۵۱)

اور وہاں ہر وہ چیز ہے جس کو جی چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت حاصل ہوگی اور تم اس میں (جنت) ہمیشہ رہو گے۔

عقیدہ آخرت سے متعلق ہم نے سطور بالا میں مختلف عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ عقیدہ آخرت زندگی کا ایک روحانی تصور دیتا ہے یعنی اس تصور کے مطابق موت کے عمل سے انسانی زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک دوسری شکل میں اس کا سفر ارتقا جاری رہتا ہے فی الواقع موت، مادی اور روحانی زندگی کے درمیان ایک حد فاصل کی حیثیت رکھتی ہے، ادھر آدمی نے آنکھیں بند کیں اور ادھر وہ مادی زندگی کی سرحد سے نکل کر روحانی زندگی کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس انتقال مکانی میں صرف ظاہری ہیئت میں تبدیلی

ہوتی ہے، اصل حقیقت یعنی روح میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

یہ تصور زندگی لازماً اس خوف اور یاس و افسردگی کو ختم کرتا ہے جو موت کے تصور سے ایک انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ تصور زندگی کہ اس مادّی زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے آدمی کو ہمہ آن خوف اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ حیات بعد موت کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے لیے حیات دنیوی کے خاتمہ کا تصور سوہان روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جو لوگ حیاتِ آخری پر یقین رکھتے ہیں وہ شمعِ زندگی کے گل ہو جانے سے کبھی ہراساں نہیں ہوتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی کا اختتام نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ ان کے نزدیک موت ایک درمندانہ راہِ رو کی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا ہے اور پھر بیدار ہو کر سرگرم سفر ہو جاتا ہے، میر نے کیا خوب کہا ہے

موت اک ماندگی کا وقف ہے

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

آپ زندگی کے متعلق ان دونوں تصورات پر غور کیجئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کون سا تصور زندگی صحیح ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ آخرت انسان کو یاس و قنوطیت اور حزن و خوف کے اندھیروں سے نکال کر اطمینان و سکون کی روشنی عطا کرتا ہے، حیات دنیوی کو بامعنی و باعتماد بناتا ہے، اور اس کے نقص و ناامنی کی تلافی کرتا ہے۔

عقیدہ آخرت کے متعلق بعض غلط فہمیاں اور ان کا ازالہ

آج مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو عقیدہ آخرت پر یقین تو رکھتے ہیں لیکن وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا کر دیے گئے ہیں کہ نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور بزرگانِ دین کے صدقے میں وہ جنت میں ضرور جائیں گے خواہ ان کے اعمال اچھے ہوں یا برے گویا وہ آخرت جزا و سزا کا فیصلہ اعمال کی اجماعی اور خرابی کے بجائے تعلق اور سفارش پر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور سرے سے عقیدہ آخرت کی ضرورت ہی کو باطل کر دیتا ہے۔ آخرت پر ایمان رکھنے کا

مقصد تو یہ ہے کہ ایمان رکھنے والا بر عمل سے پہلے سوچ لے کہ اسے ایک دن اپنے مالک و آقا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اگر اچھا عمل کرے گا تو مالک خوش ہو کر دنیا و آخرت میں سے سزا دے گا اور اگر غلط کام کرے گا تو مالک ناراض ہو کر پاداشِ عذاب میں سزا دے گا۔ اب اگر کسی کی سعی و سفارش سے غلط نفع بن جائے اور عمل کرنے والا اپنے عمل کے اثرات و نتائج سے بچ جائے تو پھر ایک دوسری زندگی کا تصور بالکل مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ بجا ایسی حیات نہیں کیا، مقبولیت ہو سکتی ہے جس میں نیکی اور بدی دونوں ہم پتہ ہوں اور جہاں معاملات نے فیصلے عدل و انصاف کے بجائے سعی و سفارش کی بنیاد پر کیے جاتے ہوں۔

کیا ہم نے خدا کی عدالت کو انسانی عدالت سے بھی کم تر درجہ کی چیز سمجھ لیا ہے؟ ہم اس دنیا میں اسی حکم اور عدالت کو پسندیدہ اور معیاری عدالت سمجھتے ہیں جہاں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو اور اس حکم و عدالت کو ناپسندیدہ اور ناقص سمجھتے ہیں جہاں عدل و قسط کو بانٹنے لائق رکھ کر صرف رشوت اور سفارش کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس دنیا کے منصف اور اس کی عدالتوں کے پاس سے ہمارا یہ تصور آخری عدالت اور اس کے منصف کے متعلق کیسے تبدیل کیوں ہو جاتا ہے؟ ایسا ایسی عدالت جس سے زیادہ عظیم عدالت اور کیا ایسا منصف جس سے زیادہ عادل و منصف کا ہم تصور نہیں کر سکتے کیا اس عادل و منصف کی عدالت میں کوئی شخص ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ کسی کی سفارش سے برے افعال کی سزا سے بچ سکتا ہے؟ قرآن مجید نے اس سلسلے میں کسی ادنیٰ اشتیاق کی بھی گنجائش نہیں چھوٹی ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں خبردار کر دیا ہے کہ روزِ آخرت ہر شخص اپنے تمام اعمال سے لازمہ دوچار ہوگا۔ خدا جس سستی کا نام ہے وہ سہا یا عدل ہے۔ اس کے یہاں نیکی بہر حال نیکی ہے اور بدی بہر حال بدی ہے جو یہاں نیک ہوگا وہ وہاں بھی نیک سمجھا جائے گا اور ایشی نیکی کی جزا ضرور پائے گا اور جو یہاں بد ہوگا وہ وہاں بھی بدی سمجھا جائے گا اور اپنی بد اعمالیوں کی سزا پانچ کرے گا جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّ الْآبِرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۚ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۗ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ

الَّذِينَ ۖ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۖ (الفرقان: ۱۳-۱۴)

بے شک نیکو لوگ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے اور بدکار لوگ شہلازن جہنم میں، جہاں

وہ جزا کے دن داخل ہوں گے اور وہاں سے کسی طرح فرار حاصل نہ کر سکیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

فَاَتَا مَنْ طَغَىٰ ۖ وَآثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۗ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاوِي ۗ وَامَّا مَنْ
خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۗ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاوِي ۗ ﴿۱۰۷﴾
پس جس نے سرکشی کی اور (آخرت پر) حیاتِ دنیوی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو شخص
اپنے رب کے حضور جوب دہی سے ڈرا اور نفس کو ہوانے نفسانی سے بچانے لگا، اس کا ٹھکانا
جنت ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ روزِ آخرت خدا ترس اور غیر خدا ترس انسانوں کے نتائج
اعمال کیساں نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ عدل و انصاف کے منافی ہے۔ عقلِ انسانی ایک ثنائیہ کے لیے
بھی یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اچھے اور برے اعمال کے نتائج کیساں ہو سکتے ہیں۔ نور و ظلمت اور جزات
و برو دت کو کیساں کون کہہ سکتا ہے؟ قرآن پاک کی یہ آیت اسی حقیقت کی ترجمان ہے:

اَفَنَجْعَلُ السُّلَيْمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۗ مَا لَكُم مِّنْ عِلْمٍ ۙ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۙ

کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کے مساوی کر دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

جو شخص عقیدہٴ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ یہ بھی تسلیم کرے کہ:

۱۔ روزِ قیامت، عادل مطلق یعنی خدا نے علیم و خیر کی عدالت میں کسی استثناء کے بغیر

ہر شخص کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ کوئی شخص خواہ وہ دنیا میں کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ رہا ہو، اعمال
کی باز پرس سے بچ نہیں سکے گا۔

۲۔ ہر شخص اپنے نتائجِ اعمال کا لازماً ذمہ دار ہوگا یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ اس دنیا میں عملِ نیک

برائے لیکن روزِ قیامت اس کا نتیجہ اچھا نکل آئے۔ جو لوگ جو جوی کاٹے گا۔ گیہوں نہیں

کاٹے گا۔ اس لیے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی ذریعہ سے اعمال کے نتائج سے فرار

حاصل کر سکتا ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ قرآن کا واضح اعلان ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ﴿۱۰۸﴾ (مثر: ۷۸)

ہر نفس اپنے اعمال کے نتائج میں مبوس ہوگا۔

۳۔ روزِ آخرت کامیابی اور ناکامی کا تمام تر مدار ایمان اور حسن عمل پر ہوگا۔ اس دن کسی کی دوستی اور قربت داری کسی کے کام نہ آئے گی خواہ وہ کتنا ہی بڑا رہنما، مذہبی پیشوا اور پیغمبر کیوں نہ ہو۔ اس دن فیصلے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہوگا۔ اس سلسلے میں کوئی شخص ادنیٰ مداخلت کا بھی مجاز نہ ہوگا۔ روزِ جزا کی اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک جگہ نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، اور یہ آیت روزِ جزا کے متعلق تمام غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیتی ہے:

وَمَا أَذْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۚ ثُمَّ مَا أَذْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۗ يَوْمَ لَا تَمَلِكُ

نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۗ وَالْآخِرُ يَوْمَئِذٍ أَيْتُهُ ۗ (الغطار: ۱۷-۱۹)

تمہیں کیا معلوم کر روزِ جزا کیا ہے؟ ہاں تمہیں کیا معلوم کر روزِ جزا کیا ہے؟ روزِ جزا وہ ہے کہ جس دن کوئی آدمی کسی آدمی کے کچھ کام نہ آسکے گا، اور جس دن فیصلہ کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہوگا۔

۴۔ اس دن اللہ کے سوا اصلاً نہ کوئی کسی کا شفیع ہوگا اور نہ حامی و مددگار۔ بخشش و عذاب کے سارے اختیارات صرف خدا کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اس لیے بخشش و مغفرت کی امید صرف اسی کی ذات سے رکھنی چاہئے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کو شفیع و پشیمان بھنا عقیدہ آخرت اور آیات قرآنی دونوں سے انحراف کرنا ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں شفاعت بے قید کی نفی کی گئی ہے اور صرف خدا ہی کو شفیع قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آیا ہے:-

مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِهِ مِنْ وَّعِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۗ

(سجده: ۳۰)

اس کے سوا نہ کوئی تمہارا کارساز ہے اور نہ شفیع پھر کیا تم تجھے نہیں ہو؟

دوسری جگہ آیا ہے:

أَمَّا تَعَذُّوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُعَعًا ۗ قُلْ أَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا

يَعْقِلُونَ ۗ قُلْ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمُذَكِّبِكُمْ تَعْبَدُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (زمر: ۲۳، ۲۴)

کیا انہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو شفیع قرار دے رکھا ہے؟ خواہ وہ کوئی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی علم و قتل سے بہرہ ور ہوں۔ کہہ دو کہ شفاعت کا سررشتہ تو محض اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اسی کی ہے۔ تم (ایک دن) اسی کے پاس پلٹ کر جاؤ گے ایک اور جگہ آیا ہے:

وَأَنْذِرْ نِبِیِّ الدِّیْنِ یَعَاذُونَ أَنْ یُخْشِعُوا إِلَیْهِمْ کَیْسَ لَیْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ دِیْنٌ وَلَا شَفِیعَ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُونَ ﴿۵۱﴾ (انعام: ۵۱)

اور اس سے ان لوگوں کو ڈراؤ جو اس بات کا خوف رکھتے ہوں کہ وہ (ایک دن) اپنے رب کے حضور حاضر کیے جائیں گے جہاں اس کے سوا ان کا کوئی حامی اور شفیع نہ ہوگا، شاید وہ (اپنی موجودہ روش سے) باز آجائیں۔

۵۔ روزِ آخرت کسی قسم کا کوئی فدیہ بھی قبول نہ کیا جائے گا یعنی وہاں دنیاوی عدالتوں کی طرح رشوت نہیں چلے گی کہ کچھ دے دلا کر سزا سے چھٹکارا مل جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عَنْ نَفْسٍ شَیْئًا وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا یُخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ یُنصَرُونَ ﴿۲۸﴾ (بقرہ: ۲۸)

دُرو اس دن سے کہ جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا، نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ (ربانی کے لیے) کوئی فدیہ ہی قبول کیا جائے گا اور نہ ان کو کہیں سے کوئی مدد ہی مل سکے گی۔

۶۔ اس دن خدا کی عدالت میں خدا کے اذن کے بغیر کسی کو لب کشائی کی اجازت نہ ہوگی اور جس کو بولنے کی اجازت ملے گی وہ صرف اسی شخص کے متعلق کچھ کہہ سکے گا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کچھ سننا پسند فرمائے گا۔ اس کے علاوہ جو بات حق ہوگی اور جس کے متعلق اس کو واضح علم ہوگا، وہی بات کہے گا، بے جا سفارش اور خلاف حق و کالت اور انکل سے کچھ کہنے کی وہاں قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔ اس لیے کہ وہ عدالت اس علیم و خبیرِ ربی کی عدالت ہوگی جس کی نگاہ سے ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی بھی واقعہ پوشیدہ نہ ہوگا اور ہر آدمی کی اگلی اور پچھلی زندگی کے ایک ایک فعل کا مکمل ریکارڈ تیار ضروری شہادتوں کے ساتھ

وہاں موجود ہوگا۔ شفاعت کی اس حقیقت کو قرآن پاک نے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے
مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۝

(طہ: ۱۰)

اس دن (کسی کوئی بھی) سفارش نفع نہ دے گی بجز اس شخص کے جس کے واسطے اللہ نے

اجازت دے دی ہو، اور جس کی بات سننے پر وہ راضی ہو گیا ہو وہ ان کے اگھے اور پچھے سب

احوال کو جانتا ہے جب کہ دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَا يَنْفَعُكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ شَهِدَ

بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (زمر: ۸۶)

اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے، البتہ کہ

کوئی شخص علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ حَتَّىٰ إِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ

قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا الْحَقُّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝ (سبا: ۲۳)

اور (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی، بجز اس شخص کے جس کے بارے میں وہ (اضمن)

اجازت دے دے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ باہم

پوچھیں گے "تمہارے رب نے کیا فیصلہ صادر فرمایا؟" وہ کہیں گے کہ وہی جو حق بات ہے،

و وہ بلند و بالا ذات ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ روز قیامت کسی کی سفارش ناحق کو حق اور حق کو ناحق

نہیں بنا دے گی۔ شفاعت کے جواب میں اللہ وہی بات کہے گا جو حق ہوگی کہ اس کی بزرگی

اور کبریائی اور عدل و قسط کا یہی تقاضا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ مانہ میں اللہ تعالیٰ

نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفاعت کے جواب میں فرمائی ہے۔ روز قیامت حضرت

عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے بارے میں فرمائیں گے :

إِنْ تَعَذَّبْتُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ؛ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ . (آئہ : ۱۱۸)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر انہیں معاف کر دے تو تو طاقت ور قدرت اور حکمت والا ہے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ . لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ . ذَلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيمُ @ (آئہ : ۱۱۹)

آج کے دن تو راست بازوں کو صرف ان کی راست بازی ہی نفع دے گی۔ ان کے لیے
باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے
راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ عظیم کامیابی ہوگی۔

شفاعت انبیاء کی بس یہی حقیقت ہے، اس سے زیادہ کچھ سمجھنا قرآنی تعلیمات کے بالکل
خلاف ہے۔ جو لوگ شفاعت انبیاء کے نام پر خوش گمانی میں، اور نتیجے کے طور پر بد اعمالیوں میں
مبتلا ہیں، وہ دراصل فریب نفس کا شکار ہیں کسی ولی اور بزرگ کو پھوٹے خود آخری پیغمبر حضرت
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی ذات گرامی سے مسلمان بے قید اور عام شفاعت کی امید
لگائے بیٹھا ہے، قریش اور اپنے اہل خاندان سے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کی آنکھیں کھول دینے
کے لیے کافی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب آیت انذس عشیرتک الاقربین
نازل ہوئی تو آپ نے قریش کے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا :-

”اے گروہ قریش، تم اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ کیوں کہ میں تم لوگوں
کے لیے اللہ کی طرف سے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں، اے نبی تھی
کے گروہ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ کیوں کہ میں تمہارے نفع اور نقصان
کا مالک نہیں، اے نبی عبدمناف کے گروہ! تم اپنے آپ کو دوزخ سے

بچاؤ کیوں کریں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں، اسے بنی عبدالمطلب کے گروہ اہم بھی اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ کیونکہ میں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں، اسے محمد کی بیٹی فاطمہ! تم اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ کیوں کریں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں، بے شک مجھ سے تمہاری قربت ہے اور میں عنقریب اس کا حق ادا کر دوں گا۔^۱

روزِ آخرت اللہ کی عدالت میں انبیاء و رسل کو شفاعت کا موقع صرف اس لیے ملے گا کہ وہ اپنی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ وکیل ہیں۔ اس لیے بندوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو بحیثیت وکیل کے کچھ کہنے کا موقع دیا جائے گا لیکن وہ اس منصف حقیقی کی عدالت میں جو بر صبح اور غلط امر سے بذات خود واقف ہوگا، اس کے سوا اور کیا کہیں گے:

إِنْ تَعْلَمُونَ أَنَّكُمْ عِبَادُ اللَّهِ فَإِنَّ أَنْتُمْ لَتَفْخِرُونَ بِمَا كَفَرْتُمْ وَ أَنْتُمْ لَتَكْفُرُونَ
 الْحٰكِمِينَ ۝ (مائدہ: ۱۱۸)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے۔
 اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ وہی بات ارشاد فرمائے گا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں یعنی
 هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صَدَقَتُهُمْ (آج کے دن تو راست بازوں کو صرف ان کی راست بازی نفع دے گی)

قرآن میں بعض مقامات پر جس خصوصی شفاعت کا ذکر ملتا ہے اس کے مستحق صرف وہ بندے ہوں گے جو دنیا میں ظلم و سرکشی کے بجائے حتی الوسع اطاعت کی راہ میں گام زن رہے ہوں گے، لیکن بقاضیٰ بشریت ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہو گئے ہوں گے، اور دنیا میں وہ ان گناہوں پر توبہ و استغفار اور اصلاح حال کی سعی بھی کرتے رہے ہوں گے۔ ایسے بندوں پر خدا یقیناً مہربان ہوگا، اور انبیاء و رسل کو بھی ان کے متعلق کچھ کہنے کی اجازت مرحمت فرمائے گا۔ قرآن پاک میں ایک جگہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لہٰ ترمذی، الباب تفسیر القرآن جلد دوم۔ رولہ من الی ہرعة۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ
الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ﴿۷۳﴾ (نہا: ۷۳)

اور اگر جس وقت وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے اس وقت وہ تمہارے پاس آجاتے پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو ضرور وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

وَأَيُّ لَعْنَةٍ لَمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ ﴿۸۷﴾ (طہ: ۸۷)

میں ہر اس شخص کے لیے عطا ہوں جس نے (گزشتہ افعال سے) توبہ کی اور جو ایمان لایا اور

جس نے اچھے کام کیے پھر وہ راہ ہدایت پر چلتا رہا۔

قرآن مجید نے یہ بات نہایت واضح لفظوں میں بیان کر ڈی ہے کہ روزِ آخرت نہ تو فاسقوں (نافرمانوں) مجرموں، مشرکوں اور کافروں کی کوئی شخص شفاعت کرے گا، اور نہ اللہ کی رحمت و مغفرت ہی ان کے حصہ میں آئے گی جیسا کہ ایک جگہ آیا ہے:

مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴿۱۸﴾ (مومن: ۱۸)

ظالموں کے لیے نہ کوئی حامی و مددگار ہوگا، اور نہ کوئی ایسا سفارش کرنے والا کہ اس کی بات ان ہی جاتی ہے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ﴿۱۰﴾ وَكَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنَ

شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءَ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ ﴿۱۳﴾ (ہود: ۱۳)

اور جس دن وہ گھڑی آئے گی، مجرمین متحیر، مملکین اور بالوسی کا لشکارہ ہوں گے، اور وہ جن جن لوگوں کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، ان میں سے کوئی ان کی سفارش کے لیے آگے نہ بڑھے گا اور وہ بھی اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ

مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ - ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ
 وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿۱۰۰﴾ (توبہ: ۱۰۰)
 تم ان کے لیے نواہ معافی چاہو اور نواہ نہ چاہو تم اگر ان کے لیے سزا ہی معافی چاہو گے تو بھی
 اللہ نہیں معاف کرے گا۔ اور یہ اس بنا پر کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور
 اللہ انہیں قوم کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا
 أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۱﴾ (توبہ: ۱۱۱)

نبی اور اس ایمان کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے معافی کے خواستگار ہوں خواہ وہ قریب دار
 نبی زوال ہوں بالخصوص اس وقت جب کہ انہیں واضح طور پر جہنم پہنچا ہے کہ وہ دوزخی ہیں۔

آخری دو آیتوں میں خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ آپ سے سنا ہے
 اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ اس کے یہاں کسی کافر و مشرک اور ظالم و سرکش کی شفاعت کی
 گنجائش نہیں ہے اور ایک نبی کے مقام و منصب سے یہ بات فروتر ہے کہ وہ ایسے لوگوں
 کی شفاعت کا خیال بھی اپنے دل میں لائے۔

جو شخص بھی عقیدہ آخرت کو مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ مذکورہ چھ باتوں کو بھی
 دل سے تسلیم کرے کی عقیدہ آخرت کا صحیح طور سے ماننا انہی چھ باتوں کے ماننے پر مشتمل
 ہے۔ جو ان کو تسلیم نہیں کرتا وہ فی الواقع روز آخرت کے قرآنی قصور پر یقین ہی نہیں رکھتا۔
 آج ہمارے اعلان کی خرابیوں کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے عقیدہ آخرت کے
 ایک ایسے تصور کو قبول کر لیا ہے جو سراسر غیر قرآنی ہے، اور اس سلسلے میں اسی کی فہمی
 نبیوشن اندیشی اور فریب نفس میں مبتلا ہیں جس میں ایک مدت دراز سے یہود و نصاریٰ مبتلا
 چلے آ رہے ہیں۔ قرآن مجید کے بتوتے ہوئے مسلمانوں کے سوا اعظم کا موجودہ طرز فکر و فہم
 بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اجتناب جسمانی امراض کی طرح روحانی
 امراض بھی موارث ہوتے ہیں۔ اُمت مسند کے تمام روحانی امراض اسی توارث کی نشاندہی

کرتے ہیں۔

حقیقتِ اسلام

ایمان کے لغوی، قرآنی اور شرعی مفہوم سے واقفیت کے بعد ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے معنی و مفہوم سے بھی واقف ہو جائیں تاکہ فکر و عمل کا کوئی گوشہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ رہے اور اسلامی نظام فکر کے ساتھ اس کے نظام عمل سے بھی بخوبی آگاہ ہو جائیں، نیز یہ بھی جان لیں کہ ان دونوں نظاموں یعنی ایمان و اسلام میں ربط کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ دونوں دو جدا چیزیں ہیں یا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو (Aspects) ہیں۔

اسلام کا لغوی مفہوم

اسلام کے لغوی معنی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے تقریباً ہر جگہ اس کے معنی اطاعت و انقیاد ہی کے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ (لقمہ: ۱۲۸)

اے پروردگار! آپ ہمیں اپنا مطیع بنا لیجئے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۱﴾ (لقمہ: ۱۳۱)

جب اس کے رب نے کہا کہ مطیع ہو جاؤ تو اس نے کہا میں دونوں جہاں کے پروردگار کا مطیع و

فرماں بردار ہو گیا:

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَلَا أَسْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِيَّاهُ

يُزَجِّعُونَ ﴿۸۳﴾ (آل عمران: ۸۳)

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ سب خوشی یا ناخوشی سے اس کی فرماں برداری کر رہا ہے

اور سب کو اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

سورہ نمل میں یہ لفظ متعدد بار آیا ہے اور ہر جگہ اس کا مفہوم اطاعت ہے مثلاً:

لَا تَعْلَوْا عَلَىٰ وَآتُونِي مَسْلِينًا ﴿۳۱﴾ (نمل: ۳۱)

میرے مقابل میں بڑائی نہ جتاؤ اور سیدھے طور پر میرے پاس مطیع و متقاد بن کر حاضر ہو جاؤ۔

قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُوا أَيُّكُمْ يَا تَبِيئِي بِعَدْوِيهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي

مَسْلِينًا ﴿۳۸﴾ (نمل: ۳۸)

اس نے کہا: اے سردارو! قبل اس کے کہ وہ میرے حضور مطیع ہو کر آئے، تم میں کون ایسا ہے جو اس کے تحت کو میرے پاس اٹھالائے۔

وَأَوْتَيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِينًا ﴿۴۲﴾ (نمل: ۴۲)

ہم اس سے پہلے ہی حقیقت حال سے اجزا اور مطیع ہو چکے تھے۔

قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ

الْعَالَمِينَ ﴿۴۴﴾ (نمل: ۴۴)

اس نے کہا: اے میرے رب میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا ہے اور (اب) سلیمان کے ساتھ

اللہ، دونوں جہان کے پروردگار کے سامنے سراطعت سمجھا دیا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے

غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ساری کائنات ایک محکم نظام کے اندر جکڑی ہوئی ہے ہر شے ایک متعین قانون اور ضابط کی پابند ہے اور ذرہ برابر اس سے انحراف نہیں کر رہی ہے۔ قدرت نے ہر چیز کی تخلیق، نشوونما اور بقائے حیات کا جو ضابطہ مقرر کر دیا ہے وہ اسی کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ آسمان کو دیکھئے، ان گنت عظیم الجثہ ستارے، فینٹانے نیلگوں میں گردش کر رہے ہیں، مگر کمال نظم دیکھئے کہ کوئی ستارہ کسی دوسرے ستارے کی گردش میں خلل انداز نہیں ہوتا بلکہ جس ستارہ کے لیے جو گردش راستہ متعین ہے وہ اسی راستے پر ایک فرماں بردار غلام کی طرح چلا جا رہا ہے۔ نہ تو ان کی رفتار میں کہیں سے کوئی فرق واقع ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے دائرہ گشت میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ ان کے خالق نے ان کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اور جس کام کی انجام دہی

پران کو مامور کر دیا ہے وہ بے چون و چرا اس کو انجام دے رہے ہیں۔ سورج اپنے مدار پر گردش کر رہا ہے اور اس کے طلوع و غروب کا جو ضابطہ خالق کائنات نے ازل سے مقرر کر دیا ہے وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ یہی حال چاند کا ہے، وہ بھی ایک فرض نشان خدام کی طرح زمین کے گرد اوقات کی پابندی کے ساتھ محطوطاف ہے۔ زمین کو دیکھئے اس پر سمندر، دریا، پہاڑ، بے شمار حیوانات اور نباتات کی نیک و وسیع دنیا آباد ہے۔ ان سب کے لیے فطرت نے جو ضابطہ کار متعین کر دیا ہے وہ اس کی پابندی کر رہے ہیں۔ ایک بیج ایک متعین منصوبہ کے تحت ہی زمین سے اگتا ہے، اور نشوونما کے مختلف مراحل طے کرتا ہو، درخت بن جاتا ہے۔ آج تک کبھی اور کہیں یہ حادثہ رونما نہیں ہوا کہ کوئی بیج درست حالت میں اور یوزوہ زمین میں ڈالا گیا ہو اور زمین نے اسے اگانے سے انکار کر دیا ہو۔ سورج کی حرارت سے روزانہ کروڑوں ٹن پانی بھاپ میں تبدیل ہو رہا ہے اور ایک متعین نظام اور ضابطے کے تحت زمین کے مختلف خطوں پر بارش ہوتی ہے۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سمندر نے اپنے پانی کو بھاپ میں تبدیل ہونے سے روک دیا ہو یا بادلوں نے برسنے سے انکار کر دیا ہو یا بوٹوں نے بادلوں کو زمین کے مختلف مقامات تک لے جانے کا کام ترک کر دیا ہو۔ قدرت نے جس کے سپرد جو کام کر دیا ہے وہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دے رہا ہے۔

غرض یہ کہ آپ اس کائنات ارض و سما کی جس چیز کو دیکھئے گا وہ مطیع و فرمان بردار اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف رہے گی۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر چیز مسلم ہے اور پوری کائنات جاہدہ اسلام پر گامزن ہے۔ اسی کو قرآن پاک میں زمین اور آسمانوں کی سجدہ گزاری سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لِمَنْ لَدُنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ
مِّنَ النَّاسِ (ح: ۱۸)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے اور سورج، چاند ستارے، پہاڑ، درخت، حیوانات اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد بھی اس اطاعت و سجدے کے لئے

(ہوئے ہے)

جب ساری کائنات مُسلم ہے اور اس کا دین اسلام یعنی اطاعت ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ انسان جو اسی کائنات کا ایک جزو ہے اس کا دین کیا ہونا چاہیے؟ عقل تو یہی کہتی ہے کہ اس کا دین بھی اسلام (اطاعت) ہونا چاہیے جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

أَتَعْبِرُونَ دِينَ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
مَخِيفًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿آل عمران: ۸۳﴾

یہ وہ خدا کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کے طلبگار ہیں حالانکہ زمین اور آسمانوں میں جو چیز بھی ہے طوعاً و کرہاً اسی کی مطیع ہے اور سب کو خدا ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو دین (قانونِ عمل) ساری کائنات کا ہے وہی دین انسانوں کا بھی ہے۔ اور یہ معلوم ہو چکا کہ کائنات کا دین (قانونِ عمل) اسلام یعنی اطاعت و بندگی ہے، اس لیے انسان کا دین بھی اسلام ہوا۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے تو اس سے یہی مراد ہے کہ اس کائنات میں جو اٹل قانون جاری و ساری ہے وہ اطاعت و انقیاد کا قانون ہے اور اسی قانونِ اطاعت کا نام اسلام ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا
مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ
اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۵﴾ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ
وَجِهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۚ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيَّةَ
أَسْلَمْتُمْ ۖ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا سَاءَ لَكُمْ
الْبَلَاءُ ۚ وَاللَّهُ بِصَيْرُورِ الْعِبَادِ عَلِيمٌ ﴿آل عمران: ۲۰﴾

بے شک دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اہل کتاب نے اس سلسلے میں جو اختلاف پیدا کیا ہے تو وہ لاعلمی کی بنا پر نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ صرف خدا اور ہٹ دھرمی کے سبب ایسا کیا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی آیات سے انکار کرے گا تو اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔ پس اگر وہ تم سے بحث و مجادلہ کریں تو ان سے عاف کہہ دو کہ میں اور میرے پیرو تو اللہ

ہی کے مطیع ہو چکے، اور اہل کتاب اور عرب کے اُمیوں سے کہو: کیا تم اسلام لاتے ہو؟
 اگر وہ اسلام لائیں تو بیشک انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو تمہارا کام معرفت
 پیغامِ رسائی ہے، اور اللہ بندوں پر نگران ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد لفظ اسلام کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس نے دین کے لیے الاسلام کا لفظ اسی لیے اختیار کیا کہ اسلام
 کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے
 کہ دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانون سعادت انسان کے لیے ٹھہرا
 دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے یہ کچھ انسانوں
 ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب
 کے بقا و قیام کے لیے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب
 اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کریں تو
 کا رخانہ ہستی درہم برہم ہو جائے۔“

مسلم کے حقیقی معنی

کائنات ہستی کی ہر چیز کی طرح انسان کا جسم بھی ایک محکم نظام کے اندر جکڑا ہوا ہے۔
 اس کی تخلیق، نشوونما اور عمل کا جو قانون اس کے خالق نے بنا دیا ہے وہ اس کا مکمل طور
 پر پابند ہے۔ اس اعتبار سے انسان کے سارے اعضاء، تکوینی طور پر مسلم ہیں، کیونکہ وہ خدا
 کے بنائے ہوئے قانون عمل کا اتباع کر رہے ہیں۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک چیز
 ارادہ و اختیار سے بھی نوازا ہے جس سے ساری کائنات محروم ہے۔ اس ارادہ و اختیار کا تعلق
 انسان کے افعال کی نوعیت سے ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو آنکھ عطا کی تاکہ وہ اس
 سے دیکھے۔ جہاں تک آنکھ کے فعل بصارت کا تعلق ہے وہ تو قدرت کے بنائے ہوئے ضابطے

کے مطابق انجام پاتا ہے، لیکن انسان آنکھ سے کیا چیز دیکھے اور کیا نہ دیکھے یہ اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی اختیار کو جب وہ اپنی مرضی سے خدا کی مرضی کا پابند بنا دیتا ہے تو وہ فی الواقع مکمل طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نکاح میں بیچھی رکھو اور غیر محرم عورتوں کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھو، تو اگرچہ وہ ان کی طرف دیکھنے پر قادر ہے لیکن اس قدرت کے باوجود ایک مومن صرف اس لیے ان کی طرف نظر بد نہیں اٹھاتا کہ یہ اس کے خالق و مالک کی مرضی کے خلاف ہے۔

گویا مسلم ہونے کے معنی یہ ہونے کہ ہم اپنی خواہشات اور پسند و ناپسند سے دست بردار ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا و عدم رضا اور پسند و ناپسند کے آگے کامل طور پر جھک جائیں جب ہم ایسا کر لیں گے تو ہم بھی کائنات کی ہر شے کی طرح مسلم کہلائیں گے، لیکن ہمارا مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک ساری کائنات سے بلند تر ہوگا، کیونکہ اس کا اسلام اختیاری نہیں بلکہ جبری (فطری) ہے اور ہمارا اختیار ہی ہے۔ ہم نے اپنی مرضی اور خوشی سے اس کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا ہے۔ جو شخص بھی قرآن مجید کا غور سے مطالعہ کرے گا وہ اسلام اور مسلم کی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسے ایک غیر مسلم کی زبان سے بھی سنیں۔ ڈاکٹر بھگوان داس جی فرماتے ہیں:

”لفظ اسلام نہایت بلند اور عمیق مفہوم کا حامل ہے اور جو بلاشبہ مذہب کی اصلی روح اور ماہیت ہے۔ یہ لفظ سلم سے نکلا ہے جس کے معنی امن اور شانتی کے ہیں، اور اس کا مطلب خدا کو پورے اطمینان قلب کے ساتھ تسلیم کرنا ہے (Peaceful Acceptance of God) یعنی پرسکون دست برداری“

کامل تسلیم و رضا خود سپردگی اور اطاعت و مغلوبیت یا دوسرے لفظوں میں حقیر ذات کا عظیم ذات کے سامنے سرفاقدہ ہو جانا، اور خود بینی اور انانیت کو ترک کر کے خود کو آفاقیت میں گم کر دینا ہے، یا ”اے خدا تیری مرضی پوری ہو میری نہیں ہائے“

۱۲۹۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔ دیکھئے لوقا باب ۱۰: ۴۳۔

پس حقیقی معنوں میں وہی شخص مسلم ہے جو خود کو خدا کی مرضی کے سپرد کر دے، امانیت تکبر اور خود پرستی کو چھوڑ کر عجز و انکسار، فروتنی و خاکساری اور خدا پرستی کی روشیں اختیار کرے، خواہشتا جذبات اور اغراض کو فراموش کر کے اپنی ذات (Ego) کو خدا کی مرضی میں فنا کر دے۔

یہ خود سپردگی اور فنایت محض کوئی نظریہ نہیں بلکہ یہ ایک عمل کا نام ہے اور اس کا اہتمام ایک مومن و مسلم کی زندگی کے تمام افعال سے ہونا چاہیے نہ صرف زبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ اسی طرح خود سپردگی اور فنایت کا مفہوم صرف ذہنی اور روحانی استغراق نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح تر مفہوم جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ بندہ خدا کی مرضی کا پابند ہو جائے، زندگی کے ہر معاملے میں وہ صرف یہ دیکھے کہ اس کے خالق و مالک کی مرضی کیا ہے؟ مرضی مولا معلوم ہو جانے کے بعد کسی ادنیٰ پس و پیش کے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ یہی ایک سچے مومن و مسلم کا طفرائے امتیاز ہے اور اسی شانِ بندگی پر حقیقی ایمان و اسلام کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسلام کا شرعی مفہوم

شرعی اعتبار سے جب اسلام کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کا اطلاق پانچ امور پر ہوتا ہے جیسا کہ عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

”اسلام پانچ چیزوں پر مبنی ہے (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں (۲) نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) حج کرنا (۵) رمضان کے روزے رکھنا“

صحیح مسلم ابواب الایمان میں جو حدیث حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے اور جسے ہم ایمان کی بحث میں نقل کر چکے ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہی امور خمسہ کا نام شرع میں اسلام ہے، اور جو شخص ان پر عمل کرتا ہے وہ از روئے شریعت مسلم ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام انہی پانچ امور تک محدود ہے اور باقی دیگر امور

اس سے خارج ہیں۔ شرعی اعتبار سے انہی پانچ امور کو اسلام اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دراصل پانچ بڑے اعمال اطاعت ہیں جو ایک مسلم کے دیگر تمام افعال کے محافظ و نگراں کی حیثیت رکھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک مسلم کے جذبہ اطاعت کی مشہور نشانیوں میں۔

درحقیقت یہ پانچ امور جنہیں ارکان اسلام کہا جاتا ہے، ایک مسلم کی زندگی کو عبادتِ پر قائم رکھتے ہیں۔ اور اسے تسلیم و رضا اور صبر و شکر کے پیکر میں ڈھالتے ہیں بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے اور ان اعمال کے ظاہری آداب و رسوم پر یہی قانع نہ رہا جائے بلکہ ان کے حقیقی مقصد و منشا کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے اعمال کا ترکیب کیا جائے۔ آج مسلمانوں کے اعمال کی خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے ان اعمال (ارکان اسلام) کے ظاہری آداب و رسوم کی درستگی ہی کو اصل مقصد سمجھ لیا ہے حالانکہ اس سلسلے میں قرآن اور حدیث کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔ مثلاً جب قرآن نے یہ کہا کہ "نماز فحشا اور منکر سے روکتی ہے" تو اس سے اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ نماز چند کلمات زبان اور حرکات جسمی کا نام نہیں ہے، بلکہ اعمال کی ظہارت و پاکیزگی کا سرچشمہ بھی ہے۔ اگر اعمال ظہارت و پاکیزگی سے خالی ہیں تو پھر زبان سے چند مخصوص کلمات کی ادائیگی اور مخصوص حرکات بدنی کا قصد و نیا حاصل ہے۔ عبادت کی ظاہری شکلوں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ان سے مقصود روح کی پاکیزگی اور اعمال کی درستگی ہے۔ اسے نہیں بھولنا چاہیے۔

متعدد احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام صرف چند عبادات کی ادائیگی کا نام نہیں ہے، بلکہ حسن اعمال سے عبارت ہے جو عبادات کا اصل مقصد و مطلوب ہے۔ کوئی انسانی عمل بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق دریافت فرمایا تو کبھی آپ نے ارکان اسلام بیان فرمادئے جیسا کہ عبد اللہ بن عمرؓ کی مذکورہ حدیث سے ظاہر ہے اور کبھی اپنے پوچھنے پر ارکان اسلام کی جگہ دوسرے اہل کی طرف اشارہ فرمادیا مثلاً عبد اللہ بن عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

”مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، اور مہاجر وہ ہے

جس نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا جن سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ بہترین مسلم کون ہے؟ آپ نے فرمایا ”وہ شخص جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں“۔

عمر بن عبد العاص سے بھی ایک روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول اسلام کیا ہے؟“ آپ نے فرمایا ”اچھی گفتگو اور کھانا کھلانا“ میں نے عرض کیا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا ”صبر اور فراخ دلی“ میں نے عرض کیا: کون سا اسلام افضل ہے؟ فرمایا ”اس کا جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں“ میں نے عرض کیا: کون سا ایمان افضل ہے؟ فرمایا ”بہترین اخلاق“ میں نے عرض کیا: کون سی نماز افضل ہے؟ فرمایا ”جو طول قنوت کی حامل ہو“ میں نے عرض کیا: کون سی ہجرت افضل ہے؟ فرمایا ”ان چیزوں کو چھوڑ دینا جن کو تیرا رب ناپسند کرتا ہے“ اس کے بعد میں نے عرض کیا: کون سا جہاد افضل ہے؟ فرمایا ”اس کا جس کا گھوڑا جہاد میں مارا جائے اور خود بھی اس خون بہایا جائے“ میں نے عرض کیا: کون سی ساعت افضل ہے؟ فرمایا ”رات کا آخری حصہ“۔

ایک دوسری روایت حضرت ابو ہریرہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ بات آدمی کے اسلام کی خوبی اور حسن میں سے ہے کہ وہ لالینی باتوں کو چھوڑ دے۔“

ان احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا مقصد یہی تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے توسط سے دوسرے لوگ بھی اسلام کے حقیقی مفہوم اور ارکان اسلام کے حقیقی مقصد و منشا سے بخوبی آگاہ ہو جائیں۔ مقام افسوس

ہے کہ ان واضح تشریحات کے باوجود آج اکثر مذہبی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ پانچ اوقات کی نمازیں پڑھ کے، تیس دن کے روزے رکھ کے، اور ٹیڑھے سپیدھے زکوٰۃ و حج کے فرائض ادا کر کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے حق اسلام ادا کر دیا، خواہ ان کی زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ ہو، خواہ دیانت و امانت اور حسن اخلاق سے ان کا ہر معاملہ خالی ہو، خواہ کسی بھی لائینٹی بات کو انھوں نے ترک نہ کیا ہو، اور خواہ سماج کے غریب و مساکین کی تنگ دستی اور مفلوک الخالی پران کا دل کبھی مضطرب نہ ہوتا ہو، لیکن پھر بھی وہ خود کو متدین اور متقی ہی سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کی نماز، روزے اور اذکار و اوراد کے گن گائیں۔

ایمان اور اسلام میں تلازم ہے

اسلام اور ایمان میں لغوی اور ظاہری فرق کے باوجود تلازم ہے یعنی ایک کے بغیر دوسرے کا وجود محال ہے۔ ان کی مثال تخم اور درخت کی سی ہے۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ موزوں آب و ہوا اور مناسب زمین میں بیج نہ ہو لیکن سطح زمین پر درخت کھڑا ہو، بعینہ یہی حال ایمان اور اسلام کا ہے۔ ایمان کے بغیر اسلام کا اور اسلام کے بغیر ایمان کا وجود محال ہے۔ اگر قلب میں حقیقی ایمان ہوگا تو لازماً صاحب ایمان کے افعال میں اسلام یعنی خدا کی اطاعت و بندگی کی شان جلوہ گرے گی، اور اگر اس کے افعال سے قدم قدم پر خدا سے بغاوت ظاہر ہو تو یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہوگا کہ اس کے قلب میں ایمان موجود نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی مشہور کتاب "الفقہ الاکبر" میں ایمان اور اسلام کی حقیقت یوں مذکور ہے۔
 "ایمان اقرار و تصدیق کو کہتے ہیں اور اسلام کا مفہوم خدا کے احکام کی پابندی ہے۔ گو کہ باعتبار لغت اسلام اور ایمان الگ الگ چیزیں ہیں لیکن دینی اعتبار سے ان دونوں میں تلازم پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ نہ ایمان کے بغیر اسلام پایا جاسکتا ہے اور نہ اسلام کے بغیر ایمان کا وجود ممکن ہے۔"

قرآن پاک میں متعدد جہوں پر ایمان اور اسلام کا لفظ ہم معنی استعمال ہوا مثلاً ایک آیت ہے

فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۶﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ

بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿الذاريات: ۳۶﴾

پس اس جہ میں جو مومن تھے ہم نے سے نکال دیا اور وہاں تو یہ ہے کہ ہم نے پوری جہ میں

ایک گھر کے سوا کوئی مسلمہ نہ پایا۔

دوسری جگہ آیا ہے :

وَقَالَ مُوسَىٰ يُقَوْمُونَ قَوْمًا كُنْتُمْ بِآلِهَتِكُمْ أَشْرَكًا فَأَلَمْتَهُم بِآلِهَتِهِمْ فَاتَّخَذُوا إِلَٰهًا غَيْرَ اللَّهِ فَذَرْنُوهُمْ هَلْ يُفْعَلُونَ ﴿۱۰۲﴾

مُسْلِمِينَ ﴿یونس: ۱۰۲﴾

اور موسیٰ نے کہا: اے قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم کوئی

مذہب میں اطاعت گزار ہو۔

یہی بات ایک دوسری جگہ دعوت ایمان کے ذکر میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے :

قُلْ أُمَمًا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا نُنزِلُ الْكِتَابَ عَلَيْكُمْ بِاللُّغَةِ الَّتِي فُهِمَ بِهَا قَوْمُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۰۴﴾

وَأَسْحَبُ السَّحَابَ وَمَا أَوْتَيْنَا مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيِّينَ

مِنْ كِتَابٍ إِلَّا نَفَخْنَا بَيْنَهُمْ آيَاتِنَا فَتَلَاؤُهُمْ بِآيَاتِنَا وَإِنَّا لَنَافِخُونَ ﴿۱۰۵﴾

آل عمران: ۱۰۴

کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر جو تم سے پاس بھی گئی، اور اس پر بھی جو تم سے

اسما میں، اسحاق، یعقوب اور اودا، یعقوب کے پاس بھی گئی، اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے

نبیوں کو دی گئی تھی۔ ایمان میں باہم دگر کوئی تفریق نہیں کرتے۔ ورم ہی کے مطیع و فرمان بردار رہنا۔

قرآن پاک میں اہل ایمان کی جو صفات مذکور ہیں، ان میں بھی ایمان اور اسلام کو لازم و

ملزوم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے :

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ

وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ ذُكُّرٌ مُّؤْمِنُونَ ﴿۱۰۶﴾

بیشک تم لوگوں کا حامی وہ دگرگاہ تو بس اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان میں جو نماز

قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ کوئی کرنے والے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

صَحَّ سَدَنُكَ اَيْتُ الْقُرْآنِ وَرِكَابُ مُبِينٍ ۙ هُدًى وَبَيِّنَاتٍ
لِّلَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ
هُمْ يُوقِنُونَ (ممل: ۳)

حاشیہ: آیات ہیں قرآن اور کتاب میں کی اس میں ہدایت اور بشارت ہے ان ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں مؤمنین انہی کو کہا گیا ہے جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور یہ آپ جان چکے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ ارکان اسلام میں داخل ہیں یہی بات دراز زیادہ واضح الفاظ میں سورہ انفال میں یوں مذکور ہے:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَاَقَامَ الصَّلَاةَ
وَاَتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ - فَعَسَىٰ اُولٰٓئِكَ اَنْ يَكُونُوْا
مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (توبہ: ۱۸)

بیشک اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ یہ سب کر وہ اپنے مقصد کو پالیں۔

اس آیت کا پہلا کلمہ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت، حقیقت ایمان کو اور دوسرا کلمہ یعنی اقامت صلوٰۃ اور ایتا زکوٰۃ اور خشیت خدا، حقیقت اسلام کو ظاہر کرتا ہے۔ ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے اللہ نے اپنے بندوں کو یہ بتانا چاہا ہے کہ ایمان اور اسلام میں باعتبار واقعہ کوئی دوئی نہیں ہے، اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جس نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا اور اس پر عمل پیرا ہو گیا وہی فی الواقع ہدایت یافتہ اور کامیاب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ

يُنْفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ
 قَبْلِكَ وَالْآخِرَةَ هُمْ يُؤْتُونَ ۝ أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَئِكَ
 هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (بقرہ: ۵-۳)

جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو رزق ہم نے انھیں دے رکھا
 ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، اور جو ایمان رکھنے میں اس چیز پر جو تمہارے پاس
 بھیجی گئی اور اس پر بھی جو تم سے پہلے دوسرے انبیاء کے پاس بھیجی گئی تھی۔ اور جو آخرت پر
 یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے بچنے والوں سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی فی الواقع کامیاب و بامراد ہیں۔
 دوسری جگہ ارشاد ہے:

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ۝ هُدًى وَرَحْمَةً لِلْخَائِفِينَ ۝
 الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ
 يُوقِنُونَ ۝ أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝
 (نہج: ۳-۵)
 یہ حکمت بھری کتاب کی آیات ہیں، ان نیکو کاروں کے لیے اس میں ہدایت و رحمت ہے
 جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب
 کے فضل ہدایت یافتہ ہیں اور یہی فی الواقع کامیاب و بامراد ہیں۔

ہدایت و فلاح کا حقیقی معیار

اوپر کی سطروں میں ہم نے ایمان اور اسلام میں تلازم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے
 اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ہدایت اور فلاح کا ذریعہ سچا ایمان اور اللہ
 کے احکام کی مخلصانہ اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ اس واضح قرآنی تعلیم کے باوجود آج
 مسلمانوں نے ہدایت و فلاح کے بہت سے غیر قرآنی معیار بنالیے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے۔
 کہ آج ہر مذہبی گروہ دوسرے کو گمراہ اور جہنمی قرار دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ آج مسلمان
 شعوری یا غیر شعوری طور پر ان اقوام کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جن کے متعلق قرآن پاک
 نے کہا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ كَيْسَتْ النَّصْرَةَ عَلَىٰ شَعْنِي ۖ وَمَا قَالَتِ النَّصْرَةَ كَيْسَتْ
الْيَهُودُ عَلَىٰ شَعْنِي ۖ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ

(بقرہ: ۱۱۳)

یہود کہتے ہیں کہ عیسائی گم راہ، اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہود گم راہ ہیں حالانکہ دونوں ہی اللہ
کی کتاب پڑھتے ہیں (جس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ہدایت یا فدا کون ہے اور گم راہ کون؟)
اسی طرح کی بات وہ بھی کہتے ہیں جو اہل کتاب نہیں ہیں (یعنی ہدایت اور ضلالت کا علم
نہیں رکھتے ہیں)

یہ کیسی فکر و نظر کی کج روی ہے کہ قرآن حکیم تو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان، اقامت نماز
اور ایثار زکوٰۃ کو ہدایت اور فلاح کا ذریعہ قرار دیتا ہے، لیکن مسلمان ہے کہ کسی مسلم گھر میں پیدا
ہونے اور مسلمانوں کا سامنا رکھنے، کسی مذہبی فرقہ یا دینی شخصیت سے وابستگی اور کچھ دینی و باقی
اعمال و رسوم کی ادائیگی ہی کو ہدایت اور نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ہر مذہبی
گروہ نے ایمان اور اسلام کے نام پر جدا جدا عقائد و اعمال بنا لیے ہیں۔ جو شخص ان کے خود ساختہ
عقائد و اعمال کا پیرو ہے وہ ان کے نزدیک مسلمان ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے۔
یہ خود ساختہ عقائد و اعمال ہی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان خوفناک انفرق و انتشار کی
دلدل میں گرفتار ہیں، اور ہر طرف باہمی منافرت اور بغض و عداوت کی آگ جل رہی ہے۔
مسلمان یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ بغض و عداوت کی یہ آگ صرف اسی صورت میں ٹھنڈی ہو سکتی
ہے جب وہ اپنے خود ساختہ عقائد و اعمال کو ترک کر کے قرآن کے معیار ہدایت و فلاح
کو صدق دلی کے ساتھ مان لیں۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، ہدایت اور فلاح کا معیار یہی ہے
کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور یوم آخرت پر یقین ہو اور قیام نماز اور ایثار زکوٰۃ کے فرض
کو اس کے جملہ تقاضوں کے ساتھ ادا کیا جائے، نیز زندگی کے ہر معاملے میں خدا اور اس
کے رسول کے احکام و ہدایات کے مطابق حتیٰ الوسع عمل کیا جائے۔ اسی کا نام حقیقی ایمان
اور اسلام ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر وہ خدا کی خوشنودی اور اس کی رحمت

کے مستحق ہو سکتے ہیں جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ مَّ يَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ
يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ
سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۴۱﴾ (توبہ: ۴۱)

اور مومن عورتیں اور مومن مرد تو ایک دوسرے کے رفیق اور دمساز ہوتے ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں، اور ناز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ اللہ ان پر عنقریب اپنی رحمتیں نازل کرے گا بیشک اللہ قدرت والا حکمت والا ہے۔

اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایثارِ زکوٰۃ کے بعد طیبون اللہ و رسولہ کا جملہ صاف بتا رہا ہے کہ ایک مومن کی اطاعت صرف اقامتِ صلوٰۃ اور ایثارِ زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ اطاعت کے دائرہ سے اس کی زندگی کا کوئی عمل بھی خارج نہیں ہوتا ہے یہی اطاعتِ کامل ہے جس کے نتیجے میں مومنین پر اللہ کی رحمت و بخشش کا نزول ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں جو جگہ جگہ ”طیبوا اللہ و اطیبا الرسول“ کا جملہ ملتا ہے تو اس سے مومنوں کو یہی بتانا مقصود ہے کہ ایمان کے بعد اطاعت سے روگردانی ایمان کے منافی ہے۔ ایک مومن کا وصف ہی قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وہ ایمان اور اطاعت (اسلام) کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں اسے خدا اور اس کے رسول کا کوئی حکم ملتا ہے فوراً اس پر لیک کہتا ہے اور اس کو جلالا ہے۔ عہدِ رسالت کے مومنین کا یہی حال تھا جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے:

أَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ
أَمَّنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ
رُّسُلِهِ ۚ سَوَّآلًا لِّمَنَعْنَا وَأَطْعَمًا ۗ (بقرہ: ۲۸۵)

رسول کے پاس اس کے رب کی طرف سے جو کچھ بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان بھی ان میں سے ہر ایک اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے

رسولوں پر ایڈیٹر کسی تفریق کے ایمان رکھتا ہے اور (ان کی زبان پر) ہی صد ہوتی ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جو شخص خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے لیکن ان کے حکموں کو سن کر ان پر غصے کی کوشش نہیں کرتا وہ قرآن کے نزدیک مومن نہیں ہے خواہ وہ زبان سے محبت رسول کی کتنی ہی باتیں کیوں نہ کرے۔ ارشاد ہے:

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فِئْتًا مِنْهُمْ
مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ - (نور: ۴۷)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ان کی اطاعت قبول کرنی لیکن اس ایمان و اطاعت کے اقرار کے بعد بھی وہ احکام پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں اور یہ مومن نہیں۔

ایک مومن کے مع و اطاعت کا حال قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

إِذَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ
يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (نور: ۵۱)

جب انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے تو ایمان والوں کی صدای ہی ہوتی ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی یہی لوگ فی الواقع کامیاب و باہر اذیت ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے کے بعد ان کے احکام سے روگردانی کرنا کسی مومن حقیقی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ یہ طرز عمل تو صرف فی سقول اور منافقوں کا ہے۔ ایک حکم عدوی تو یہ ہے کہ آدمی نہ سے کہہ دے کہ وہ خدا کا حکم کو نہیں مانتا یہ سرتن سرکش جگہ نافر ہے اور دوسری حکم عدوی یہ ہے کہ آدمی زبان سے تمیل حکم ہے انہ تو کہے لیکن عملاً وہ کام کرے جو خدا اور اس کے رسول کے حکم کے بالکل خلاف ہو۔ اسی کا نام اصطلاح قرآن میں فسق ہے اور ایسا کرنے والے کو وہ فاسق قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اس طرز عمل سے روکا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَاسْمُؤْهُ وَكُلَّ

عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۚ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا
وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۲۱﴾ (انفال: ۲۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور جب رسول تم کو بلائے تو سن کر ان سنی نہ کرو۔ ایمان لوگوں کی طرح نہ سوجاؤ جو کہتے ہیں کہ سنا رہے ہیں (یعنی حکم خدا اور رسول سن کر ان کو بجا نہیں لائے)

صدر اول کے مسلمانوں نے ۲۵ سال کے مختصر زمانہ میں جو مہتمم باشندگان کامرانیوں حاصل کیں، اور روم و ایران جسی عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قدموں پر چھکنے کے لیے مجبور کر دیا تو اس کی وجہ صرف اللہ اور اس کے رسول پر سچا ایمان اور عمل و اطاعت کی زندگی تھی، اور آج ہم جو دنیا میں کثرت تعداد کے باوجود بنی مت خوردہ اور پست و ذلیل ہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ ہم ایمان اور اطاعت کی حقیقی روح سے محروم ہو چکے ہیں۔ عقائد میں ہماری اکثریت کسی نہ کسی پہلو سے شرک کی حدوں کو چھو رہی ہے، اور اعمال کے اعتبار سے ہم دور رسالت کے منافقوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے اقامت نماز اور اتار کلوۃ کا فریضہ انجام دیتے تھے لیکن آج ہمارا ایمان کا یہ حال ہے کہ ہماری اکثریت اقامت صلوة اور اتار کلوۃ سے جو ہماری اجتماعیت سماجی مسألوں کا تنظیم و اتحاد، معاشرتی خوشحالی اور تزکیہ نفس کے بہترین ذرائع ہیں، عملاً بے پروا ہو چکی ہے، اور جہاں کہیں صلوة و کلوۃ کا اتہام ہے بھی تو وہ بالعموم ایک بے روح ڈھانچہ ہے اور زندگی کے تمام معاملات اس کے دائرہ اثر و نفوذ سے باہر ہیں۔ مسلمان یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی و سر بلندی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ خدا کی خالص اطاعت و بندگی اور حسن عمل کا راستہ ہے۔ اس راستے کے سوا جو راستہ بھی ہے وہ ضلالت و خسران کی راہ ہے، اس پر چلنے کا نتیجہ دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں دردناک عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

درجات ایمان

ہمارے اکثر علماء نے ایمان کی قسمیں بیان کی ہیں، لیکن ہماری حقیر فہم کے مطابق ایمان ناقابل تقسیم ہے۔ انسان کے قلب میں یا تو یقین ہوگا یا انکار یا شک، پہلے کا نام ایمان، دوسرے

کافر اور تیسرے کا نفاق ہے۔ اسی بنیاد پر انسانوں کی بھی تین قسمیں ہو جاتی ہیں۔ مومن، کافر اور منافق۔ ہدایت کے پہلو سے قرآن نے بھی انسانوں کو انھیں تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ان کو بالترتیب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ
وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِمَّا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ وَ
بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۗ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۗ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (البقرہ: ۲-۵)

جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق بھی ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل ہوئی، اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کے فضل سے ہدایت یافتہ اور کامیاب ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝
حَتَّمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَغَلَظَ سَمْعَهُمْ وَغَلَظَ أَبْصَارَهُمْ غَشَاوَةٌ رَّوَاهُمْ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (البقرہ: ۶-۷)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کو تم (انجام کار سے) ڈراؤ یا نہ ڈراؤ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا، وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر (ان کے افعال بد کی وجہ سے) مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پٹی پڑی ہوئی ہے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝
يُخَدَعُونَ اللَّهُ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يُخَدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور اہل ایمان کو دھوکا دینا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت وہ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ مگر اس کو سمجھتے نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کے نقطہ نظر سے انسانوں کی قسمیں تو ہو سکتی ہیں لیکن خود مومن کی کوئی تقسیم نہیں ہو سکتی، وہ ناقابل تقسیم ہے۔ البتہ ایمان کے مختلف درجات ضرور ہیں۔ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے ذہنی اعتبار سے ایک حالت پر پیدا نہیں کیا ہے۔ اور طبائع اور استعدادوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اس لیے یقین و اطاعت کی حالت بھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ یقین و اطاعت میں اس فطری فرق کے نتیجے میں ایمان کے تین درجہ متعین ہوتے ہیں۔

ایمان کا پہلا درجہ زبان سے اقرار و تسلیم کرنے اور اعضاء سے عمل کرنے کا ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ اس درجہ میں بالعموم ناخواندہ اور کم تعلیم یافتہ اشخاص پائے جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دل میں کوئی شک ہو تا ہے بلکہ علم کی کمی کی وجہ سے وہ یقین جو بیونا چاہیے، اس سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر ایسے لوگ اقرار لسانی کے بعد غامبری طور پر اسلامی زندگی گزارتے ہیں یعنی کم از کم ارکان اسلام پر حتمی المقدور عمل کرتے ہوں تو وہ بلاشبہ مسلمان کہے جائیں گے اور انہیں مسلمانوں کی جماعت کا ایک فرد سمجھا جائے گا۔ اگر اقرار لسانی کے بعد وہ ارکان اسلام پر عمل نہ کریں تو ان کا شمار فتناء کے زمرے میں کیا جائے گا۔ اس پہلے درجہ کے متعلق جس کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایمان کی ایک قسم قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

”شارع نے ایمان کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک تو وہ جس پر احکام دنیا کا مدار ہے جیسے جان و مال کا محفوظ ہونا اور اس کا انضباط ایسے امور سے کرنا جن میں فرماں برداری ظاہر ہوتی ہے، اور وہ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو بجز حق اسلام کے وہ اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے محفوظ کر لیں گے اور (جو کفر و معاصی وہ پوشیدہ طور پر کریں گے) خدا ان سے لے گا۔“ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص ہماری سی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کو اپنا قبلہ سمجھے اور ہمارے ہاتھوں کا ذبیحہ کھائے تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا معاہدہ ہے پس تم لوگ اللہ کے معاہدہ میں خیانت نہ کرنا!"

اس اقتباس اور اس میں مندرج حدیث سے واضح ہو گیا کہ ایمان کا کم سے کم درجہ یہی ہے کہ آدمی اللہ کی معبودیت اور وحدانیت اور رسول کی رسالت پر ایمان لائے، نماز پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے، اور اعمال و رسوم میں مسلمانوں جیسا طرز عمل اختیار کرے۔ اگر وہ اتنا کر لیتا ہے تو وہ مسلمان ہے اور اس کے باقی معاملات اللہ کے سپرد ہیں۔

ایمان کا دوسرا درجہ یقین قلب کا ہے۔ یہ ایمان کا نہایت ہی بلند درجہ ہے۔ اور تمام صلحاء و اتقیا اور علماء خیر اسی درجہ پر فائز ہوتے ہیں۔ اس درجہ میں یقین قلب کے ساتھ ساتھ کامل درجہ کا تسلیم و انقیاد بھی پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ایمان کے حاملین کو مومن صادق قرار دیا ہے، فرمایا:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَ
جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ
الصَّادِقُونَ ﴿١٥﴾ (حجرات: ۱۵)

بیشک مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہ کیا اور راہ خدا میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ (اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں۔

ایمان کا تیسرا درجہ اطمینان قلب کا ہے۔ اطمینان اور طمانیت اس سکون اور ٹھہراؤ کو کہتے ہیں جو مشقت اور کوفت کے بعد حاصل ہو۔ ایمان کے بعد ایک مرتبہ سکون قلب کا آنا ہے جس کے حصول کے بعد وہ ہر طرح کے وساوس اور شکوک سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے گویا قلب ایک لیے نقطہ پر آکر ٹھہر جاتا ہے جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت اسے ادھر سے

سبحان اللہ العالی، جلد اول من البواب الایمان، ص ۱۶۲ طبع بیروت

اُدھر نہیں کر سکتی۔ اس مرتبہ ایمان کو اصطلاح قرآن میں عین الیقین کہا جاتا ہے۔ اس طرح کا ایمان انبیاء و رسل اور شہداء و محدثین کا درجہ بدرجہ ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسرارِ فکر کا ہر پردہ اٹھنے لگتا ہے اور مومن کا قلب، یقین و اطمینان کے انوار و تجلیات سے معمور ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد اس کا ہر انداز معصومانہ اور اس کی ہر ادا دلبرانہ ہو جاتی ہے۔ اس مرتبہ و مقام کی تین مثالیں ہم کو قرآن پاک میں ملتی ہیں۔ پہلی مثال کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے ایک نبی سے ہے۔ قرآن نے نام کی تصریح تو نہیں کی ہے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی دانیال، حمی اور عزیز علیہم السلام میں سے کوئی ایک تھے۔ ان کے ساتھ جو معاصرہ پیش آیا وہ قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا: قَالَ أَنَّى يُعْبَهُ هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا: فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ: قَالَ كَفَرْتُمْ: قَالَ لَيْسَتْ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ: قَالَ بَلْ لَيْسَتْ يَوْمًا عَامٍ فَأَنظَرْنَا إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّه: وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ: وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا: قُلْنَا تَبَيَّنْ لَهُ: قَالَ أَعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ (بقرہ: ۲۵۹)

ایک مثال اس شخص کی بھی ہے جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جس کے سقف و بام شکستہ ہو کر گر چکے تھے۔ بستی کی اس حالت کو دیکھ کر وہ کہنے لگا کہ یہ بستی جو مردہ و دیران ہو چکی ہے اسے کس طرح اللہ دوبارہ نئی زندگی بخئے گا۔ (یعنی آباد کر دے گا) پس اللہ نے اسے ۱۰۰ سال تک حالت موت میں رکھا پھر اسے زندہ کیا اور پوچھا کہ کتنے دنوں تک تم اس حالت میں رہے ہو؟ اس نے عرض کیا: بس یہی کل ایک دن یا نصف دن، اس نے کہا: نہیں تم ۱۰۰ سال تک اسی حالت میں رہے ہو۔ (اگر تم کو یقین نہیں تو) ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ بالکل محفوظ حالت میں ہیں، اور اپنے گدے کی طرف دیکھو (جو گل ٹرچکا ہے) ہم تم کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں، اور اب گدے کی بڑیوں کی طرف دیکھو کہ کس طرح

ہم اس کی بیڈیل کو ترکیب دیتے ہیں پھر اس پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت حال کھل گئی تو وہ پکاراٹھا: بیشک میں سمجھ گیا کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اس واقعہ سے نبی پر یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ جو خدا ایک آدمی کو سو سال تک حالت موت میں رکھنے کے بعد دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ اور گدھا جو صرف بیڈیلوں کا ایک ڈھانچہ تھا دوبارہ اس کے انجمن پر درست کر کے اس کو بھر زندہ کرا کر سکتا ہے۔ اس خدا کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہیں کہ وہ مردہ بستیوں اور شہروں کو دوبارہ زندہ یعنی آباد کر دے۔ چنانچہ یہ بات حرف بہ حرف پوری ہو گئی اور ٹھیک سو سال کے بعد بیت المقدس دوبارہ آباد و تعمیر ہو گیا۔ دوسری مثال کا تعلق حضرت ابراہیم سے ہے۔

وَإِذْ قَالَ لِأَبْنَاهُ رَبِّ آدِنِي كَيْفَ تُشِئُ السُّؤْتِ . قَالَ أَوْلَمْ تُؤْمِنُ . قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي . قَالَ فَاخْذِ أَزْوَاجًا مِّنَ الظَّيْرِ فَصَرَّهُنَّ إِلَىٰكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْهُنَّ . اذْعُهِنَّ يَا إِبْرَاهِيمُ . سَعِيًّا . وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿ (بقرہ: ۲۶۰)

اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے ہمارے رب تو ہمیں دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا، اس کے رب نے کہا: کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں البتہ (مشابہہ یعنی کے ذریعہ) ایمان قلب کا طالب ہوں۔ اس (رب) نے کہا: اچھا تو چار پرندے لے لو اور ان کو اپنے سے مانوس کر لو پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ایک ٹکڑا رکھ دو اور اس کے بعد ان کو پکارو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ بڑی قدرت والا اور حکمت والا ہے۔ تیسری مثال کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے۔

قَالَ رَبِّ آدِنِي كَيْفَ تُشِئُ السُّؤْتِ . قَالَ لَنْ تَرِيَنِي وَلَا تَرِيَنِي . فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا . فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ سُبْحٰنَكَ . وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿ (اعراف: ۱۴۳)

اس نے (موسیٰ) کہا: اے میرے رب تو مجھے اپنی ایک جھلک دکھا دے۔ اس نے کہا: تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں پہاڑوں کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ ثابت و قائم رہا تو تم مجھے یقیناً دیکھ لو گے۔ پس جب

اسکے پروردگار نے ہوا پر زندگی تو لے کر یزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا جب اسے ہوش آیا تو یمن
 کیا: بے شک میری ذات (ہر نفس سے) پاک ہے۔ میں (اپنی جرات) دید پر تیرے جناب میں معذرت خواہ ہوں
 اور سب سے پہلے اس (حقیقت) اختلاف پر یقین کرنے والا ہوں۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے نیک بندوں کو یقین سے عین یقین
 کی منزلوں تک لے جاتا ہے اور ان پر حقیقت حال کھول کر ان کے قلب و دماغ کو روشنی
 عطا کرتا ہے۔ اس فضل و کرم سے اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو نوازتا ہے جن کے متعلق اس نے کہا ہے:-

قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَى الْبَيْتِ مَنِ آتَابَ ۗ ﴿۲۰۰﴾

کہہ دو کہ بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس کے اعمال کے سبب (گمراہ کر دیتا ہے
 اور جو شخص اس کی طرف طلب ہدایت کے لیے جوڑتا ہے اسے راہ ہدایت دکھاتا ہے۔
 ہم نے سطح پر ان میں ایمان کے جن تین درجہ کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:-

”بزرگ حقیقت کے لحاظ سے یہاں تین مرتبے ہوئے ہیں: پہلا تہ اسلمی دائرہ کے نام اعتقاد و
 عمل کا ہے یا سلام ہے یعنی جسے اسلمی عقیدہ کا اقرار کیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار
 کرنی وہ اس کے دائرہ میں گیا۔ لیکن دائرہ میں داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ علم و یقین کے
 جو مقامات ہیں وہ بھی ہر وارد و داخل کو حاصل ہو گئے۔ پس اب دوسرا درجہ نمایاں ہوتا ہے جسے
 ایمان کے تعبیر کیا جاتا ہے، اسلام ظاہر کا اقرار و عمل تھا، ایمان دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔

یہ مرتبہ جسے اصل کر لیا وہ عوام سے نکل کر خاص کے گروہ میں داخل ہو گیا۔ لیکن معاملہ اتنے ہی پیچیدہ
 نہیں ہو جاتا، عرفان حقیقت اور عین یقینی ایمان کا ایک اور مرتبہ باقی رہ جاتا ہے اسے احسان
 تعبیر کیا گیا۔ لیکن یہ مقام یقین اور اعتقاد پیدا کرنے کا نہیں ہے جو ایک گروہ کو یقینیت گروہ کے
 حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ ذاتی تجربہ کا مقام ہے جو یہاں تک پہنچ جاتا ہے وہ اپنے ذاتی تجربہ و گفت
 سے یہ درجہ حاصل کر لیتا ہے تعلیمی اور احکامی عقائد و رسوم میں خلل نہیں۔ یہ خود کرنے اور پانے
 کا معاملہ ہے بتلانے اور سمجھانے کا نہیں جو یہاں تک پہنچ گیا وہ اگر کچھ بتلانے کا بھی تو
 یہی کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو“

ایمان کا وہ مرتبہ و مقام جس پر صدرا اول کے مسلمانوں کی اکثریت فائز تھی یہ یقین
 و اطمینان کا مرتبہ تھا۔ ان کے قلوب و اذہان یقین و اطمینان سے اس طرح لبریز تھے کہ مصائب

آلام کے طوفان اور تعذیب و تشدد کی آندھیاں بھی ان کی شمع ایمان کو گل نہ کر سکیں۔ انھوں نے اپنی جان عزیز، جاں آفریں کے سپرد کر دی لیکن ایمان سے دست برداری گوارا نہ کی۔ اعترافاً رب بیوی بچے، مال و تجارت اور مکان و وطن کی محبت کو ایمان کی محبت پر یوں قربان کر دیا جیسے یہ بے وقعت چیزیں تھیں۔ یہ جذبہ خلوص و ایثار ان کے اندر پیدا نہیں ہو سکتا تھا اگر خداوت ایمان سے ان کے قلوب و اذبان آشنا نہ ہوتے۔ میکہ، علم و یقین کے جرعہ خور بن جانے کے بعد ہی وہ اوہام و اساطیر کے جام و مینا کو چکنا چور کر سکے۔ ان کی زندگیاں یقین محکم، عمل صالح اور خدا اور اس کے رسول کی محبت و اطاعت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ انھوں نے کہہ دیا کہ خدا ایک ہے تو پھر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی انھیں آستان غیر پر جبرہ سانی کے لیے مجبور نہ کر سکی۔

ایک یہ مسلمان تھے اور ایک ہم میں کہ یقین و اطمینان کا مرتبہ و مقام تو درکنار حقیقی معنوں میں مسلم بھی نہ رہے۔ مسلم کے معنی تو فرماں بردار کے ہیں، لیکن ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت سے آزاد نہ ہو۔ ہمارے قلوب و اذبان حرارت ایمان سے خالی اور اعمال حسن کردار سے محروم ہیں۔ ہم غیر اسلامی رسوم و رواج اور ایمان کش بدعات و خرافات کے دام بم رنگ زمیں میں مکمل طور پر گرفتار ہیں۔ مختصر یہ کہ ہماری زندگیوں کو دور اول کے مسلمانوں کی زندگیوں سے دور کی بھی کوئی نسبت نہیں ہے، خوش فہمی اور خود فریبی کی بات دوسری ہے۔ یہ حقیقی ایمان اور اسلام سے بے اعتنائی اور مشرکانہ افعال ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم محکومیت اور ذلت و رسوائی کی زندگی گزار رہے ہیں اور اس حالت پر اس طرح قانع و مطمئن ہیں گویا مومن غلامی کے لیے اور کافر و مشرک حکم رانی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

وائے ناکافی متاع کارواں جاندار با کارواں کے دل احساس زیاں جا ملتا

ایمان میں کمی و بیشی کا مسئلہ

ایمان میں کمی و بیشی بھی ہمارے یہاں ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ

ایمان کے اندر کمی و بیشی نہیں ہوتی، کیونکہ ایمان جن اجزا سے مرکب ہے ان پر ہر شخص کا ایمان برابر ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اسی بات کے قائل ہیں۔ ابن البرزازی نے اپنی المناقب میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

”ایمان خواہ آسمان والوں کا ہو اور خود زمین والوں کا، برابر ہے۔ اولیں و

آخریں اور انبیاء و رسل کا ایمان بھی کیساں ہے کیونکہ ہم سب خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں۔ اور فرائض بہت قسم کے ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ جو سب کے لیے ہے۔ اسی طرح کفر بھی کیساں ہے گو کہ کافروں کی بہت قسمیں ہیں۔ انبیاء و جن چیزوں پر ایمان لائے ہم سب ہی ان پر ایمان رکھتے ہیں البتہ ثواب اور طاعات میں ان کو ہم پر برتری حاصل ہے۔“

امام بخاری اس نقطہ نظر کے شدید مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ”صحیح“ میں کسی ایسے آدمی کی روایت نہیں لی ہے جو یہ کہتا ہو کہ ایمان قول و فعل سے مرکب نہیں، اور اس میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔

ایمان میں کمی و بیشی کے مسئلہ میں یہ دو مختلف نقطہ نظر کیوں وجود میں آئے ہاں پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف ایمان کی بالکل قانونی تعریف کی جارہی ہے اور دوسری طرف اس کی حقیقی اور معنوی توجیہ۔ جو لوگ ایمان کو صرف تصدیق قلبی اور اقرار لسانی سے مرکب قرار دیتے ہیں ان کی نظر میں ایمان میں کوئی کمی و بیشی واقع نہیں ہوتی اور اس اعتبار سے یہ درست بھی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ دل میں تصدیق بھی ہو اور تکذیب بھی یہ ناممکن ہے۔ تصدیق نام ہی ہے ایسی باطنی کیفیت کا جس میں تکذیب کا شائبہ نہ ہو۔ اور اگر واقعہ تصدیق کے ساتھ تکذیب بھی شامل ہے تو یہ شک کے ہم معنی ہے اور تصدیق کے ساتھ شک کا اجتماع محال ہے۔ کسی بھی تصدیق میں کمی کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں شک شامل ہو اور شک کے شامل ہوتے ہی تصدیق باقی نہیں رہتی۔ لہذا معلوم ہوا کہ دل میں یا تو جھوٹ ہوگا یا شک یا سچ۔ پہلی دونوں صورتیں کفر و نفاق کے درجہ میں آتی ہیں، صرف آخری صورت

کو ایمان کہتے ہیں اور اس میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔

جو لوگ تصدیق اور اجمال کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں ان کے نزدیک ایمان میں کمی و بیشی ہوتی ہے اور یہ بات بھی درست ہے، کیونکہ عمل میں کمی و زیادتی ایک بدیہی بات ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح نقطہ نظر یہی ہے کہ ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے ایمان کے معنی تصدیق ہی کے نہیں بلکہ ایقان کے بھی ہیں جیسا کہ ہم ایمان کے لغوی معنی کی وضاحت میں بیان کر چکے ہیں۔ اگر ایمان کو ایقان کے معنی میں لیا جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ایقان میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ ایقان سلمیٰ کے مرادف ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ علم میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان علم سے وجود پاتا ہے اور عمل سے اس کی تکمیل ہوتی ہے چنانچہ ہر علم نافع اور عمل صالح سے اس میں افزائش ہوتی ہے: اور ہر علم غیر نافع اور عمل غیر صالح سے اس کے اندر کمی واقع ہوتی ہے جس طرح ایک بیج کی نشوونما کے لیے مٹی، پانی اور موزوں ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ایمان کے نشوونما کے لیے قلب سلیم، علم نافع اور عمل صالح درکار ہوتا ہے۔ بیج کو اگر مناسب مٹی، وافر پانی اور موزوں ہوا نہ ملے تو وہ ضائع ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح اگر ایمان کو قلب بیدار، علم نافع اور عمل صالح کی آغوش نہ ملے تو وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے۔

ایمان کا تعلق خبر اور نظر دونوں سے ہوتا ہے۔ جب خبر کے ساتھ نظر کا تعلق بھی شامل ہو جاتا ہے تو پھر ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ خبر کا تعلق قرآن حکیم کے مسلسل مطالبہ اور اس میں غور و تدبیر سے حاصل ہوتا ہے، اور نظر کا تعلق آثار کائنات کے مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ آثار کائنات کا ہر مشاہدہ شاہد کی نظر میں عین الیقین کی شمعیں جلائے اور "خبر" کی تصدیق کرتا ہے، اور یہی ایمان کی زیادتی ہے۔ جو شخص قرآن حکیم میں فکر و تدبیر کا عادی نہیں ہے اور آثار کائنات کا مشاہدہ بھی نہیں کرتا اس کے قلب و نظر معرفت حق کے جلوؤں سے صحیح معنوں میں آشنا نہیں ہوتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ایمان میں رفتہ رفتہ اضمحلال اور افسردگی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جسے ہم ایمان میں کمی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بہر حال علم کے بڑھنے سے ایمان بڑھتا ہے جب کہ اس کے ساتھ عمل صالح کا نور بھی ہوتا ہے، اور علم کے گھٹنے سے ایمان گھٹتا ہے جب اس کے ساتھ اعمال غیر صالحہ بھی شامل ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اعمال غیر صالحہ کی کثرت ایک مومن کے قلب کو سخت اور بے نور کر دیتی ہے:

هُم بِالْكَفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ (آل عمران: ۱۷۰)

وہ آج ایمان کے مقابلے میں کفر سے زیادہ قریب تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان ہر حالت میں کیساں کیفیت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ مختلف حالات کے تحت اس کے اندر تغیر و تفاوت ہوتا رہتا ہے امام غزالی فرماتے ہیں:

” اس صورت میں کہ لفظ ایمان کے معنوں میں عمل بھی داخل ہو تو ظاہر

ہے کہ اعمال سے اس میں کمی و بیشی ضرور ہوگی، اور یہ بات کہ اس کی تاثیر

اس ایمان میں بھی ہوتی ہے کہ نہیں جس کو صرف تصدیق کہتے ہیں اس میں

اختلاف ہے اور ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس میں بھی تاثیر ہوتی ہے۔ تیسرا

اطلاق یہ ہے کہ ایمان سے مقصود وہ تصدیق یقینی ہو جو کشف اور شرح حمد

اور نور بصیرت کے مشابہہ کے طور پر ہو۔ یہ قسم دوسری اقسام کی نسبت

زیادتی اور کمی سے بے نیاز ہے۔ تاہم ہمارا قول یہ ہے کہ وہ امر یقینی جس میں

شک نہ ہو اس میں بھی نفس کا اطمینان مختلف ہو کر رہتا ہے، مثلاً ایک بات یہ

ہے کہ دو ایک سے زیادہ ہے، اور دوسرے یہ کہ عالم مخلوق اور حادث ہے

ہر چند ان دونوں میں سے کسی میں بھی شک نہیں مگر جیسا اطمینان پہلی بات

پر ہے ویسا دوسری بات پر نہیں ہے۔ یہی حال دوسرے تمام یقینی امور کا

ہے کہ اگرچہ وہ واضح ہوتے ہیں مگر ان پر نفس کے اطمینان کی حالتیں مختلف

ہو کر تھیں۔ اس سے واضح ہے کہ ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے باب

میں اسلاف کا نقطہ نظر ہی درست ہے۔^{۱۷}

۱۷ احیاء العلوم ج ۱ ص ۲۷ (مطبع نول کشور)

قرآن پاک کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے :

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۝ (محمد: ۱۷)

اور جن لوگوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا ان کی ہدایت (سوجھ بوجھ) اللہ نے زیادہ کی اور ان کو ان کا تقویٰ بخشا۔

دوسری جگہ آیا ہے :

فَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ اٰیٰتُكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهَ اٰیٰمًا ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

فَزَادَتْهُمْ اٰیٰمًا وَهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (توبہ: ۱۲۲)

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ تم میں سے کس کا ایمان اس (سورہ) نے زیادہ کیا؟ پس جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا ایمان اس نے یقیناً زیادہ کیا اور وہ اس سے خوش ہیں۔

ایک اور جگہ آیا ہے :

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ ۗ وَمَا مَرَّ اَدْهُمُ اِلَّا اٰیْمَانًا ۙ وَتَسْلِيْمًا ۙ

اور جب مومنین نے جنگ آزماگروہوں کو (بالمقابل) دیکھا تو کہا: یہ تو وہی چیز ہے جس کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ فرمایا تھا، اور سچ کہا اللہ اور اس کے رسول نے اور اس سے ان کا ایمان (یقین) اور تسلیم (جذبہ اطاعت) اور بڑھ گیا۔

ان آیات قرآنی سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان ہر حال میں یکساں

نہیں ہوتا بلکہ مومنین کی ایمانی حالت کے لحاظ سے یہ گھٹتا بڑھتا ہے اور یہی مذہب حق ہے۔

امام ابوحنیفہ ایمان میں کمی اور بیشی کو اگر تسلیم نہیں کرتے ہیں تو اس کی بھی ایک وجہ

ہے اور اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ امام صاحب فقہ (قانون داں) بھی تھے اور قاضی

(منصف) بھی۔ انھوں نے ایمان میں کمی اور بیشی کا جائزہ بالکل ایک قانون داں اور قاضی

کی حیثیت سے لیا۔ ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا

محض قول کا۔ ظاہر ہے کہ ایک قانون داں کے زاویہ نگاہ سے ایمان صرف قول سے عبارت

ہوگا، کیونکہ قول کسی کمی بیشی کا محل نہیں ہو سکتا جب کہ عمل میں مختلف احوال و کوائف کے تحت کمی بیشی ہوتی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس مسئلہ پر بہت عمدہ بحث کی ہے، فرماتے:

”امام ابو حنیفہ نے اس مسئلہ کو بالکل اس نگاہ سے دیکھا جس نگاہ سے ایک قاضی اور فقیہ ان مسائل کو دیکھتا ہے یا جس نگاہ سے امیر اسلام، وراثت و نکاح اور خراج و جزیہ وغیرہ کے معاملات اور سیاسی مسائل کے فیصلے کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ شخص مومن ہوگا جو اقرار کرے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے، اور مسلمانوں کے شعار اور ان کے ظاہری حالات میں ان کے طریقہ پر ہو۔ ایسے اشخاص کے متعلق یہی حکم لگایا جائے گا کہ یہ مسلمان ہیں۔ ان میں صادق و کاذب اور متقی و فاجر کی تفریق نہیں کی جائے گی۔ اس قانونی ایمان میں سب برابر ہوں گے، اس میں کمی بیشی واقع نہیں ہوتی، کیونکہ قانون اور سیاست کی نگاہ خدا اور بندے کے درمیان کے باطنی احوال و معاملات کی جستجو نہیں کرتی۔ یہ معاملات تو صرف روز قیامت بے نقاب ہوں گے (دیکھئے سورہ الحدید)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک قاضی کی نظر میں ایمان سے صرف وہ ایمان مراد ہوتا ہے جو ہماری عدالتوں میں احکام قضا کے اجراء و نفاذ کی بنیاد بن سکے۔ اس کو ایمان کی حقیقت، اس کے اجزائے ترکیبی اور اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات سے کوئی بحث نہیں ہوا کرتی۔ اب اگر قرآن ایمان میں کمی اور زیادتی کی بات کرتا ہے تو اس تصریح کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے اور قرآن اس سے ایک بالکل ہی مختلف بات کہتا ہے۔

صفات مومن

اس کائنات ہستی کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کچھ مخصوص خصائص اور صفات نہ

رکھتی ہو۔ انہیں خصائص کی بنیاد پر ہم نہ صرف اس چیز کی اصلیت و ماہیت کا ادراک کرتے ہیں بلکہ اسے دوسری اشیاء سے ممتاز بھی کرتے ہیں۔ یہ خصائص بعض تو خارجی نوعیت کے ہوتے ہیں اور بعض داخلی نوعیت کے۔ ایک سیب کو لے لیجئے۔ یہ کچھ ظاہری صفات مثلاً مخصوص شکل و صورت، وضع و سائز اور رنگ و بو، اور کچھ باطنی صفات مثلاً جوہر اور مزہ کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم سیب کی ان ظاہری اور باطنی صفات خصوصاً سے واقف ہوں اور پھر بھی پھلوں کے ڈھیر میں سے ایک سیب کو نکال نہ لیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اشیاء کا تصور ان کی صفات سے وابستہ ہے۔ ہم جب بھی ایک سیب کا تصور کریں گے لازماً ہمارے ذہن میں اس کی ظاہری و باطنی صفات ہی آئیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اشیاء کا علم ان کے صفات ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ہم صفات سے متعلقہ ان کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے ہیں۔

یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ ہر انسان کچھ ظاہری اور کچھ باطنی اوصاف رکھتا ہے۔ یوں تو جوہر انسانیت کے اعتبار سے ہر انسان یکساں ہے، لیکن ظاہری اور باطنی خصائص کے اختلاف کی وجہ سے ہر انسان کی حیثیت جداگانہ ہے۔ انہیں جداگانہ تصویروں کی بنیاد پر ہم ایک انسان کو دوسرے سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ ایک شاعر اور غیر شاعر ایک سرمایہ دار اور اشتراکی، ایک جمہوریت پرست اور مطلق العنان انسان کے درمیان جو چیزیں خط اعتبار کی کمی پتی ہیں وہ ظاہری اور باطنی خصائص و اوصاف ہی تو ہیں ورنہ ہر انسانیت وہ سب برابر ہیں۔ ہم کسی ایسے آدمی کو شاعر نہیں کہہ سکتے جو شعر گوئی کی ایک مخصوص وضع و انداز نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح ہم کسی ایسے شخص کو شاعر کی نہیں کہہ سکتے جو ایک مخصوص طرز فکر اور طرز عمل کا مالک نہ ہو یعنی جس کے ذہن و دماغ پر طبقاتی کشمکش اور معاشی تصورات کا بڑی غلبہ ہو۔

یہی حال ایک مومن و کافر کا بھی ہے۔ دونوں میں ہر اعتباراً انسانیت کوئی فرق نہیں لیکن پھر بھی ہم ایک کو مومن اور دوسرے کو کافر کہتے ہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ دونوں کا مطمح نظر، انداز فکر اور طرز زندگی جداگانہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مومن و کافر کے

درمیان حقیقی وجہ امتیاز چند اوصاف و خصائص ہیں۔ یہ اوصاف کیا ہیں ان کو جان لینا ضروری ہے۔

قرآن پاک میں ایک صادق و فخلص مومن کی صفات کو متعدد جگہوں پر مختلف پیراؤں میں بیان کیا گیا ہے۔ ان صفات کے آئینہ میں ایک راست باز مومن کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے اور ہم اس تصویر کی مدد سے ایک مومن اور غیر مومن میں فرق و امتیاز کر سکتے ہیں۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ ان صفات حسنہ کا ذکر کریں گے جو ایک حقیقی مومن کی امتیازی صفات کہی جاسکتی ہیں۔

یقین محکم اور جہد و ایثار

قرآن مجید یقین محکم، جہد مسلسل، اور ایثار جان و مال کو ایک مومن کی نمایاں اور امتیازی صفات قرار دیتا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَزُوا بَأْوَانِهِمْ
جَهْدًا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ
الضَّالِقُونَ ﴿١٥﴾ (حجرات: ۱۵)

حقیقی مومن تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر کسی تنگ میں مبتلا نہ ہوئے، اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں سے اور اپنے مالوں سے جہاد کیا۔ دراصل یہی لوگ سچے ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک سچا مومن وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو صرف زبان ہی سے نہیں مانتا بلکہ دل کے کامل یقین کے ساتھ مانتا ہے۔ اس کے دامن یقین میں میں ریب و شک کا کوئی کاٹنا پیوست نہیں ہوتا، اور نہ ذہن و فکر کے آئینہ پر تردد کا خفیف غبار موجود ہوتا ہے۔ وہ یقین کی ایک ایسی مضبوط چٹان ہوتا ہے جس کو ریب و گمان کی کوئی تیز تندہ آندھی اپنی جگہ سے متزلزل نہیں کر پاتی۔

اس یقین محکم کا علی مظاہرہ ایثار جان و مال کی صورت میں ہوتا ہے۔ خواہ کوئی بھی

نظریہ زندگی ہو، اگر اس پر ایمان رکھنے والا شخص اس نظریہ کے غلبہ و اشاعت کے لیے جان و مال کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتا ہے تو اس کے صادق و مخلص ہونے میں بھلاکس کو شک ہو سکتا ہے؛

ایک مومن صادق کی زندگی بھی یقین و اثق، جہد و عمل اور ایثار جان و مال کا ایک دل کش و دل آویز مرقع ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک خدا کی راہ میں اس کے کلمہ کی سر بلندی اور اس کے نام کی عظمت و سرفرازی کے لیے اپنے مال سے، اپنی جان سے اور اپنے دماغ کی ساری قوتوں سے مصروف تک و تاز ہوتا ہے۔ وہ خانقاہیت اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار نہیں کرتا بلکہ ایک مرد جاں باز کی طرح رزم گاہ حیات میں ستیزہ کار رہتا ہے بقول اقبالؒ

جہاں میں اہل ایمان صورتِ خورشید جیسے ہیں اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

قرآن نے ایک مومن صادق کی جو تصویر پیش کی ہے یعنی یقینِ راسخ، جہد و عمل اور جان و مال سے قربانی، یہی تین چیزیں ایک سچے مومن کی زندگی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دنیا میں کسی نظریہ کو فتح و غلبہ صرف انھیں تین باتوں سے مل سکتا ہے۔ اگر کسی نظریہ زندگی کے ماننے والے ان تین صفتوں سے عاری ہیں تو یقین کر لیجئے کہ نامرادی اور خجالت اُن کا مقدر ہے، اور ایسا نظریہ زندگی کبھی انسانی سماج پر حکم رانی نہیں کر سکتا۔

یہی تین صفتیں تھیں جن سے صحابہ کی زندگیاں آراستہ تھی اور انھیں کے ذریعہ انھوں نے ہر غلبہ و کامرانی حاصل کیا۔ آج ان صفتوں سے مسلمانوں کی زندگیاں تہی دامن ہو چکی ہیں۔ ایمان کی ظاہری صورتیں تو آج مل جاتی ہیں، لیکن یقینِ محکم، عمل اور قربانی کی صفتیں کہاں؟ آج ان کی جستجو بھی بیکار ہے۔ یقین کی جگہ شک اور تردد، عمل کی جگہ بے حسی اور جمود، اور جاں کوشی و سرفروشی کی جگہ زانہ سازی و کم ہمتی نے لے لی ہے اور بہتوں نے خانقاہوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے، غلامی، ذلت و خواری اور عزت و مسکنت آج ہمارا مقدر بن چکا ہے۔

اقامت صلوة اور اتیان زکوٰۃ

جن صفات ثلثہ کا ہم نے اوپر کی سطروں میں ذکر کیا ہے، ایک مومن کی زندگی میں ان کی اولین نمود ارتقی اور استحکام جن ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے ان میں نماز اور زکوٰۃ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

قرآن پاک میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر مومن کی ان دو صفتوں یعنی نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ملتا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

طَسَّ تَد تَّلَکَ اَیُّ الْقُرَّانِ وَرِکْتَائِبِ مُبِیْنٍ ۝ هُدًی وَبُشْرٰی
لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُم یُؤْتُوْنَ ۝ (نمل: ۱-۳)

طس، یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں۔ ہدایت اور بشارت ہے ان مومنین کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اِنْتَا یُؤْمِنُ بِالْاٰیَاتِ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرُوْا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ
الْمَصَاجِحِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝

بیشک ہماری آیات پر وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں کہ جب ان کے ذریعہ انھیں نصیحت (السموہ: ۱۵) کی جاتی ہے تو وہ سن کر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، اپنے رب کی تسبیح و تمجید کرنے لگتے ہیں اور وہ کبر نہیں کیسے، ان کے پہلو خواہاں ہوں سے طلحہ ہوتے ہیں یاں طور کہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں، اور جو رزق ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کی ان دو صفتوں کا ذکر صرف ایجابی انداز میں نہیں کیا ہے بلکہ حکمی انداز میں بھی اس نے ان صفتوں کی طرف اہل ایمان کی توجہ جگہ جگہ مبذول کرانی ہے

مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ
سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بِنِعَةِ فِيهِ وَلَا خُلَّةٍ

(البقرہ: ۱۷۷)

تم ہمارے ان بندوں سے کہہ دو جو ایمان لائے ہیں کہ وہ نماز قائم کریں اور ہم نے جو رزق
انہیں دے رکھا ہے اس میں سے کھلے اور پوشیدہ دونوں طرح خرچ کریں اس دن کی
آمد سے پہلے پہلے جب نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی یاری و مدد دگاری (کام آئیگی)

دوسری جگہ فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۗ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۗ هُوَ اجْتَبَاكُمْ
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۗ مَلَّةً أَيْبِكُمْ
بِرُوحِهِمْ ۗ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ ذُرِّيَّةً مِّن قَبْلُ ۗ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ
الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۗ
فَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ
مَوْلَاكُمْ ۗ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿۷۸﴾

اے ایمان والو! تم کوٹھ اور سجدہ کیا کرو، اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلے کام کرو کہ تم
کو کامیابی نصیب ہو۔ اور اللہ کے راستے میں انتھک جدوجہد کرو۔ اس نے تم کو (اس
مناسب پہلوئے کے لیے) چن لیا ہے۔ اس نے تم پر دین (کے احکام میں) کوئی تنگی نہیں رکھی
ہے۔ یہ تمہارا رب، بڑا ہی مہربان اور مہربان کا دین و طریقہ ہے۔ اس نے (نزول قرآن سے) پہلے بھی
تمہارا نام مسلم ہی رکھا تھا اور اس دین (محمدی) میں بھی تمہارا ہی نام ہے تاکہ رسول تم پر گواہ
بنے اور تم دوسرے لوگوں پر حق شہادت ادا کرو۔ پس نازق تم کرو، اور زکوٰۃ دو، اور اللہ کا
دامن مضبوطی سے تھامے ہو۔ وہی تمہارا کارساز ہے، اور کیا ہی اچھا کارساز اور کیا
ہی عمدہ مددگار ہے۔

قرآن پاک میں جہاں کہیں مومن کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آپ کو اقامتِ صلوة اور اتینا زکوٰۃ کا ذکر ضرور ملے گا۔ تنبیہ یہی بات ان دو صفات کی اہمیت کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اقامتِ صلوة درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ مومن کا قلب خدا کی محبت یقینِ آخرت اور جذبہ شکر و امتنان سے معمور ہے۔ ایک مومن نماز پڑھ کر یہی نواظ ہرگز بنا ہے کہ عظمت و کبریائی اور اطاعت و معبودیت کے لائق صرف ایک خدا کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی نہیں جو ایک انسان کے نیاز و بندگی کا سزاوار ہو۔

ایک مومن کا دن میں پانچ بار ہر حالت اور ہر موسم میں اپنے پروردگار کے سامنے سر بسجود ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے مالکِ حقیقی سے سچی محبت کرتا ہے اور اس کے بے شمار احسانات کا معترف ہے۔ یہ احساسِ تشکر ہی تو ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے محسن کے آگے سر تسلیم خم کر دے، اس کا شکر بخالائے اس کی حمد و ثنا کرے اور اس طرح رشتہٴ بندگی کو مضبوط سے مضبوط تر کرے۔ فی الواقع یہی رشتہٴ نیاز و عبودیت اس جہانِ ناپیدِ کنار میں اسے حیران و سرگشتہ ہونے سے بچاتا ہے اور اس کو حقیقی منزلِ زندگی سے روشناس کرتا ہے۔ جہاں یہ رشتہٴ بندگی ٹوٹا پھر کوئی اسے سرگشتگی اور بے راہی سے بچا نہیں سکتا۔ فواہش و منکر سے بھری ہوئی اس دنیا میں یہی نماز ہے جو ایک مومن کے قلب و دماغ کو طہارت و پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ گویا یہ ایک چشمہٴ صافی ہے جس میں پانی بار نہانے کے بعد جسم و روح دونوں منسقا و مجلا ہو جاتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے جس میں آپ نے صحابہؓ سے فرمایا:

”اچھا بتاؤ، اگر کسی کے دروازہ کے پاس ایک نہر جاری ہو اور وہ اس میں سب روز پانچ بار نہائے تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل باقی رہے گا؟“ صحابہؓ نے عرض کیا: نہیں حضور اس کے جسم پر کوئی میل باقی نہیں رہے گا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا ایسی ہی مثال پانچ اوقات کی نمازوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ نماز پڑھنے والوں کی خطاؤں کو دور فرماتا ہے اور انہیں پاک و

صاف بناتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے لیکن اس کی زندگی فواحش سے آلودہ ہے تو وہ صحیح منوں میں نماز پڑھتی نہیں رہا ہے یا وہ نماز کے مقصد و مقہوم سے بالکل نا آشنا ہے۔ کیا طہارت کے ساتھ گندگی کا اجتماع ممکن ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں نماز ایک مومن کی سب سے نمایاں اور امتیازی علامت تھی اور اس کے ترک کو کفر کے مماثل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اسے گردش روزگار کا کرشمہ کہنے کے آج ترک نماز کے بعد بھی لوگوں کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور بہت سے تارکین صلوٰۃ ایسے بھی ملیں گے جن کو اصرار ہے کہ ان کو اہل ایمان کی صف اول میں جگہ دی جائے۔ کاش وہ سمجھتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ ایمان ان کے گھر کی جاگیر نہیں ہے کہ وہ خواہ کچھ بھی کریں اس پر ان کا قبضہ بہر صورت قائم ہے۔ ترک نماز کے بعد ایمان کا دعویٰ بے جان ہو کر رہ جاتا ہے اور بے جان دعوے انعام و اکرام کے مستحق نہیں ہوتے۔

یہ تو تارکین صلوٰۃ کا طرز عمل تھا جو مسلمان پانچ اوقات کی نمازیں ادا کرتے ہیں ان کی اکثریت بھی اپنی عملی زندگی میں تارکین صلوٰۃ سے کچھ زیادہ مختلف دکھائی نہیں دیتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز نام ہے چند ظاہری اعمال و رسوم کی ادائیگی کا اور جس نے یہ کر لیا وہ مصلتین کے زمرہ میں شامل ہو گیا خواہ اس کے انفرادی اور اجتماعی اعمال کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کسی عمل کو دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ خدا کو فی الواقع اپنا مالک و حاکم اور خود کو اس کا غلام سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ نہایت ہی بے خوفی اور دیدہ دلیری کے ساتھ ان افعال شنیعہ کا ارتکاب بھی کر گزرتے ہیں جن سے اللہ اور اس کے رسول نے نہایت ہی سختی کے ساتھ روکا ہے اور جس کے مرتکب کو عذاب جہنم کا سزاوار قرار دیا ہے۔ مصلتین کے اس طرز عمل کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ نماز کی حقیقت اور غرض و غایت سے بالکل بے خبر ہیں، اور دوسرا سبب ان کا یہ خیال خام ہے کہ چونکہ وہ مصلتی ہیں اس لیے خدا نے رحیم و کریم ان کی بد اعمالیوں کو اپنے دامن عفو و رحمت میں ڈھانپ لے گا۔ رحمت کے اس غلط تصور

لے متفق علیہ۔ علیہ آفتابہ کار شامہ ہے۔ بین العبد و بین الکفر ترک الصلوٰۃ۔ مسعودی جابر بن عبد اللہ
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نے آج عوام کی اکثریت کو محاسبہ آخرت سے بالکل بے خوف بنا دیا ہے۔

کاش وہ سمجھے کہ جس نماز کو ایک مسلم کا طفرائے امتیاز قرار دیا گیا ہے وہ جہاں ایک طرف نمازی کو خدا کی اطاعت و بندگی سکھاتی ہے وہاں دوسری طرف خود نمازی کا تزکیہ نفس بھی کرتی ہے، اسی لیے توفر مایا گیا ہے: ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والنکر (مغربوت: ۲۵)

(بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے)

نمازی طرح امتیاز کو توفر بھی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے۔ اگر وہ صاحب مال ہوتا ہے تو اپنے مال سے غریبوں کو مسکین اور دوسرے حاجت مندوں کی مدد کرتا ہے۔ حقیقت ایک مومن کے جو دو عطا کے پیچھے کوئی نفسانی غرض کارفرما نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف خدا کی محبت میں انفاق مال کرتا ہے، کیونکہ جو شخص خدا سے سچی محبت رکھتا ہے نامکن ہے کہ وہ اس کے بندوں کی محبت سے بے نیاز ہو۔ قرآن پاک نے مومن کے اس وصف کو بھی نمایاں طور پر بیان کیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَ اتَّقِ الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالسَّكِينِ وَ ابْنِ

السَّبِيلِ ۗ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۗ (بقرہ: ۱۷۷)

وہ صرف خدا کی محبت میں قربت داروں پر یتیموں پر مسکینوں پر مسافروں پر سائیلوں پر اور غلاموں کو قید غلامی سے چھڑانے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَ يَتِيمًا وَ اَسِيرًا ۗ اِنَّمَا

نُظِرْكُمْ لَوْ جِهَ اللّٰهِ لَا نُؤْتِيْكُمْ مِنْكُمْ جَزَاءً وَ لَا شُكْرًا ۗ (ہر: ۲۵)

وہ صرف خدا کی محبت میں مسکینوں یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ)

ہم تو تم کو صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تو تم سے اس کا کوئی معاوضہ لیتے

ہیں اور نہ ہی کسی شکر یہ کے خواستگار ہیں۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَ سَيُجِبُّهَا اللّٰهُ الَّذِي يُعْطِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۗ وَمَا لِاحِدٍ عِنْدَآءٍ مِنَ

بَعْمَةً تُجْزَىٰ إِلَّا لِبِغْيَاءٍ وَجْهٍ زَيْتٍ الْأَهْلِ ۖ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ﴿۱۴﴾ (میل: ۱۴-۱۵)

(جہنم سے) اس خدا ترس بندے کو مزدور بچالیا جائے گا جو اپنا مال صرف اس لیے خرچ کرتا ہے کہ (جب مال کی نجاست سے) خود کو پاک کرے۔ اس کے ذمہ کسی کا کوئی احسان نہیں ہوتا کہ مال خرچ کر کے اس کا بدلہ اتارے وہ صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضا جوئی میں اتفاق مال کرتا ہے۔ اور وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔

ایک حدیث قدسی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بندوں سے محبت کا سلوک کرتا ہے وہ گویا خدا سے محبت کرتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

”اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیماری پر سیڑھی نہ کی۔ وہ متعجب ہو کر کہے گا: میں تیری بیماری پر سیڑھی کیسے کرتا کہ تو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

خدا فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی؟ اگر تو اس کی مزاج پر سی کے لیے جاتا تو مجھے

اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا: اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا: بھلا ایسا کیسے ہو سکتا

ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا: کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا۔

اگر تو اسے کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض

کرے گا: بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے؟ تو تو خود پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا

لیکن تو نے اسے پانی نہ پلایا، اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔

خشیت قلب اور توکل علی اللہ

خشیت قلب اور توکل علی اللہ بھی مومن کی نمایاں صفات میں سے ہیں جیسا کہ قرآن مجید

میں ایک جگہ آیا ہے :

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا سُلِّتْ
عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝
الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيَمْتَدِرُونَ زَكَوَاتِهِمْ يُنْفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۝

بیشک مومن تو وہی لوگ ہیں کہ جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر کانپ جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، اور جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ رزق انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔

اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایثارِ زکوٰۃ کے ساتھ مومن کی جن دو نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ خشیتِ قلب اور توکل علی اللہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مومن کا قلب اللہ کی سطوت و جلال اور عظمت و کبریائی کے تصور سے ہر آن لرزاں و ترساں رہتا ہے۔ وہ خدا کا ذکر سن کر بے اثر نہیں رہتا بلکہ اس کے قلب و دماغ کا ہر تار لرزش ہو جاتا ہے۔ یہ خشیتِ قلب ہی ہے جو مومن کے اندر توکل علی اللہ پیدا کرتی ہے۔ حالات کیسے ہی بہت شکن صبر آزما اور پریشان کن ہوں وہ خدا کی ذات پر کامل یقین و اعتماد رکھتا ہے۔

توکل کا مفہوم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اور ناکاروں اور کم ہمتوں کا طرز عمل نہیں ہے بھلا ایک مومن کا اس نام نہاد توکل سے کیا واسطہ؟ قرآن بطور صفت مومن کے جس توکل کی بات کرتا ہے وہ جہد و عمل سے مراد ہے وہ کسی بھی مشکل وقت میں اور زندگی کے کسی بھی بزرگ موڑ پر جہد و جہد اور سعی و تدبیر سے غافل نہیں ہو۔ ابدہ جہد و عمل کے نتیجے کو خدائے بزرگ و برتر کے سپرد کر دیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس جہانِ حادثات کا کوئی حادثہ اور اس عالمِ آفرین کا کوئی واقعہ بھی اس کے حکم کے بغیر نہ وقوع میں آسکتا ہے اور نہ ہی دفع ہو سکتا ہے، نفع و نقصان اور کامیابی و ناکامی سب کا سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

توکل کی یہ اس شرط مومن کے قلب و دماغ کو طماننت بخشی ہے اور اس کے عزم و محکم دلائل سے مزین و متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہمت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ کیا جو شخص اپنا معاملہ خالق ارض و سما، مالک بحر و بر اور حاکم موجوداتِ کل کے سپرد کر دے وہ بھی کبھی خسران و نجات سے دوچار ہو سکتا ہے؟ اور اراق تاریخ کا فیصلہ ہی ہے کہ جس فرد اور جس قوم نے خستت اور توکل علی اللہ کے صحیح جذبے سے کام لیا وہ کبھی ناکام و نامراد نہیں رہی۔ مومن کے توکل کی ایک عمدہ تصویر یہ آیت قرآنی ہے:

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝
 إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَخْذُكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي
 يَنْصُرْكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (آل عمران: ۱۵۹، ۱۶۰)

پس جب تم پختہ عزم کرو تو اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو جائے تو پھر تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہاری حمایت سے دست بردار ہو جائے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے گا۔ اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کا توکل عزم و ارادہ اور سعی و جہد سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ بہر ممکن تدبیر کے بعد جب وہ کسی کام کا عزم کر لیتا ہے تو پھر خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے عمل کی راہ میں کام فرما سہا جاتا ہے۔

گناہ کبیرہ سے اجتناب، عفو و درگزر اور مشاورت

اقامتِ صلوة، ایثارِ زکوٰۃ اور توکل کے ساتھ ہی گناہ کبیرہ سے اجتناب، عفو و درگزر اور باہمی معاملات میں مشورت بھی ایک مومن کی صفاتِ حسنہ میں داخل ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

فَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَّاءُ الصَّيُورِ الدُّنْيَا، وَمَاعِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَ
 أَنْظِلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ وَالَّذِينَ يَخْتَفُونَ بَيْنَ
 الْأَيْدِي وَالْفَوَاحِشِ إِذًا مَا غَضِبْنَا لَهُمْ يَغْفِرُونَ ۚ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآهَرَهُمْ شُرَاةَ بَيْنَهُمْ وَصَارَتْ قُنُومًا يُنْفِقُونَ ۝

(شوری: ۳۶ تا ۳۸)

تم کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا (چند روزہ) مال و متاع ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، اور جو بڑے بڑے گناہوں اور فواحش سے اجتناب کرتے ہیں، اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں، اور جو اپنے رب کے ارشادات کی تعمیل کرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور ان کا ہر کام باہم مشورہ سے ہوتا ہے۔ اور جو رزق ہم نے ان کو دے رکھا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

ایک مومن دیدہ و دانستہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا، کیا وہ ایمان کی روشنی کے بعد بھی فواحش کی تاریکیوں کا شکار ہوتا ہے؟ وہ حتیٰ الوسع یہی کوشش کرتا ہے کہ اس کا دامن ایمان، افعالِ بد سے میلانا ہو۔ برے افعال کا ارتکاب تو درکنار ایک مومن کے قلب و دماغ میں کسی برائی کا خیال بھی آجاتا ہے تو وہ متنبہ ہو جاتا ہے اور فوراً توبہ و استغفار کرتا ہے، گویا اس کا قلب ایک ایسا نازک آئینہ ہوتا ہے جو گناہ کی پرچھائیں کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ وہ گناہ کبیرہ کی شرابِ تند کی تاب لاسکے۔

ایک مومن عفو و درگزر کا پیکر ہوتا ہے۔ عفو کے بالمقابل جو جس غضب اور جذبہ انتقام ہے۔ یہ نفسِ انسانی کا ایک حیوانی خاصہ ہے۔ جس انسان کے قابو میں اس کا نفس نہیں ہوتا وہ زندگی کے تقریباً ہر معاملے میں اس جذبہِ نفسانی سے مغلوب ہو جاتا ہے بالخصوص اس وقت جب اس کی انا اور جذبہِ خود ستائی مجروح ہوتا ہے۔ ادھر جذبہِ انا مجروح ہوا اور ادھر اس کے دل میں شدید نفرت و عداوت اور جو جس انتقام کی آگ شعلہ زن چلتی ہے، دوسرے لفظوں میں وہ مکمل طور پر حیوان صفت ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس ایک مومن کا نفس اس کے قابو میں ہوتا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی اسے بے لگام اور مطلق العنان نہیں ہونے دیتا کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے کہ اگر نفس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی گئی تو پھر قلب و روح کی دنیا فتنہ و فساد

سے محفوظ نہیں رہ سکتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مومن کا نفس بالکل بے حس ہو جاتا ہے۔ ایک مومن کو بھی بتقاضائے بشریت کبھی غصہ آجاتا ہے لیکن وہ غصے میں بے قابو نہیں ہو جاتا جس طرح وہ غصہ ہوتا ہے اسی طرح فراخ دلی کے ساتھ عفو و درگزر کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ اس کے غصہ کا وقت طویل نہیں ہوتا، ادھر غصہ آیا اور ادھر عفو و درگزر کی باہیں دراز ہو گئیں جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

وَ الْكَافِرِينَ الْغَائِبِينَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ - وَاللَّهُ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِينَ ۝ (آل عمران: ۱۲۲)

وہ غصہ کو پی جاتے ہیں، اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں، اور اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔

مومن نہ خود سہ ہوتا ہے اور نہ خود رائے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے پر اس طرح نظر ڈالتا ہے جیسے یہ اس کا تنہا معاملہ نہ ہو۔ اسی لیے وہ اپنے تمام معاملات میں باہم دگر مشورت کو ضروری خیال کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کامل ہے اور وہ خطا سے محفوظ اور خواہشات نفسانی سے پاک ہے۔ اگر کوئی شخص تنہا اپنی عقل اور صوابدید کی بنیاد پر کسی معاملے میں کوئی اقدام کرتا ہے تو لغزش فکر و عمل سے مامون رہ جانا ممکن نہیں ہے۔ اگر معاملہ انفرادی کے بجائے اجتماعی ہے تو پھر غلط اقدام کے نتائج بھی اتنے ہی دور رس اور ہلاکت آفریں ہوں گے۔ اسی لیے ایک مومن کسی معاملہ میں سبھی خواہ وہ انفرادی نوعیت کا ہو اور خواہ اجتماعی، اپنے دوسرے رفیقوں سے ذکر و مشورت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا ہے۔ یہ طرز عمل فی الواقع اس کے قلب کی طہارت، جذبہ اشتراک و تعاون اور عجز و انکسار کی علامت ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

ایک مومن خود بھی معروف پر عمل کرتا ہے اور منکر سے حتی الامکان بچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے انسانوں کو بھی نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے تاکہ

خیر غالب ہو اور شرمغلوب ہو۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔ وہ خود عاشق خیر ہوتا ہے اس لیے وہ دوسروں کی زندگی میں بھی خیر کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس بخیل دولت مند کی طرح نہیں ہوتا جو مال و زر کی کثرت کے باوجود کسی حاجت مند کی حاجت روائی نہیں کرتا۔ وہ اس حاسد امیر کی طرح بھی نہیں ہوتا جو خود تو ٹوٹتی چاہتا ہے لیکن دوسروں کو صاحب مال و زر ہونا نہیں دیکھ سکتا، وہ اس فیاض امیر کی طرح ہوتا ہے جو اپنی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے تاکہ اس کے گرد و پیش میں کوئی شخص محروم اور نامراد نہ رہ جائے۔

ایک مومن کسی حال میں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام سے غافل نہیں ہوتا کیوں کہ خیر سے محبت اور شر سے نفرت اس کی فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ شر اور گناہ کو فروغ پاتا ہو اور دیکھے اور خاموش رہ جائے، اگر خاموش رہ جائے تو وہ صحیح معنوں میں مومن نہیں ہے۔ قرآن پاک میں مومن کے اس وصف کو متعدد آیتوں میں نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ
يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ
سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰۱﴾ (سورہ توبہ: ۱۰۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و دمازیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں، اور ناز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ اللہ عنقریب ایسے لوگوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے گا۔ بیشک اللہ قدرت والا حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۱۳﴾
(آل عمران: ۱۱۳)

وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں پیش قدمی کرتے ہیں اور یہی لوگ نیکو کاروں میں ہیں۔ ایک اور جگہ آیا ہے:

الَّذِينَ يَبُوءُونَ الْعَهْدَ وَنَالُوا الْحَمْدَ وَنَالُوا التَّسَامُحُونَ التَّرْكَعُونَ الشَّجِدُونَ
الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ
اللَّهِ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (توبہ: ۱۱۲)

(مومنوں کی صفات یہ ہیں) توبہ گزار، عبادت گزار، خدا کی حمد و ثنا کرنے والے، وہ رکھنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے والے، اچھی باتوں کا حکم دینے والے اور بری باتوں سے روکنے والے، اور حدودِ الہی کی حفاظت کرنے والے، اور ایسے مومنوں کو تم (اسے نبی) بشارت دے دو (جنت اور رضائے الہی کی)

اس آخری آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ہی مومن کی دوسری صفات کا بھی ذکر آیا ہے یعنی وہ توبہ کرنے والا، اطاعت گزار، خدا کی توصیف و تجید کرنے والا، رکوع و سجدہ کرنے والا اور حدودِ الہی کی حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مومن صرف دوسروں کو ہی توبہ و انابت، اطاعت و فرماں برداری، حمد و عبادتِ الہی اور حدودِ شریعت کی پابندی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ خود بھی ان باتوں پر صدق دل کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

ایک مومن کو جب اللہ زمین پر غلبہ و اقتدار عطا کرتا ہے تو اس وقت بھی وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے سے غافل نہیں ہوتا بلکہ زمین پر غلبہ و اقتدار حاصل ہو جانے کا وہ مطلب ہی یہ سمجھتا ہے کہ مخلوقِ خدا کو اچھی باتوں کی تعلیم و تلقین کرے اور انہیں بری باتوں سے روکے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا
الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلَّهِ
عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (حج: ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار عطا کریں گے تو وہ نافرمان کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے، اور اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کو جب اللہ حکومت عطا کرتا ہے تو اقامتِ صلوة، ایثار، زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ تین باتیں اس کے فرائضِ منصبی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی مومن تختِ حکومت پر متمکن ہونے کے بعد ان فرائض کی انجام دہی سے غفلت برتتا ہے تو اس کی حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت نہیں کہا جاسکتا ہے خواہ اس کے حدود و مملکت میں چند شرعی قوانین ہی کیوں نہ نافذ ہوں۔

صبر، صدق، قنوت، انفاق اور استغفار

صبر و ثبات، راست بازی، حق گوئی، فراں برداری، انفاق، اور توبہ و استغفار ایک مومن کی زندگی کے وہ ابدار موتی ہیں جو اس کے آئینہ حیات کو صیقل کرتے ہیں اور اس کو رعنائی و زیبائی اور تابندگی عطا کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں مومن کے ان اوصافِ حسنہ کو درج ذیل الفاظ میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَرَبَّنَا عَذَابَ
النَّارِ ۝ الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُتَوَقِّئِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ
بِالْاَسْحٰرِ ۝ (آل عمران: ۱۷۶)

یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے پس تُو ہمارے گناہوں سے دُگڑ فرما اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچالے (یہ لوگ ان صفات کے حامل ہوتے ہیں) بہر حال میں ثابت قدم رہنے والے، راست باز، فراں بردار، (راہِ خدا میں) خرچ کرنے والے اور جنگِ صبح و توبہ و استغفار کرنے والے۔

ایک مومن کی زندگی صبر و ثبات کا پیکر ہوتی ہے۔ حوادثِ روزگار کیسے ہی صبر آزما ہوں، حالات کیسے ہی ناموافق اور بہت دشمن ہوں، اور اسبابِ ملامت کتنے ہی کمزور

اور ناکافی ہوں، وہ نہ تو ہمت ہار کر بیٹھتا ہے اور نہ اس پر کوئی خوف و غم طاری ہوتا ہے اور نہ وہ کم ہمتی اور بزدلی ہی کا مظاہرہ کرتا ہے، غرض یہ کہ کہیں سے بھی اس کے پلے استقامت میں تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہر ابتلا و آزمائش کے وقت ایک سنگی دیوار کی طرح ثابت و قائم رہتا ہے۔ قرآن پاک میں اس حالت ایمانی کا نقشہ ایگٹ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

وَكَايِنَ مِنَ تَيْبٍ قُتِلَ ۖ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ ۖ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فُجُؤٌ سَابِغٌ ۖ اللَّهُ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿۱۲۶﴾ (آل عمران: ۱۲۶)

اور کتنے ہی انبیاء ایسے گرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا ترسوں نے (اللہ کی راہ میں) قتال کیا ہے۔ اس راہ میں پیش آنے والے مصائب کی وجہ سے نہ تو انہوں نے ہمت باری اور کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ کیا، اور نہ ہی وہ اپنے حریف سے دبے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”سچا مومن وہ ہے جو شدتوں اور مصیبتوں میں نہ تو بے ہمت ہو، نہ کمزور پڑے اور نہ کسی حال میں بھی ظالموں کے آگے عاجز و بے چارگی کا اظہار گوارا کرے۔ قرآن کہتا ہے وحن، ضعف اور استکانات للخصم اس میں نہیں ہو سکتی۔ وحن یہ ہے کہ بے ہمت ہو کر بیٹھ رہے۔ ضعف یہ ہے کہ میدان میں نکلے مگر کمزوری دکھائے۔ استکانات للخصم یہ ہے کہ لاچار ہو کر حریف کے آگے گرا گرانے لگے“

حقیقت یہ ہے کہ عاجز و متزلزل اور بے بسی و بے چارگی کا نام صبر نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن جس صبر کی تعلیم دیتا ہے اس میں علوئے ہمت، جرات

وجہاں مردی، قوت برداشت اور ثبات واستقامت جیسی صفات داخل میں لیں۔ ایک حدیث رسول سے صبر کے مفہوم پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لا تلتثوا لقاء العدو واسئلو الله العافية فاذا القتيموهم فاصبروا
واعلموا ان الجنة تحت ظلال السيوف

دشمن سے ٹھہری کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت چاہو مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر ثابت قدم رہو اور خوب سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

جہاد زندگی میں ایک مومن کی متاع گراں بہا یہی صبر ہے۔ یہی اس کا وہ ہتھیار ہے جس سے وہ مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ وہ مصائب و آلام کے ہر جرح و تلخ کو اس طرح گوارہ کر لیتا ہے جیسے یہ مصائب نہ ہوں شہد و شکر کے جام شیریں ہوں، وہ حزن و غم کی یورش میں بھی اس طرح مسرور اور شادمان رہتا ہے جیسے غم کی بواؤں نے اس کے غنچہ قلب کو چھوا تک نہیں، نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی وہ اس طرح آسودہ قلب اور مطمئن خاطر رہتا ہے جیسے لیل و نہار کی کوئی گردش بھی اس کے خلاف نہ ہو۔

ایک مومن کی زندگی دراصل ایک صابر سپاہی کی زندگی ہوتی ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ میدان کارزار میں ایک کامیاب سپاہی کون ہوتا ہے؟ کیا وہ جس کے قدم بندوق کی ایک گولی اور توپ کے ایک گولے کی آواز سن کر پیچھے ہٹ جائیں؟ کیا وہ جو سروسامان جنگ کی قلت اور جنگ آزاؤں کی قلت تعداد کے باعث ہمت ہار کر راہ فرار ڈھونڈنے لگے؟ کیا وہ جو چند گھنٹوں کے لیے بھی بھوک اور پیاس کی تکلیفیں برداشت نہ کر سکے؟ آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ ایسا سپاہی ناسزاوار جنگ ہے۔ سپاہی تو حقیقی معنوں میں وہی ہے جو بندوق کی گولیوں اور آگ اگلتی ہوئی توپوں کی گولہ باری میں بھی ثابت قدم رہے،

۱۔ ملاحظہ ہو آل عمران - ۲۰۰، بقرہ - ۲۵۰، انفال - ۲۶۵، بقرہ - ۲۴۹، محمد - ۳۱، بقرہ - ۱۵۵۔

۲۔ موطا (امام مالک)

جو افراد اور سامان جنگ کی قلت سے ہر سال نہ ہو، اور جو بھوک اور پیاس کی اذیتوں کو برداشت کر سکے، دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کامیاب سپاہی وہ ہے جو صابر ہو۔ میدان کارزار میں ایک مومن کا ترانہ جان نواز یہی ہے:

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكَافِرِينَ ۝ (بقرہ: ۲۵۰)

اے ہمارے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر، (میدان جنگ میں) ہمارے قدموں کو چاڑھے، اور

کافروں پر ہم کو فتح عطا فرما۔

ایک مومن صادق و حق گو بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی حق گوئی سے انحراف نہیں کرتا خواہ اس حق گوئی کا نتیجہ اس کے حق میں کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ وہ جان و مال کا ہر نقصان گوارہ کر سکتا ہے لیکن سچائی کی راہ سے منہ موڑنا اس کے لیے ناممکن ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس جہان فانی کا ہر نفع و نقصان عارضی ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ آخرت کی جاوداں زندگی پر جوتی ہے۔ اسی زندگی اور اس کے نفع کا یقین اسے صداقت کی راہ پر قائم رکھتا ہے، اور اس راہ میں پیش آنے والی ہر مصیبت کو اس کے لیے آسان اور قابل برداشت بنا دیتا ہے۔

اطاعت و تسلیم کی خواہی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے۔ وہ اس وفادار اور اطاعت شعار غلام کی طرح ہوتا ہے جو اپنے آقا اور مالک کے اشارہ چشم دایر و کا منتظر رہتا ہے اور مالک کا حکم پاتے ہی اسے اس طرح ہنسی نوشی بجالاتا ہے جیسے اس کی کوئی دلی مراد برآئی ہو، اور جب وہ کسی کام سے اس کو روک دیتا ہے تو اس سے اس طرح رک جاتا ہے جیسے اس کے قدموں میں کسی نے زنجیر ڈال دی ہو۔ فی الواقع ایک مومن صادق کی زندگی سزا یا اطاعت اور فرمان برداری ہوتی ہے۔ اس کے لغت حیات میں حکم عدولی نام کا کوئی لفظ مرقوم ہی نہیں ہوتا۔ اطاعت و فرمان برداری کے جذبہ سے وہ اس درجہ سرشار ہوتا ہے کہ ادھر خدا حکم دیتا ہے اسلحہ (جھک جاؤ) اور ادھر تیدہ پکاراٹھتا ہے اسلحہ لسب العلمین (میں دونوں جہان کے پروردگار

کے آگے جھک گیا)

انفاق مال کی صفت بھی ایک مومن کے وجود کا ایک جوہر گراں مایہ ہے۔ حب مال اور جمع مال جو بدترین خصلت انسانی ہے، ان سے وہ بالکل پاک ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حب مال، نکاح مال اور جمع مال کی دھن ہی ایک انسان کو خدا سے غافل بنا دیتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جمع مال مومن کا مقصد زندگی نہیں ہے اسی لیے وہ مال کما تا ضرور ہے لیکن خرچ کرنے میں کوتاہ دست نہیں ہوتا۔ وہ خوش حالی میں بھی خرچ کرتا ہے اور تنگی میں بھی، وینفقون فی السراء والضواء (وہ تنگی اور خوش حالی دونوں میں خرچ کرتے ہیں)۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس کے دست انفاق کو ہمیشہ کھولے رکھتی ہے۔

وَ أَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ
رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِنَ الضَّالِّينَ ۝
وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

(منافقون-۱۱۱)

اور جو کچھ ہم نے تم کو رزق دے رکھا ہے اس کو خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت قریب آگے اور وہ کہنے لگے کہ ”اے میرے رب تو نے مجھے مزید مہلت کیوں زدی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکو کار بنتا“ جب کسی شخص کا وقت معین آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ذرہ برابر بھی تاخیر نہیں کرتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

توبہ و استغفار بھی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے بلکہ اس کے مومنانہ وجود کا مایہ خمیر ہے۔ توبہ و استغفار سے غفلت دراصل تکبر اور سرکشی کی علامت ہے، فرمایا:

وَ إِذْ قَاتِلْ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّازٍ وَّ دُوسِمٌ

وَرَأْيَتَهُمْ يَصْطُونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝ (منافقون: ۵)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے معافی کی دعا کرے تو سر جھکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ تکبر کے حال میں آنے سے سکتے ہیں۔

مومن اس امر سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے کہ انسان زہد و ورع کے اعتبار سے کتنا

کامل ہو جائے لیکن پھر بھی وہ انسان ہی رہتا ہے، اور اس سے خطا و نسیان کا صدور عین ممکن ہے اسی لیے وہ کسی حال میں بھی توبہ و استغفار سے بے پروا نہیں ہوتا بلکہ کثرت سے توبہ و استغفار کرتا ہے۔ کثرت استغفار اس بات کا ثبوت ہے کہ مومن خدا سے قرب و محبت کے باوجود محاسبہ آخرت سے بے خوف نہیں ہے بلکہ جتنا احساس قرب بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے توبہ و استغفار میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسے ہمہ وقت یہ اندیشہ و امن گیر رہتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جس سے اس کا آقا و مالک ناراض ہو جائے اور عمر بھر کی کمائی پر پانی پھر جائے۔ اور یہی حقیقی محبت کی علامت ہے۔

ایک مومن کے لیے توبہ و استغفار کا بہترین وقت نہنگام سحر ہے۔ اس وقت خدا اور بندے کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی۔ ذہن کے آرکانا اور قلب کے استغراق کے لیے یہ بہترین وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں ایک بندہ مومن خواب سحری اور نیم صبح گاہی کے لطف و عیش سے بے نیاز ہو کر اپنے خلوت کدہ میں اس طرح محوِ راز و نیاز ہوتا ہے کہ ہاتھ طلب مغفرت میں بلند، آنکھیں اشک بار اور زبان خدائے قدوس کی تسبیح و تمجید میں زمرہ سنج ہوتی ہے۔ یہی نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی ایک مومن متقی کا وظیفہ حیات اور توشہ آخرت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ الْخَالِدِينَ مَا أَنْتُمْ رَبَّهُمْ ؕ إِنَّهُمْ
كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُجْرِمِينَ ۖ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الْأَلْبَابِ مَا يَتَجَعَلُونَ ۖ
وَبِالْآسِحَارِ هُمْ يَسْتَفْعِرُونَ ۖ (الذاریات : ۱۵-۱۸)

بے شک خدا ہر س لوگ بانات اور چشموں والی جگہوں پر مقیم ہوں گے جو کچھ ان کا رب ان کو عطا کرے گا وہ خوشی خوشی اس کو قبول کریں گے۔ یہ لوگ دنیا میں نیکو کارانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ راتوں میں (عبادت کی وجہ سے) کم ہی سوتے تھے اور بوقت سحر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے تھے۔

خشوع نماز، محافظت نماز، عفت نفس، امانت و دیانت، ایثار، عہد، قیام شہادت

خشوع نماز، محافظت نماز، پاک دامنی، امانت و دیانت، ایثار، عہد اور قیام شہادت کو بھی قرآن مجید نے ایک مومن کے اوصاف حسنہ میں شمار کیا ہے۔ ان صفات کو قرآن پاک نے دو جگہوں پر نمایاں انداز میں بیان کیا ہے، ایک جگہ فرمایا:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنْ ابْتَغَىٰ زَوَاژَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ
عَلَىٰ صَلَواتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ
الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (المؤمنون: ۱-۱۱)

وہ مومن کامیابی سے ہمکنار ہوئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ اور جو نفل کاموں سے دور رہتے ہیں اور جو زکوٰۃ نکالتے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے (وہ کسی دوسری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے) ایسے لوگ ناقابل ملامت ہیں۔ جو اس کے علاوہ چاہے تو ایسے ہی لوگ بد راہ ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمانے کے محافظ و نگراں ہوتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی وہ اصلی وارث ہیں جن کو جنت وراثت میں ملے گی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ
مَعْلُومٌ ۝ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بَيِّمَاتِ الدِّينِ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُنْفِقُونَ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ
غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ

أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۚ فَمَنْ
 ابْتغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ۖ وَالَّذِينَ هُمْ يَلْمُوهُمْ وَ
 عَاهَدِهِمْ رَاعُونَ ۖ وَالَّذِينَ هُمْ يَشْهَدَتِهِمْ فَأَيْمُونٌ ۖ وَالَّذِينَ
 هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۗ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّةٍ مُّكْرَمُونَ ۝

وہ لوگ جو ہمیشہ اقامت صلوة پر کار بند رہتے ہیں۔ اور جن کے مالوں میں سائل اور مجرم کا حق ہوتا ہے، اور جو روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اور جو اپنے رب کے عذاب سے خوف محسوس کرتے ہیں، بیشک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے، اور جو اپنی شرم گاہوں کو (غلط کاری سے) محفوظ رکھتے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے (وہ کسی دوسری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے) ایسے لوگ ناقابل ملامت ہیں، جو اس کے علاوہ (کسی دوسری جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو تو ایسے ہی لوگ (حدود اللہ سے) تجاوز کرنے والے ہیں، اور جو امانتوں کے محافظ اور عہد و پیمانہ کا پاس کرنے والے ہوتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں، اور جو اپنی نازوں کی ہر طرح محافظت کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جنت میں باعزت داخل ہوں گے۔

آپ دیکھیں کہ ان آیات کی ابتدا بھی نماز کے ذکر سے ہوئی ہے اور انتہا بھی نماز ہی پر ہوئی ہے۔ کیا یہ پیرایہ بیان صراحت نہیں کر رہا ہے کہ ایک مومن کی زندگی میں نماز کا کیا مقام ہے؟ فی الواقع آپ جب بھی ایک مومن کا تصور کریں گے تو سب سے اول جو خیال آپ کے ذہن میں آنے لگا اس میں نماز ضرور موجود ہوگی۔ نماز کے بغیر ایک مومنانہ زندگی کا تصور محال ہے۔ ایک مومن کی عملی زندگی کا دائرہ اسی نقطہ سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم بھی ہوتا ہے۔ غرض آپ جس پہلو سے دیکھیے گا یہی طے لگے گا کہ نماز مومن کا سرمایہ حیات ہے۔

لیکن کون سی نماز؟ کیا وہ بے روح و بے اثر نمازیں جو ہم اور آپ پڑھتے ہیں کہ ہنگام نماز نہ جسم میں کوئی لرزش پیدا ہوتی ہے، نہ سائیدل کا کوئی تار خوف خدا سے مرتعش ہوتا ہے اور نہ ہی آنکھوں سے دو چار قطرہ اشک نکل کر زہاروں کو محبت الہی

کے سوز سے آشنا کرتے ہیں، نہیں، ایسی نمازیں نہیں بلکہ وہ نمازیں جن میں خشوع و خضوع کی روڈ و ڈرہی ہوتی ہے، جو قلب و روح کو ترساں اور جسم کو لرزاں بناتی ہیں، اور جو ہنگام نماز پیکوں پر اشکِ نعمت کے گرم گرم دینے جلاتی ہیں۔

ایک مومن اقامتِ صلوة کے ساتھ ہی دوامِ نماز اور محافظتِ نماز پر بھی سختی کے ساتھ کار بند ہوتا ہے۔ وہ ایک بار نماز شروع کر دینے کے بعد پھر اس کا سلسلہ کسی حال میں بھی منقطع نہیں کرتا یہاں تک کہ زندگی کی آخری سانس تک وہ اس پر قائم رہتا ہے۔ وہ اوقاتِ نماز کی پابندی اور اس کے تمام ظاہری آداب و لوازم کا بھی پورا پورا خیال رکھتا ہے۔ نماز کے ظاہری آداب و لوازم کی تکمیل کے ساتھ ہی اس کی نظر روح نماز یعنی خشوع و خضوع سے بھی غافل نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ اگر قلب میں خشوع و خضوع کی کیفیت نہیں ہے تو پھر ظاہری اعضائے بدن کا جھکاؤ بے معنی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جھکاؤ سے پناہ مانگی ہے۔ سچا مومن وہی ہے جس کے اعضا و جوارح اور قلب دونوں میں خشوع کی کیفیت پائی جائے۔

ایک مومن ناتواں و زکوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ہی لغو اور لالیعی باتوں اور برے کاموں سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ اس کی خواہشاتِ نفس کی طلب و سیری کا دائرہ صرف اپنے گھر تک محدود رہتا ہے۔ وہ کسی غیر عورت کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی خلاف ایمان سمجھتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں طہارتِ نفس کا محافظ اور عصمتِ قلب و نظر کا امین ہوتا ہے۔

مومن، امانت دار، شاہدِ عدل اور عہد و پیمان کو پورا کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک امانت و دیانت، شہادتِ عدل اور پاسِ عہد سے بڑھ کر قیمتی کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی۔ جب وہ کسی عہد و پیمان کو لیتا ہے تو پھر نقضِ عہد کا مرتکب نہیں ہوتا خواہ اس کے نتیجے میں اس کو کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ نبیؐ کا یہ ارشاد گرامی ہوتا ہے :

الا لا ایمان لمن لا امانة له وولا دين له لمن لا عهد له

لہ بیہقی فی شعب الایمان

خبردار! جس میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں اور جو عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔ وہ صرف سچائی کی گواہی دینے والا ہی نہیں ہوتا بلکہ سچی گواہی پر قائم بھی رہتا ہے۔ وہ کسی دباؤ اور مال و متاع کے لالچ میں سچی شہادت سے کبھی دست بردار نہیں ہوتا۔ مومن کی یہ تین صفتیں یعنی امانت داری، قیام شہادت اور ایفاء عہد، دراصل اس کی حسب مال و ذر سے بے نیازی، جرات و بے باکی، بلند نظری اور خوف خدا کی علامت ہیں۔ جو شخص مال و اسباب میں خیانت کر سکتا ہے اور جھوٹی گواہی دے سکتا ہے، اور انسانوں سے باندھے ہوئے عہد و میثاق کو توڑ سکتا ہے، وہ دین میں بھی دروغ گوئی اور خیانت کا مرتکب ہو سکتا ہے، اور خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمانوں کو آسانی کے ساتھ توڑ سکتا ہے۔ امانت، شہادت حق اور ایفاء عہد کی صفات نہ صرف ایک فرد کی زندگی کو حسن و زیبائی اور جامعیت عطا کرتی ہیں، بلکہ ایک اچھے انسانی معاشرہ کے قیام و بقا کے لیے بھی ناگزیر ہیں۔ اگر کوئی معاشرہ ان صفات سے خالی ہے تو اس میں لازماً دجل و فریب، استحصال اور خود غرضی و نفس پرستی کا دور دورہ ہوگا، اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ معاشرہ بہت جلد ہلاکت کے کھڑیں جاگے گا۔

محبت الہی

محبت الہی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرہ: ۱۶۵)

اور جو ایمان لائے وہ اللہ سے بڑی گہری اور شدید محبت رکھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جب علماء توریت نے تورات کا پہلا حکم دریافت

کیا تو آپ نے فرمایا:

”اپنے خدا سے، اپنے سارے دل، اپنی ساری جان، اور اپنی ساری

عقل سے محبت رکھ، بڑا اور پہلا حکم یہی ہے“

امام بزازی نے مسند میں حضرت ابو سعید خدری سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نبی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بندی پر انبیاء و شہداء بھی رشک کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیارا کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔“

اس مضمون کی دوسری حدیثیں ترمذی، مشکوٰۃ اور بیہقی میں بھی مذکور ہیں۔ یہی بات قرآن حکیم میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

مَنْ يَزِدْكَ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّونَ ۗ (مائدہ: ۵۴)

تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ ان کی جگہ ایسے لوگ لے آئے جن سے وہ محبت کرے اور وہ اس سے محبت کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں کثرت سے یہ دعا کرتے تھے:

اسئل حبك وحب من يحبك وحب عمل يقرب الي حبك
میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت، اور اس کام کی محبت بھی جو تیری محبت سے قریب کرے۔

ترمذی اور حاکم میں یہ دعا بھی موجود ہے۔

اللهم اجعل حبك احب الي من نفسي واهلي ومن المراء
البارد ۞

الہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و عیال سے، اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظروں میں محبوب بناوے۔

عہدہ ترمذی اور حاکم

ان احادیث اور آیات قرآنی سے واضح ہو گیا کہ ایک مومن کی زندگی میں محبت الہی کا کیا مقام ہے؟ آپ اگر دنیا کی تمام محبتوں پر غور کریں تو آپ کو ہر محبت کے پس پردہ دو ہی محرکات ملیں گے، ایک راحت و سکون اور دوسرا احسان۔ اگر آپ راحت و احسان کے تصور کو الگ کر دیں تو محبت کا تصور خود بخود ختم ہو جائے گا گویا محبت و راحت اور احسان میں ناقابل شکست رشتہ ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بیٹا اپنی ماں اور باپ سے محبت کرتا ہے، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ایام طفلی میں ماں اور باپ نے اس کے لیے ہر طرح کا ایثار کیا اور اس کے آرام و راحت کے لیے خود اپنے آرام و راحت کو فراموش کر دیا۔ اس احسان و ایثار کا لازمی تقاضا ہے کہ بیٹا ایام پیری میں والدین کے ساتھ احسان و ایثار کا سلوک کرے: ہل حبزاء الاحسان الاحسان۔ ایک بیوی اور شوہر کے درمیان محبت و یگانگت کا رشتہ بھی اسی اصول پر قائم ہے۔ بیوی شوہر سے اور شوہر بیوی سے صرف اس لیے محبت رکھتا ہے کہ ایک دوسرے کے لیے راحت و سکون کا ذریعہ ہے۔ یہی راحت و سکون جب مفقود ہو جاتا ہے تو زوجین علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی گزشتہ تمام محبتیں داستانِ پارینہ بن جاتی ہیں۔ ایک انسان مال و اسباب، لباس و غذا، کھیت اور مویشی، باغ و دریا اور مناظرِ فطرت سے بھی والہانہ محبت و شفقتگی صرف اس لیے رکھتا ہے کہ یہ چیزیں اس کے جسم و روح کو راحت پہنچاتی ہیں۔ آگ کو دیکھئے کہ موسم سرما میں ہم اس کے دلدادہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے لیے راحت رساں ہوتی ہے، اور اسی آگ سے ہم موسم گرما میں دور بھاگتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ ہمارے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

یہی حال ایک مومن کی محبت الہی کا بھی ہے۔ اس کی محبت میں بھی احساسِ لطف و راحت اور پاسِ احسان کا جذبہ ہی کام کرتا ہے۔ جب وہ اپنے وجود کا اور اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع کائنات کا عمیق نظر سے جائزہ لیتا ہے تو اسے ہر شے راحت بخش ہرزہ زمینِ جوہر و سخا کا آئینہ اور ہر گوشہ ہستی اسے فیضانِ محبت الہی کا سرچشمہ نظر آتا ہے۔ اس بے نہایت لطف و مہربانی اور اس بے طلب بخشش و کرم کا احساس و ادراک ہی

ایک مومن کے قلب و دماغ کو اپنے محسن کی محبت و عقیدت سے بھر دیتا ہے اور وہ اس سے دل و جان سے محبت کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ ماں باپ، بیوی بچے، بھائی بہن، گھر اور خاندان، مال و تجارت اور زمین و وطن غرض ہر چیز کی محبت اس کی محبت کے آگے گریباں بن جاتی ہے، اور ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ اپنی جان عزیز بھی اس کے قدموں پر نثار کر دینا باعثِ سعادت و خوشن بختی سمجھتا ہے۔

یہ کوئی افسانہ نہیں، ایک زندہ حقیقت ہے جو تاریخ کے اوراق میں نظر افروزی کے لیے موجود ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگیوں کی داستانِ محبتِ الہی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ انہوں نے خدا کی محبت میں اپنا گھر، مال و اسباب، بیوی بچے، بھائی بہن اور وطن کی محبت، سب کچھ قربان کر دیا حتیٰ کہ اپنی جانوں کو بھی ہنسی خوشی اس کی راہ میں قربان کر دیا۔ خدا کی محبت اور دارِ آخرت کی طلب میں انہوں نے اس طرح جامِ شہادت نوش کیا جیسے یہ موت کا جام نہ ہو حیاتِ سرمدی کا جام ہو۔ ابتلاؤ آزماتش کی وہ کون سی گھائی ہے جس سے وہ نہیں گزرے، اہانت، تعذیب اور سب و شتم کے ترکش کا وہ کون سا تیر ہے جو ان کے سینہ میں پیوست نہیں کیا گیا لیکن اللہ کی محبت میں انہوں نے ہر ظلم و اذیت کو ہنسی خوشی برداشت کیا، اور اس راہ میں لگنے والے ہرزخم کو صبر کے دامن میں چھپالیا محبت ہو تو ایسی، عشق ہو تو ایسا، فداکاری و جاں نثاری ہو تو ایسی کہ انہوں نے اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد کرنا تو گوارا کر لیا لیکن اللہ کی محبت سے دست برداری کے تصور کے بھی متحمل نہ ہو سکے۔

اس سلسلے میں حضرت ضعیفؓ کی زندگی ہمارے لیے ایک روشن نمونہ ہے جب کفار مکہ نے آپ کو شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو آپ نے ان سے کہا کہ تم مجھے صرف دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دو۔ کفہ نے اجازت دے دی۔ آپ نے دو رکعت نماز ثلث کے ساتھ پڑھی اور کفار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم اگر مجھے یہ اندیشہ دامن گیر نہ ہوتا کہ تم طوالتِ نماز کو میری بزدلی پر محمول کرو گے تو میں کچھ دیر مزید اپنے رب کے حضور مصروفِ دُعا و نیاز رہتا، لیکن میں نے نماز اسی لیے جلدی ختم کر دی کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ میں

موت کو سامنے دیکھ کر گھبرا گیا ہوں اور اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے سوزِ محبتِ الہی میں ڈوبے ہوئے اشعار پڑھے۔ ہم یہاں چند اشعار نقل کرتے ہیں جن سے حضرت خبیث کی جرأت و جواں مردی، عزم و استقلال اور پُرجوش محبتِ الہی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:-

وقد خیرانی الكفر والموث دونہ وقد هملت غیای من غیرہ جزع

انہوں نے مجھے کفر اور موت میں سے ایک چیز کا اختیار دیا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں لیکن یہ آنسو جزع و فرح کے آنسو نہیں ہیں بلکہ محبتِ الہی کے آنسو ہیں

ومالی حذار الموت اتی لمیتٌ ولكن حذارى جحمنار ملقح

میں موت سے ہرگز خائف نہیں ہوں۔ (ایک دن) بہر حال مجھے مرنا ہے، لیکن جہنم کے ان شعلوں سے ضرور خائف ہوں جو دور دور تک لپیٹ میں لینے والے ہیں۔

فواللہ ما ارجوا ذامتٌ مسلماً الى اى جنب كان فى اللہ مصرعی

خدا کی قسم مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ میں جب مسلم ہو کر جان دوں تو راہِ خدا میں میرا یہ گزنا کس پہلو پر ہوتا ہے۔

فلست بسیدٍ للعدو تخشعاً ولا جزعاً الى اللہ مرجعی

میں دشمن کے سامنے کسی قسم کی ذلت کا اظہار اور خوف زدگی کرنے والا نہیں کیونکہ میں تو اللہ کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں۔

حسن اخلاق

اخلاقِ حسنہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس کے اندر خوش مزاجی و خوش روئی، نرم گفتاری و خوش گفتاری، ایثار و مہمردی، خلوص و محبت، عجز و انکسار اور عفو و درگزر بھی اوصافِ حمیدہ شامل ہیں۔ ایک حقیقی مومن کی زندگی ان تمام اوصاف و محاسن کی جامع ہوتی

ہے۔ ہمارے ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف قرآن پاک میں ان لفظوں میں آئی ہے :-

إِنَّكَ لَعَلَّ خَلْقٍ عَظِيمٍ ﴿۹۰﴾ (قلم) بیشک آپ بہترین اخلاق کے مالک ہیں۔

احادیث میں اخلاق حسنة کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

”تمام مومنوں میں ایمان کے لحاظ سے سب سے افضل مومن وہ ہے

جس کے اخلاق سب سے لپھے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر ایک کے سامنے

متواضع اور جھکنے والے ہیں۔ کوئی شخص ایمان کی حقیقت تک رسائی نہیں

حاصل کر سکتا جب تک کہ وہ سب کے لیے وہی پسند کرنے لگے جو اپنے

لیے پسند کرتا ہے اور جب تک اس کا پڑوسی اس کی ایذا سے مامون نہ ہو جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

”نبہ کو تم میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں،“

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا :

”قیامت کے روز ایمان دار کی ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز خوش

اخلاقی ہوگی اور بیشک اللہ تعالیٰ بخش بکنے والوں، یہودہ گوار اور حد ادب

سے تجاوز کرنے والوں کو دشمن رکھتا ہے،“

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :-

”دو خصلتیں کسی ایمان دار میں جمع نہیں ہو سکتیں، بخل اور بد خلقی،“

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مقصد بخت ہی حسن اخلاق کی تکمیل بتایا ہے چنانچہ

فرمایا :- میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں،“

۱۰۰ ترمذی

۱۰۰ بخاری

۱۰۰ ترمذی

۱۰۰ ترمذی

۱۰۰ ترمذی

قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر مومنوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور ان باتوں سے اجتناب کے لیے کہا گیا ہے جو اخلاق حمیدہ کی ضد میں مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا... (بقرہ: ۸۴) لوگوں سے عمدہ طریقہ سے بات کرو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا
خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ
وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ؕ (مجادلہ: ۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کے لوگوں کا مذاق نہ اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کی عیب چینی کرو اور نہ ہی برے ناموں سے باہم کھینچو۔

ایک اور جگہ نصحِ لقمان کے ذکر میں فرمایا ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَتَّبِعْ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ؕ إِنَّ
اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۖ وَاقْضِ فِي مَشِيكَ وَاعْضُضْ
مِنْ صَوْتِكَ ؕ إِنَّ أُنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۗ (لقمان: ۱۸)

اور لوگوں سے بگڑنے کی وجہ سے منہ نہ موڑو، اور زمین پر اترا کر نہ چلو، اللہ کسی تکبر اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ میانہ روی اختیار کرو، اور آواز کو پست رکھو۔ بیشک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔

ایک جگہ قرآن مجید میں مومنین کو عباد الرحمن کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اور ان کی پہلی صفت جو بیان کی گئی وہ ان کا تواضع اور انکسار ہے، فرمایا:

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَتَسَوَّنُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ
الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۗ (الفرقان: ۶۳)

اور رحمن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین میں عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کے اخلاق کی سب سے نمایاں خصوصیت تو واضح و انکسار ہے۔ جہاں آپ کبر و نخوت دیکھیں اور تکبر و استکبار کا اظہار پائیں یقین کر لیجئے کہ یہ شخص ایمان کی روشنی سے محروم ہے خواہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے عابد و زاہد ہی نظر آتا ہو۔ تواضع و انکسار وہ جوہر انسانی ہے جو ایک انسان کو حقیقی معنوں میں عظمت و بزرگی عطا کرتا ہے، اور یہ ہمیشہ سے تمام نیکو کاروں اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی ایک بابہ الاقیمہ صفت رہی ہے، اور فخر و غرور ہمیشہ سے کم ظرف، بد اطوار اور شیطانی خصائل کے حامل انسانوں کا شیوہ رہا ہے۔

مومن اور منافق میں فرق

تاریخ انسانی کا کوئی دوسرا بھی منافقین کے وجود سے خالی نہیں رہا ہے۔ عہد رسالت میں بھی ان کی ایک جماعت موجود تھی۔ چونکہ یہ ظاہری اعمال و اشکال میں مسلمانوں جیسے تھے اس لیے آسانی کے ساتھ مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے۔ یہ منافق اسلام کے پردہ میں سلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں شب و روز مشغول رہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مسجد منار تک بنا ڈالی جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے :

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ
وَأَزْوَاجًا لِمَنْ حَادَرَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ (توبہ: ۱۰۷)

(کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی تاکہ (اسلام) کو نقصان پہنچائیں اور ٹکرائیں اور اہل ایمان میں تفرقہ ڈالیں، اور (اس مسجد کو) اس شخص کے لیے جاسوسی کا مرکز بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول سے برسرِ جنگ رہ چکا ہے۔

یہی صورت آج بھی قائم ہے۔ کتنے ہی ایسے مسلمان ملتے ہیں جو اپنے طرز فکر و عمل کے اعتبار سے عہد نبوی کے منافقین سے بھی دو چار قدم آگے نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہیں جن کو عرف عام میں روشن خیال اور تجدد پسند کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اسلامی قوانین اور مسلم معاشرے کی اصلاح (REFORM) کے نام پر علانیہ فتنہ انگیزی

اور اسلام کے استیصال میں مشغول ہیں۔ ایسے ہی منافقوں کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے:

وَإِذِ اتَّيَلَّ لَهُمْ لَأَنفُسُهُمْ فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصَلِّحُونَ

جب بھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا کرو، تو انہوں نے جواب میں یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں جو علانیہ اسلام کے خلاف تو کچھ نہیں کہتے بلکہ خود کو اسلام کا حقیقی علم بردار ظاہر کرتے ہیں لیکن فی الواقع وہی کام کرتے ہیں جو عہد رسالت کے منافقین کرتے تھے یعنی تفریق بین المسلمین۔ یہ دراصل ”دیندار“ قسم کے منافقین ہیں جو مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں کی اوٹ سے اسلام کی شکل و صورت کو مسخ کرنے اور مسلمانوں میں انتشار و افتراق کا بیج بونے میں بہت ن مصروف ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن مجید میں ہر قسم کے منافقین کے کچھ ایسے اعمال و خصائل بیان کر دیے ہیں جن کی مدد سے ہم آسانی کے ساتھ ہر دور میں ایک مومن و منافق میں فرق و امتیاز کر سکتے ہیں۔ ہم منافقین کے ان اعمال و خصائل کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

(۱) شک اور تردد

تاریخ میں جب بھی دعوت حق کا آواز بلند ہوا ہے تو اس کا واسطہ بالعموم تین طرح کے اشخاص سے پیش آیا ہے۔ اول وہ لوگ جو دعوت حق کو سنتے ہی اسے دل سے قبول کر لیتے ہیں، یہ مومن ہیں:

رَبَّنَا إِنَّا أَمِئْتًا مِّمَّنَّا مَنَّا لِيَأْتِنَا ذِي الْبَلْعَيْنِ أَنْ أَوْتُوا بِرَبِّكُمْ قَامِنًا

(آل عمران: ۱۹۳)

اے ہمارے رب ہم نے ایک ایمان کی منادی کرنے والے کو یہ منادی کرتے ہوئے سنا کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لائے۔

دوم وہ لوگ جو اس کا کھلے عام انکار کرتے ہیں اور ہر انداز کا جواب تہمید و سرکشی سے دیتے ہیں، یہ کفار ہیں :

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦٠﴾

(بقرہ: ۶۰)

جن لوگوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم ڈراؤ یا نا ڈراؤ، وہ ایمان

لانے والے نہیں ہیں۔

سوم وہ لوگ جو نہ دعوت حق کو قبول کرتے ہیں اور نہ انکار بلکہ تذبذب کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک منافق کی سب سے اہم خصوصیت اس کے قلب کا ریب و تردد ہے۔ منافق کا قلب شک کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ وہ زبان سے اللہ، اس کے رسول، اس کی کتابوں اور روزِ آخرت کے برحق ہونے کا اگرچہ اعتراف کرتا ہے لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہوتا کہ یہ

امور واقعہً صحیح اور برحق ہیں :-

مُذَنْبًا بَيْنَ بَيْنٍ ذَلِكَ ؕ لَئِىْ هَؤُلَاءِ ۖ وَلَا اِلٰى هَؤُلَاءِ ۚ وَمَنْ

(نساء: ۱۲۳)

يُضِلِلِ اللّٰهُ فَلَئِنَّ تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا ﴿٦١﴾

(منافق) نہ ادھر نہ ادھر درمیان میں حالت تذبذب میں، اور اللہ جس کو گمراہ کر دے اس کو تم

راہ ہدایت نہیں دکھا سکتے۔

ایک منافق یقین اور شک کے درمیان معلق ہوتا ہے۔ اگر کبھی اس کے دل میں یقین رکھتا ہے، بلکہ رقی پیدا بھی ہوتی ہے تو دوسرے ہی لمحہ اس پر شک کے سائے دراز ہو جاتے ہیں، غرض یہ کہ اس کی یوری زندگی کشاکش ریب و یقین میں گزر جاتی ہے۔ منافق کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ قرآن مجید نے ایک تمثیل کے ذریعہ نہایت عمدہ طور پر کھینچا ہے :

اَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيْهِ ظَلُمٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ

فِيْ اَازَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حُدُودَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ مُخِيطٌ بِالْكَافِرِيْنَ ﴿٦٢﴾

بِكَادِ الْبَرْقِ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۗ كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَآءُ فِيْهِ ۗ وَاِذَا اَظْلَمَ

عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۗ (بقرہ: ۱۹-۲۰)

یا منافقوں کی مثال اس بارش کی ہے جس میں تاریکی، بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک موجود ہو۔ وہ بجلیوں کی کڑاک سن کر موت کے خوف سے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے ہیں اور دعوت سے کہاں فرار حاصل کر سکتے ہیں کہ اللہ انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلیاں ان کا نور بصارت اچک لیں۔ جب ذرا بجلی چمکی تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگے ہیں اور جب ان کے بہت تاریکی پھیل جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں (کتاب کیا کریں)

اس تمثیل میں بارش سے مراد دعوت حق ہے جو نوع انسانی کے لیے مردود رحمت و سعادت بن کر آئی، برق و رعد اور ظلمت سے مراد مشکلات و مصائب میں جو لازماً اعلان حق کے بعد اہل حق کو پیش آتے ہیں۔ لیکن جس طرح بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک کے ہولناک مناظر کے پس پردہ رحمت حق انگڑائی لیتی ہے اور ان کا ظہور دراصل باران رحمت کے نزول کا اعلان ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح دعوت حق کے ظہور کے بعد اہل حق کو جو مصائب و موانع پیش آتے ہیں وہ فتح و کامرانی اور لطف و شادمانی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک وقت وہ آتا ہے جب حق کو نابلہ و استیلاء حاصل ہوتا ہے اور باطل کو شکست و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

مثال کا آخری حصہ دراصل منافقین کے ذہنی رویے کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی جب حالات پر سکون ہوتے ہیں کہیں سے بھی جان و مال کو کوئی گزند پہنچے گا اندیشہ نہیں ہوتا تو منافق اپنے دعویٰ ایمان میں سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں، حق کی حمایت میں ان کی زبانیں فیشی کی طرح چلتی ہیں، لیکن جب کوئی سخت ابتلاء و آزمائش پیش آجاتی ہے جس میں ان کو جان و مال کی ہلاکت اور بربادی کا خوف ہوتا ہے تو ان کے دعویٰ ایمان کا سارا زور غبار۔ کی ہو اکی طرح نکل جاتا ہے۔ اسی طرح جب کبھی اللہ اور اس کے رسول کے واضح احکام کی تعمیل میں خواہشات نفسانی اور مباحی عزت و وقار مجروح ہوتا نظر آتا ہے تو وہ عجیب خمصے میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ کس کو چھوڑیں اور کس کو اختیار کریں۔ اس کش مکش کا نتیجہ لازماً حق کے خلاف ہی نکلتا ہے، اور ہزار تاویلات کے پردے میں وہ باطل کی راہ میں گام زن ہو جاتے ہیں، بقول غالب :

ایمان مجھ روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس سے معلوم ہوا کہ منافقوں کا یہ گروہ دراصل مفاد پرستوں کا گروہ ہوتا ہے۔ ان کے قلب و دماغ دعوت حق کی صداقت پر مطمئن نہیں ہوتے، لیکن یہ اپنے اندر علانیہ انکار حق کی جرات بھی نہیں پاتے کیوں کہ ایسی صورت میں ان کے بے شمار مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ زبان سے تو خود کو مومن و مسلم کہتے ہیں لیکن ایمان اور اسلام کے تقاضوں سے ہمیشہ انحراف کرتے ہیں اور شب و روز وہ کام کرتے ہیں جو ایمان کی عین ضد اور مومنین کے قومی مفادات کو شدید نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں، لیکن ان حکما کے باوجود ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے کیونکہ وہ زبان سے خود کو مسلمان کہتے ہیں۔

(۲) اقامت صلوٰۃ میں ریا اور غفلت

یہ ایک حقیقت ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلافت دونوں میں ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جو اعلان ایمان کے بعد تارک نماز رہا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آغاز اسلام میں ایمان اور اقامت صلوٰۃ ناقابل تفریق اجزاء کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں منافقین بھی نماز پڑھا کرتے تھے کیونکہ اس فرض کی ادائیگی کے بغیر ان کا دعویٰ ایمان غیر معتبر ہوتا۔ لیکن منافقین اور سچے اہل ایمان کی نمازوں میں نمایاں فرق تھا۔ مومنین کی نمازیں خشوع و خضوع، انہماک و دماغ، حضور قلب، طلب خوشنودی رب جیسے نماز کے عناصر ترکیبی سے مزین تھیں جب کہ منافقین کی نمازیں بے دلی اور ریاکاری کا مظہر تھیں۔ وہ دراصل نماز کو ایک بوجھ سمجھتے تھے اور مسجدوں میں بادل ناخوارہ صرف مسلمانوں کو دکھانے کے لیے کہ وہ بھی مومن ہیں، چلے جاتے تھے۔ منافقین کے اس طرز عمل کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَدُّعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ، وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ
قَامُوا كَسَالَى، يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا

(نساء: ۱۲۲)

منافقین اللہ کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ وہ ان کو مبتلائے خدع کر رہے اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بادل ناخواستہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے اور وہ اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

اس آیت قرآنی سے معلوم ہوا کہ دکھاوے کے لیے نماز پڑھنا یا بادل ناخواستہ پڑھنا ایک منافق کی علامت ہے۔ جو لوگ دعویٰ ایمان کے بعد بھی تارک نماز ہیں ان کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں اور اگر اسی حالت میں وہ اس دنیا سے رحلت کر گئے تو اپنے اس جرم کی کیا توجیہ کر سکیں گے؟ اس سلسلے میں اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مکالمہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے وہ بڑا قابل غور ہے۔ اہل جہنم کو جن نیک اعمال کے ترک کرنے پر حسرت اور افسوس ہوگا ان میں ترک نماز بھی ہے۔

يَسْأَلُونَ ۖ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۗ مَا سَأَلَكُمْ فِي سَقَرٍ ۖ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلُومِينَ ۗ وَلَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمُسْكِينِ ۗ وَكُنَّا نَحْضُرُ مَعَ الْغَائِظِينَ ۗ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۗ حَقِّي أَتَدْنَا الْيَقِينُ ۗ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شِقَاةُ الشَّفِيعِينَ ۗ (مذہب: ۳۰-۳۸)

وہ (جنتی) مجرموں کے بارے میں دریافت کریں گے ”تم لوگوں کو جہنم کی سزا کیوں ملی؟“ وہ کہیں گے ”ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور فضول باتوں میں مشغول رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغول رہا کرتے تھے“ اور ہم روز آخرت کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ موت نے ہم کو آلیا۔ اس دن کسی شفاعت کرنے والی شفاعت ان کے لیے نفع بخش ثابت نہ ہوگی۔

(۳) ایثار و زکوٰۃ سے غفلت اور بددلی

نماز کے بعد علی طور پر ایک مومن اور منافق کے درمیان جو چیز وجہ امتیاز ہے وہ انفاق مال ہے۔ اولاً تو منافق انفاق مال سے گریز کرنا بہت (و یقبضون ایذیہم) اور اگر خرچ کرتا بھی ہے تو مجبوراً جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا:

وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كُرْهُونَ ﴿٥٢﴾ (توبہ: ۵۲)

وہ بادل ناخواستہ ہی خرچ کرتے ہیں۔

یہ تو دور رسالت کے منافقین تھے جو بادل ناخواستہ ہی سہی، زکوٰۃ ادا کرتے تھے اور صرف اس لیے ادا کرتے تھے کہ اس کے بغیر وہ جماعت مومنین سے خارج سمجھے جاتے، لیکن آج جو لوگ دعوائے ایمان کے باوجود سرے سے زکوٰۃ ہی ادا نہیں کرتے انھیں سوچنا چاہئے کہ وہ اپنے دعویٰ میں کتنے مخلص ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے حضور کے بعد مانعین زکوٰۃ کا جو قسہ اٹھا تھا، اس میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو خود کو مسلمان کہتے تھے، اللہ اور اس کے رسول، اس کی کتابوں اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور فریضہ حج بھی ادا کرتے تھے صرف ان کا اصرار یہ تھا کہ وہ زکوٰۃ حضور کے بعد کسی دوسرے کو ادا نہ کریں گے اور کچھ ایسے بھی تھے جو سرے سے زکوٰۃ ہی ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو عجیب مشکل سے دوچار کر دیا تھا متعدد صحابہ جن میں حضرت عمر فاروقؓ بھی شامل تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں، اللہ، اس کے رسول اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، بجز زکوٰۃ کے دوسرے تمام ارکانِ اسلام پر عمل کرتے ہیں، اس لیے صرف زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے ایسے لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ خلیفہ وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ ان صحابہ کی اس دلیل سے متفق نہ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی دعویٰ ایمان کے بعد ضروری ہے جو لوگ اسے ادا نہ کریں گے ان کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔ آپ نے دلیل میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی:-

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ

إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٠﴾ (توبہ: ۵۰)

پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان سے تعرض نہ کرو بیشک اللہ مہربان کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس آیت قرآنی کی روشنی میں فرمایا کہ ہم کو مشرکین کو صرف

اس صورت میں چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے جب وہ شرک سے توبہ کر لیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ چونکہ وہ ان تین شرطوں میں سے ایک شرط پوری نہیں کر رہے ہیں اس لیے ان کے ساتھ جہاد درست ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس استدلال کو تمام صحابہ نے بالاتفاق تسلیم کر لیا اور پھر مانعین زکوٰۃ کے ساتھ جنگ ہوئی اور ان کو اسلام کے اس عظیم رکن کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

مانعین زکوٰۃ کا فتنہ دراصل اس وقت اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف منافقوں کی ایک منظم بغاوت تھی اور ایک بائیں گروہ کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیے وہ ہوا، لیکن ان مانعین زکوٰۃ کے خلاف صحابہ کے جہاد و قتال سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ دین اسلام کا ایک نہایت اہم رکن ہے اور اس کے ترک کرنے والے کے خلاف اسلامی حکومت جہاد کرے گی۔

(۴) امر بالمعروف ونہی عن المنکر، بخل اور ذکا الہی سے غفلت

تقابل، قرآن مجید کا ایک معروف اسلوب بیان ہے چنانچہ وہ جہاں کسی چیز کے منفی پہلو کا ذکر کرتا ہے وہاں معا بعد اس کے مثبت پہلو کو بھی اجاگر کر دیتا ہے تاکہ بات مکمل اور واضح ہو جائے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دنیا کے ساتھ آخرت، جہنم کے ساتھ جنت اور کفر کے ساتھ ایمان کا ذکر اس کا واضح ثبوت ہے۔ قرآن حکیم نے بعض مقامات پر مومن اور منافق کے اوصاف و خصائل کا ذکر بھی تقابلی انداز میں کیا ہے تاکہ ایمان اور نفاق کی حقیقت زیادہ واضح ہو جائے اور کسی پہلو سے بھی کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ ایک جگہ منافق کے خصائل کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ أَسْأَأُ لِّلَّهِ قَسِيْمًا
إِنَّ الْمُنْفِقِينَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝ وَعَدَّ اللّٰهُ الْمُنْفِقِينَ وَالْمُنْفِقٰتِ
وَ الْكٰفٰرَ نٰسًا جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ ، وَ لَعْنَةُ

اللَّهُ: وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقْتَدِمٌ ﴿۶۷﴾ (توبہ: ۶۷-۶۸)

منافق مرد اور منافق عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ بری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں، اور بخل کرتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا یا بیشک منافق ہی فاسق ہی۔ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار کے لیے اللہ کا یہ وعدہ (فیصلہ) ہے کہ وہ انھیں جہنم کی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہی ان کا ٹھکانہ ہوگی۔ ان پر اللہ کی لعنتیں پڑاگی اور ان کے لیے دائمی عذاب ہوگا۔

اسی سورہ میں اور اسی سلسلہ بیان میں چند آیتوں کے بعد ایک مومن کے اوصاف اور ان کا انجام ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۶۸﴾
وَعَدَّ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَذَبَاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّتِ عَذْنٍ ۗ
وَرِضْوَانٍ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۶۹﴾

(توبہ: ۶۸-۶۹)

مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور ناز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ ان پر اللہ عنقریب اپنی رحمتیں نازل کرے گا۔ بیشک اللہ قدرت والا حکمت والا ہے۔ مومن مرد اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشگی کے باغات میں ان کے لیے خوشگوار رہائش گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑی چیز یہ کہ انھیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہ دونوں آتیں صاف تبارہی ہیں کہ ایک مومن کی نمایاں صفت امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے یعنی وہ اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک منافق کی نمایاں خصوصیت امر بالمنکر و نہی عن المعروف ہے یعنی وہ بری باتوں کی اشاعت کرتا ہے اور اچھی باتوں سے روکتا ہے۔ ہر دور میں یہ ایک منافق کی نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ وہ کسی کارخیر میں تعاون نہیں کرتا، لیکن فحش اور لایعنی باتوں میں وہ ہمہ وقت تعاون کے لیے تیار رہتا ہے اور اس انہماک اور جوش و سرگرمی سے ان کاموں میں اپنا مال اور وقت صرف کرتا ہے جیسے یہ کارشر نہ ہوں خیر و تقویٰ کے کام ہوں۔ وہ سماج میں نہ صرف نیکیوں کے فروغ کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتا بلکہ نیکی کا کام اگر کوئی کر رہا ہے تو اس کی راہ میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنا اور اس پر نکتہ چینی کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ وہ خیر کے کاموں سے اس طرح دور بھاگتا ہے جیسا کہ حاشیر کی آواز سن کر بھاگتا ہے، اور شر سے اس طرح ایٹ جاتا ہے جیسے کھیاں غلاظتوں کے ڈھیر سے چٹی رتبی ہیں اور چھٹی ہی نہیں رتبی بلکہ غلاظت کو دوسرے مقامات تک منتقل کرنے میں بھی اہم حصہ لیتی ہیں۔

منافع کسی کارخیر میں ایک دم طری دینے سے بھی جی چراتا ہے۔ وہ انتہائی درجے کا بغیل ہوتا ہے اور اس کی یہ بخالت دینی کاموں میں نقطہ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ اگر کبھی دیتا بھی ہے تو صرف نمود و نمائش کے کاموں میں۔

اللہ کے ذکر سے وہ بالکل غافل ہوتا ہے۔ اگر کسی محفل میں اتفاق سے ذکر خدا اس کے کانوں میں پڑ جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد موضوع گفتگو بدل جائے اور اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہوتا ہے تو وہاں سے فوراً نکل بھاگتا ہے۔ جس آدمی کو ذکر خدا سے اس درجہ تفراد و توخس ہو وہ اپنا سر خدا کے سامنے کیسے جھکا سکتا ہے؟

(۵) جھوٹ، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فحش گوئی

ایک منافق معاملات زندگی میں نہایت بد معاملہ اور بد کردار ہوتا ہے۔ جھوٹ، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فحش گوئی اس کے شب و روز کا معمول ہوتا ہے۔ وہ فی الواقع اخلاق کی

انتہائی پستی کی حالت میں ہوتا ہے۔ متعدد احادیث میں منافق کی اس پستی ذہن اور ذنابت طبع کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو بے وفائی کرے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے“ ۱؎

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”چار خصلتیں جس میں پائی جائیں وہ منافق ہے، اولاً جب بات کرے تو جھوٹ بولے ثانیاً جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، ثالثاً جب عہد کرے تو بے وفائی کرے، رابعاً جب جھگڑا کرے تو گالی بکے“ ۲؎

اقسام منافقین

سطور بالا میں ہم نے منافقوں کے جن اعمال و خصائل کا ذکر کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک منافق تو وہ ہے جو زبان سے خود کو مسلم کہتا ہو لیکن دل میں اسلام کا شدید مخالف اور کفر کا حمایتی ہو (توبہ: ۸) دوسرا منافق وہ ہے جو زبان سے مسلم ہونے کا اعتراف کرتا ہو، اور اس کے دل میں بھی اسلام کے خلاف کوئی جذبہ نہ ہو لیکن عملاً خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہو مثلاً ارکان اسلام (نماز، روزہ وغیرہ) میں سے کسی رکن پر بھی عمل نہ کرتا ہو۔ قرآن مجید نے اس قسم کے منافق کو فاسق قرار دیا ہے:

لَسُوا اللّٰهَ قَنِيْبِيْہُمْ مَّرَانَ الْمُنْفِقِيْنَ هُمْ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اور تیسرا منافق وہ ہے جو زبان اور دل سے اسلام کا اقرار کرتا ہو اور ارکان اسلام پر عمل پیرا بھی ہو، لیکن اس کے دوسرے اعمال اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوں مثلاً جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، جھوٹ بولتا ہو، وعدہ خلافی کرتا ہو، غیبت کرتا ہو، گالیم گلوچ بکتا ہو وغیرہ۔

عمل

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ

وَحَسُنَ مَا أَتَوْا ○ (رعد)

جو لوگ ایمان لائے اور عمدہ عمل کیے ان کے لیے خوش حالیاں
ہیں اور (بالآخر) بہت اچھا ٹھکانہ۔

www.KitaboSunnat.com

عمل

عمل کا مفہوم

انسان مختلف النوع داعیات، احساسات اور ارادوں کا مجموعہ ہے اور انہی خواہشاں احساسات اور ارادوں کے فعلی ظہور کا نام عمل ہے۔ پہلے ایک خیال یا کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے جو قلب کو تحریک دے کر ارادہ کی صورت اختیار کرتی ہے اور یہی ارادہ جب بالفعل ظاہر ہو جاتا ہے تو اس پر عمل کا اطلاق ہوتا ہے، مثال کے طور پر غذا کے استعمال سے پہلے ہمارے اندر غذا کے استعمال کی خواہش پیدا ہوتی ہے جسے ہم بھوک سے تعبیر کرتے ہیں، اور پھر اس خواہش سے غذا کے حصول کا ارادہ جنم لیتا ہے اور یہ ارادہ ہم کو ایک مخصوص عمل کے لیے اکساتا ہے اور اس طرح ہم کھانا کھاتے ہیں۔ یہ ہمارے کھانے کا عمل ہو اسی طرح ہمارے اندر کسی آدمی کو قتل کر دینے کی خواہش یا جذبہ پیدا ہو اور یہ جذبہ ارادہ کی صورت اختیار کرے اور ہم اس کو قتل کر ڈالیں تو یہ بھی ہمارا ایک عمل ہوا اگرچہ برا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی خواہش یا خیال ہی ہمارے کسی عمل کا محرک بنتا ہے۔ جیسے ہمارے خیالات اور جذبات ہوں گے ویسے ہی ہمارے اعمال ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہر عمل خواہ وہ اچھا ہو یا برا ہمارے قلب کی کسی نہ کسی حالت یا کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، کیونکہ ہمارے تمام احساسات اور ارادوں کا اصل سرچشمہ ہمارا قلب ہی ہے گویا عمل قلب کا آئینہ ہے جس میں درون قلب کے تمام احوال و کوائف کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اقسام عمل

قرآن مجید نے انسان کے تمام اعمال کو دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا ہے، ایک

عمل صالح اور دوسرا عمل غیر صالح، عمل صالح کے متعلق ایک جگہ فرمایا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۖ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ
الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر: ۱۰)

جو شخص عزت کا طلب کار ہے (وہ اچھی طرح جان لے کر) عزیزیں سب اللہ کے لیے
میں۔ اچھا کلام ہی اس تک پہنچاتا ہے اور عمل صالح اسے پہنچاتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ
أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ (زل: ۱۹)

اے میرے رب تو مجھے اس کی توفیق بخش کر میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جن سے
تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے اور اس بات کی بھی توفیق دے کہ میں وہ نیک
کام کروں جن سے تیری رضا حاصل ہو۔

عمل غیر صالح کے متعلق ایک جگہ فرمایا ہے:

قَالَ يُنَادِيهِ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود: ۴۶)
اس نے کہا "اے نوح تیرے بیٹے کا تجھ سے کوئی رشتہ نانا نہیں وہ تو (سڑ پایا) ایک
برا عمل ہے۔"

عمل صالح کا مفہوم

عمل صالح کا ایک مفہوم تو بالکل واضح ہے یعنی وہ تمام اعمال حسنہ جن کی ہر دور
میں مدح و ستائش کی گئی ہے، عمل صالح میں داخل ہیں مثلاً خدا کی مخلصانہ عبادت،
والدین کی خدمت، یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور مسکینوں کی اعانت، فاقہ کشوں، مسافروں
اور بے سہاروں کی دست گیری، ایفائے وعدہ، ادائے امانت و حقوق، پابندی عہد
وغیرہ۔

عمل صالح کے اس ظاہری مفہوم کے علاوہ بھی اس کا ایک مفہوم ہے جو درحقیقت

تمام اعمال حسد کی اصل و اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ اس مفہوم تک بہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہے اس لیے اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ لفظ صالح، صلاح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ فساد کی ضد ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا:

لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (اعراف: ۵۶)

زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔

دوسری جگہ فرمایا:

اخْلَفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۴۲﴾

(اعراف: ۱۴۲)

تم میرے بعد میری قوم میں میرے جانشین بن کر بنا اور ہر کام عدل و راستی کے ساتھ کرنا اور مفسدوں کی راہ نہ چلنا

ایک اور جگہ فرمایا:

الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿۱۵۲﴾ (الشعرا: ۱۵۲)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زمین میں اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتے ہیں۔

ان آیات قرآنی سے واضح ہو گیا کہ فساد صلاح کی بالکل ضد ہے۔ فساد کے معنی عدل و قسط کی راہ سے ہٹ جانے کے ہیں، اور صلاح کے معنی اس کے بالکل برعکس یعنی عدل و قسط پر قائم رہنے کے ہیں۔ لفظ اصلاح قرآن مجید میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، یہ صلاح ہی سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ٹھیک کرنے، سنوارنے اور عدل و قسط پر قائم کرنے کے ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا:

فَأَسْتَجِبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَاهُ (انبیاء: ۹۰)

ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے ایک فرزند (یحییٰ) عطا کیا اور ہم نے اس کے لیے اس

کی بیوی کو (جو بائچھتی) اولاد کے قابل بنادیا۔

اصلاح زوج سے مراد یہ ہے کہ اعضاء تولید و تناسل میں جو خرابی تھی اس کو دور کر کے

لہ دیکھئے مفردات (امام راغب)

اس کے اندر فطری توافق و سازگاری پیدا کر دی جو عدل و توازن کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔
دوسری جگہ فرمایا:

وَإِنْ طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا، (حجرات: ۹)

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔
دو تجارت گروہوں میں صلح کرانے کا مطلب یہی ہے کہ انھیں عدل و قسط پر قائم کیا جائے
اور ایک کو دوسرے پر ظلم و زیادتی سے روکا جائے۔ آگے اسی سلسلہ آیت میں عدل و قسط کے
الفاظ بڑھا کر اصلاح کے مفہوم کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے:

فَإِنِ آوَتْ فَاَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا، (حجرات: ۹)

پس اگر وہ (یعنی زیادتی کرنے والا گروہ) باز آجائے تو ان دونوں کے معاملات کو عدل کے
ساتھ درست کر دو اور (دیکھو) اس صلح و صفائی میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

ایک جگہ یوں آیا ہے:

فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصِيٍّ جَنَافًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ

عَلَيْهِ، (بقرہ: ۱۸۲)

جو شخص کسی وصیت کنندہ سے کسی زیادتی یا گناہ کا اندیشہ محسوس کرے تو اگر وہ باہم اپنے
معاہدے کو درست کر لیں تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔

اس آیت میں معاہدے کو درست کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ عدل و راستی کے ساتھ
وراثت کی تقسیم عمل میں آئے یعنی کسی کے ساتھ کسی طرح کی نا انصافی نہ ہو۔ عدل و قسط کی راہ
سے اختلاف کرنے والوں کو قرآن مجید مفسد قرار دیتا ہے۔

الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ، (الشرا: ۱۵۲)

وہ لوگ جو زمین میں تعمیر و اصلاح کے بجائے فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ آیا ہے:

اخْلَفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ، (اعراف: ۱۲۲)

(اعراف: ۱۲۲)

تو میری قوم میں میری نیابت کر اور عدل و قسط کی راہ پر قائم رہ اور مفسدوں کی راہ کبھی اختیار نہ کرنا۔

قرآن مجید میں توبہ و انابت کے بعد بالعموم اصلاح کا لفظ ضرور آتا ہے۔ اس کا مفہوم بھی یہی ہوتا ہے کہ توبہ گزار ظلم و تعدی سے باز آجائے اور عدل و قسط پر قائم رہ کر اپنے اعمال کو درست کرے مثلاً فرمایا :-

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ

(مانندہ: ۴۹)

پس جس نے ظلم (گناہ) کے بعد توبہ کیا اور اپنے اعمال کو درست کر لیا اللہ اس کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا (نساء: ۱۶)

اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اپنے افعال درست کر لیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

قرآن حکیم نے اصلاح کا لفظ ایک دوسرے معنی میں بھی استعمال کیا ہے یعنی عمل کا بار آور ہونا اور دراصل یہ بھی عدل و قسط ہی کے نتیجے میں ظہور میں آتا ہے۔ اگر اشیاء میں عدل و توازن نہ پایا جائے تو اس سے افعال کا صدور ناممکن ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر عمل صالح، فاعل اور سماج دونوں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے اور اس کے برعکس عمل غیر صالح، فاعل اور سماج دونوں کے لیے مضر ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مفسدین کو کبھی اس امر میں کامیاب نہیں ہونے دیتا کہ وہ کائنات خلقت میں اس کے قائم کیے ہوئے نظام عدل و توازن کو بگاڑیں، فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُصَلِّحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ (یونس: ۸۱)

بیشک اللہ فتنہ پردازوں کو ان کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتا (کہ وہ زمین میں ظلم و فساد برپا کریں)

مذکورہ تمام قرآنی استعمالات سے واضح ہو گیا کہ لفظ اصلاح کے حقیقی معنی عدل و قسط

پر قائم کرنے کے ہیں، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ صلاح ہی سے مشتق ہے، اور صلاح فساد کی ضد ہے اس لیے صلاح کے معنی عدل و قسط کے ہوئے۔ اس تعین معنی کے بعد عمل صالح کا مفہوم خود بخود واضح اور متعین ہو جاتا ہے یعنی ہر وہ اچھا عمل جو عدل و قسط یا دوسرے لفظوں میں اعتدال و توسط کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے عمل صالح میں داخل ہے اور ہر وہ عمل جو اعتدال و توسط کے حدود سے متجاوز ہو، عمل صالح سے خارج ہے۔

قرآن مجید نے برے اعمال کے لیے جتنے الفاظ استعمال کیے ہیں ان کے معنی کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اعتدال و توسط کی عین ضد واقع ہیں مثلاً ایک لفظ ظلم ہے جو قرآن مجید میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں وضع الشئ فی غیر موضعه یعنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اس دوسری جگہ رکھ دینا جو اس کا محل نہ ہو۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے، کیونکہ اس سے زیادہ بے محل اور کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی کہ خالق کی جگہ مخلوق کو قبل حاجات اور سجدہ گاہ شوق بنا لیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شے کا اپنے محل میں نہ ہونا ایک ایسی صورت ہے جو صریحاً عدل و قسط کے منافی ہے۔ اسی طرح اسراف و تبذیر دو لفظ ہیں جسے ہم افراط و تفریط بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسراف کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی مقدار میں خرچ ہونی چاہئے وہ اس مقدار سے کہیں زیادہ خرچ ہو جائے، اور تبذیر یہ ہے کہ رقم اس جگہ خرچ کی جائے جو اس کے خرچ کا حقیقی محل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں عدل و قسط کے منافی ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ طغیان ہے، اس کے معنی کسی چیز کے حد سے گزر جانے کے ہیں، اور تجاوز عن الحدود، اعتدال و توسط کی عین ضد ہے۔

اسی طرح ایک لفظ بخل ہے، یہ اسراف کی ضد ہے یعنی جو خرچ کا محل ہو اس میں بھی خرچ نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل بھی غیر مستحسن ہے۔ جب بخل اور اسراف دونوں غیر مستحسن ٹھہرے تو پھر عمل مستحسن وہی ہوگا جو ان دونوں کے درمیان واقع ہوگا، اور اسی درمیانی عمل کو سخاوت کہتے ہیں۔ اس بات کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ

مَلُومًا مَّعْشُورًا ﴿۲۹﴾ (نبی اسرائیل: ۲۹)

ذکو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو، اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دو کہ ظلمت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

اس آیت میں گردن سے ہاتھ باندھنے سے مراد بخل اور ہاتھ کھلا چھوڑ دینے سے مراد فضول خرچی ہے۔ اور یہ دونوں خرچ کی دو ایسی انتہائی حالتیں ہیں جو صرف یکا نقطہ عدل سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ جبین ہے جس کے معنی بزدلی کے ہیں، اور اس کے برعکس ایک دوسرا لفظ تہور ہے جو سخا کی کی حدوں کو پہنچ چکا ہو۔ یہ دونوں ہی دو انتہائی حدود عمل ہیں، اور اسی لیے ان کا شمار اعمال غیر مستحسن میں ہوتا ہے۔ ان دونوں کی درمیانی حالت کا نام شجاعت ہے، اور یہ ایک عمل مستحسن ہے۔

سطور بالا میں ہم نے تجاوز عن الوسط (Deviation From Mid Point) کی جو لفظی مثالیں دی ہیں اور بخل و اسراف سے متعلق جو قرآنی آیت نقل کی ہے اس سے بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک اسی عمل پر عمل صالح کا اطلاق ہوتا ہے جو دو انتہائی حدود یعنی غلو اور تفریط کے بجائے اعتدال و توسط کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے، اور جو عمل بھی اس دائرہ اعتدال سے باہر ہے اس پر عمل صالح کا اطلاق نہیں ہوتا خواہ وہ عمل فی نفعہ کتنا ہی اچھا ہو۔

ایک اور مثال لیجئے۔ عیائیوں نے صرف رضائے الہی کے حصول کے لیے رسیا یعنی ترک دنیا اور نفس کشی کی راہ اختیار کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کی تحسین نہیں کی کیونکہ یہ عمل اعتدال و توسط کی راہ سے ہٹا ہوا تھا، اور انسانوں کے حق میں مہلک نتائج رکھتا تھا، اور جو بعد کے ادوار میں کھل کر سامنے آ گیا۔ رہبانیت کے مہلک نتائج سے قرون وسطیٰ کی تاریخ کے صفحات پر بڑے ہیں۔

تین عمل صالح

ہر اچھا عمل جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اگر اعتدال و توسط کے حدود میں رہ کر کیا جائے

عل صالح کہلانے کا مستحق ہے، لیکن بہترین عمل صالح وہ ہے جو خدا کی راہ میں صرف اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمًا وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْصَصَةٌ فِي سَبِيلِ
 اللّٰهِ وَلَا يَطْوُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يِنَالُونَ مِنْ عَدُوِّ نِيْلًا
 اِلَّا كُنِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾
 اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ وہ اللہ کی راہ میں پیاس ٹکان اور بھوک کی تکلیفیں اٹھائیں اور
 جس راہ پر پیاس ٹکان کے لیے موجب غیظ و غضب ہو اس راہ پر وہ کام نہ کریں اور کسی
 دشمن سے اللہ کے لیے انتقام لیں اور اس کے بدلے میں ان کے حق میں ایک ٹل صالح
 لکھا جائے۔ اللہ بلیک کا۔ ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكٰى ۝ وَمَا لِحٰدِيْ
 عِنْدَكَ مِنْ لِّعْمٰةٍ تُجْزٰى ۝ اِلَّا اَبْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝
 وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (ایل: ۱۷-۲۱)

انہم کی آگ سے وہ شخص دور رکھا جائے گا جو خدا ترس ہے، اور جو اپنا مال صرف اس لیے
 (راہ خدا میں) خرچ کرتا ہے تاکہ وہ (حب مال اور جمع مال کی گندگی سے) پاک و صاف
 ہو جائے۔ اس کے اتفاق کے پیچھے کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کا جذبہ موجود نہیں
 ہوتا بلکہ وہ صرف خدا کی رضا کی طلب میں ایسا کرتا ہے۔ اور وہ عنقریب (اپنے اتفاق کے
 خوش گوار نتائج کو دیکھ کر) خوش ہو جائے گا۔

روز آخرت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عمل صالح کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی جو
 صرف نمود و نمائش کے لیے کیا جائے۔ آج بہت سے صاحب مال و دولت مسلمان آپ
 کو ایسے ملیں گے جو علانیہ فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں، اور اسلام کے کسی ایک رکن پر بھی
 عمل نہیں کرتے، لیکن غربا و مساکین کی مدد، مسجدوں، اسپتالوں، مسافر خانوں کی تعمیر، مسجدوں
 میں چراغ و پانی کا انتظام اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے اچھے کام کرتے ہیں۔ اور یہ
 محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

گمان رکھتے ہیں کہ روزِ آخرت یہ اعمال ان کی بد اعمالیوں اور خدا کے احکام سے دیدہ و دانستہ روگردانی کا کفارہ بن جائیں گے۔ ایسے لوگ سخت فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ خدا کے حکموں سے بغاوت کر کے ان کا کوئی اچھا عمل بھی روزِ آخرت ان کے لیے سود مند نہ ہوگا۔ درحقیقت وہ جو بھی اچھے کام کرتے ہیں ان کے پیچھے خدا کی رضا طلبی کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ یہ سب کام وہ صرف نمود و نمائش اور جاہ و شہرت کی طلب میں کرتے ہیں۔ اگر واقعہً ان کاموں سے خدا کی رضا مطلوب ہوتی تو پھر وہ ارکانِ اسلام اور خدا کے دیگر حکموں کی ہرگز خلاف ورزی نہ کرتے۔ خدا کے احکام سے روگردانی کر کے وہ خود ثابت کرتے ہیں کہ ان کا ایمان و اسلام صرف زبانی ہے۔ ایسے ہی ریاکاروں کے متعلق قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ
صَلْدًا ۗ لَا يَتَّقِي رُؤُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمَنَّا كَسَبْنَا ۗ (بقرہ: ۲۶۴)

وہ شخص جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور آخرت اور اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اس کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر ٹٹی پڑی ہو پس اس پر ایک زور کی بارش ہو جانے اور (اس کی ساری مٹی بہا کر) اسے بالکل صاف اور چمکنا بنا دے۔ اسی طرح ان کی ساری کمائی اکارت جانے گی اور کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ لگے گا۔

عمل صالح اور عہدِ حاضر کے مسلمان

قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو امتِ وسط کہا گیا ہے، ارشاد ہے:-

وَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

(بقرہ: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں امتِ وسط بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر

گواہ ہو۔

اس آیت میں ”امت وسط“ کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ امت ہے جو عدل و قسط کے اصولوں پر یقین رکھتی ہے، اور اس کا کوئی عمل بھی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اعدل و توسط کی ڈگر سے ہٹا ہوا نہیں ہے گویا امت وسط کی نمایاں اور ماہر الامتیاہ خصوصیت اس کے اعمال کا اعدل و توازن ہے۔ اس خطاب سے مسلمانوں کو اس لیے نوازا گیا تھا کہ وہ ہر دور میں تمام اقوام عالم کے لیے جو اپنے نظریہ و عمل میں ہمیشہ بے اعتدالیوں کا شکار رہے ہیں، ایک نبی براعتدال، نمونہ عمل بنیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے راہ وسط پر چلنے کے فیوض و برکات کا مشاہدہ کر سکیں، اور خود اس راہ پر چل کر دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کریں، لکنوذا شہداء علی الناس“ سے اسی بات کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

لیکن آج کا مسلمان اپنے اس فرض منصبی سے عملاً غافل ہو چکا ہے۔ آج اس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو بے اعتدالیوں کا شکار نہ ہو حتیٰ کہ اس کی مذہبی زندگی بھی جاہل اعتدال سے مٹی ہوئی ہے۔ میں اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ آج عمل صالح کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ جس مذہبی عمل میں جتنا ہی غلو اور تشدد اختیار کیا جاتا ہے وہ اتنا ہی عمدہ عمل قرار پاتا ہے۔ آج وہی مرد، مرد صالح ہے جو اوراد و وظائف، دعا اور نوافل کی کثرت میں سب پر سبقت لے جائے کہنے کو تو یہی کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ربانیت نہیں ہے لیکن مسلمانوں کا ایک طبقہ اسی پر عمل پیرا ہے اور اسی کو عین اسلام قرار دیتا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ غلو اور تشدد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربان کی صفت قرار دیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت فرمایا کرتے تھے:

لا تشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قومًا لبشددوا

فشد اللہ علیہم فتلک بقایا ہم فی الصوامع والدیار

اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرے۔ ایک قوم نے تشدد اختیار کیا تھا تو اللہ نے

بھی اسے سختی کے ساتھ پکڑا۔ وہ ان کے بقایا ہی تو ہیں جو تم کو راہب خانوں اور کنیوں میں

دکھائی دیتے ہیں۔

۱۔ دیکھئے تفسیر غیب القرآن (ابن قتیبہ) ص ۶۵، تفسیر القرطبی ج ۲ ص ۱۲۰ ۲۔ ابو داؤد

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعتدال و توسط کی راہ چھوڑ دینے کا نام تشدد ہے، اور یہ اُمت و وسط کی صفت نہیں ہے۔ اگر مسلمان خود کو اُمت و وسط سمجھے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں خواہ وہ مذہبی معاملہ ہو، خواہ معاشی اور خواہ معاشرتی، اعتدال و توسط کی روش اختیار کریں اور یہی عمل صالح کی راہ ہے۔

کیا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں

اس باب میں علماء کرام کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ ان علماء کا ہے جو اعمال کو ایمان کا جزو لازم سمجھتے ہیں۔ اس گروہ میں اکثر اکابر علماء سلف و خلف شامل ہیں۔ امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان علماء کا ہے جو اعمال کو ایمان کا جزو لازم تسلیم نہیں کرتے، امام ابوحنیفہؒ اور امام غزالیؒ جیسے جید علماء کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ امام غزالی اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک معصیت کی جہت سے اصل ایمان اور سب طاعتوں کا ثواب تلف نہیں فرمائے گا۔ اور یہ جو بڑا بے کہ ”ومن یقتل مؤمناً متعمداً اس سے مراد یہ ہے کہ مقتول کو جان بوجھ کر ایمان ہی کی جہت سے مار ڈالے، اور اس آیت کے نزول کا سبب بھی ایسا ہی تھا۔ اب اگر کہو کہ تمہاری تقریر سے یہ معلوم ہوا کہ تشدد مختار یہ ہے کہ ایمان بغیر عمل کے ہوتا ہے حالانکہ اکابر سلف کا قول یوں مشہور ہے کہ ایمان دل کی تصدیق، زبان کے اقرار اور اعضاء کے عمل کا نام ہے، تو اس قول سے کیا غرض ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عمل کو ایمان میں شمار کرنا کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ عمل ایمان کا تمام کرنے والا اور پورا کرنے والا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ سر اور دونوں ہاتھ مل کر انسان ہوتا

ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر سر نہ ہو تو انسان بھی نہیں رہتا، لیکن ہاتھ کٹا ہونے کی وجہ سے انسانیت سے خارج نہیں ہوتا۔ اسی طرح کہہ سکتے ہیں کہ تسبیحات اور تکبیریں اگرچہ جزو نماز ہیں لیکن ان کے نہ ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایمان میں دل کی تصدیق بمنزلہ آدمی کے سر کے ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ایمان بھی نہ ہو، اور دوسرے اعمال مثل آدمی کے ہاتھ پاؤں کے ہیں کہ بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ ”لا یزنی الزانی حین یزنی وهو مومن“ (بخاری و مسلم) تو صحابہ نے اس حدیث سے معتزلوں کا مذہب اعتقاد نہیں کیا کہ زنا کے باعث آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ فی الواقع اس کا ایمان کامل اور تمام نہیں ہے جیسے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آدمی نہیں یعنی اس میں کمال انسانی نہیں۔ یہ غرض نہیں کہ ہاتھ پاؤں کے نہ ہونے کی وجہ سے ماہیت انسانی بھی نہیں ہے۔

اس اقتباس کو غور سے پڑھئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ امام صاحب کا نقطہ نظر کہاں تک صحیح ہے؟ اس تحریر سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن و فکر پر کلیتہً منطقی و فلسفہ کا غلبہ ہے، اور اسے ہونا بھی چاہیے کہ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم مسلم فلسفی تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ عقائد و اعمال کی تشریح و توضیح، قرآن و سنت رسول کی روشنی میں کرنے کے بجائے اسے منطقی و فلسفہ کے ترازو میں تولتے ہیں۔ مذکورہ تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن و فکر پر عصری مذہبی اختلافات کا شدید اثر پایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ قرآنی آیات اور احادیث کی تشریح اس طور پر کرتے ہیں کہ اس سے اپنے مخصوص مسلک کا دفاع اور فرقہٴ معتزلہ کے خیالات کی تردید ہو جائے۔

ہمارے اسلاف یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز فکر و عمل اس کے

بالکل برعکس تھا۔ وہ ہر عقیدہ و عمل کا جائزہ قرآن مجید کی روشنی میں لیتے تھے اور اس کو سمجھ لینے کے بعد ایک سچے مومن کی طرح اس پر عمل پیرا ہو جاتے تھے۔ وہ نہ تو الفاظ کی لغوی بحثوں میں الجھتے تھے اور نہ آیات و احکام کی منطقیانہ توجیہ اور فلسفیانہ تاویل ہی کے عادی تھے کیونکہ ان کا دور مسعود، منطوق و فلسفہ کی موٹنگانیوں سے پاک تھا۔ ان کا محبوب مسلک عمل اور حسن عمل تھا، اور وہی ان کے نزدیک روز آخرت فلاح و نجات کا ذریعہ تھا۔

منطقیانہ بحث و نزاع کا دور تو اس وقت سے شروع ہوا جب عمل کی روح رفتہ رفتہ مفقود ہوتی گئی، اور اذہان پر عقلی علوم یعنی منطوق و فلسفہ کا غلبہ ہوتا گیا۔ اب ہر عقیدہ و عمل کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ قرآن مجید اور سنت رسول کے بجائے منطوق و فلسفہ کے خود ساختہ اصولوں کی بنیاد پر کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم عمل سے دور جا پڑے۔ عقائد و اعمال میں طرح طرح کی منطقیانہ نکتہ آرائیوں اور فلسفیانہ تشریحات کے نتیجے میں امت مسلمہ مختلف متخامم مذہبی فرقوں میں منقسم ہو گئی، اور آج تک عقائد و اعمال کا یہ اختلاف اور مذہبی مناقشات کا سلسلہ جاری ہے۔

ہمارے جن اکابر علماء نے اعمال کو ایمان کا جزو قرار نہیں دیا ہے، اور اس کے احتیاق و اثبات میں انہوں نے خواہ کتنے ہی منطقیانہ دلائل فراہم کر دیے ہوں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان کے اس نقطہ نظر نے ملت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ عمل سے مسلمانوں کی بے پروائی اور ارتکاب فسق و فجور کے پس پردہ ایمان و عمل کے متعلق ان کے غلط تصورات ہی کا فرما میں گئے۔ آج مسلمانوں کی اکثریت اس خیال کی قائل ہے کہ وہ کچھ بھی کریں مومن بہر حال رہیں گے اس لیے کہ وہ زبان سے اپنے مومن ہونے کا اقرار کرتے ہیں، ربا عمل تو وہ ایمان سے علیحدہ ایک چیز ہے۔

اعمال جزو ایمان ہیں

سطور ذیل میں ہم آپ کو قرآنی آیات، احادیث نبوی اور علماء اسلام کی تحریروں کی روشنی میں بتائیں گے کہ اعمال ایمان کے جزو و لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اکابر علماء

کا جو گروہ اعمال کو ایمان کا جزو لازم سمجھتا ہے وہ حق پر ہے۔

قرآن مجید سے استشہاد

نزول قرآن سے قبل ایمان کا لفظ عربی زبان میں مستعمل ضرور تھا لیکن اس کی تنگنائی میں ایمان کے ان دقیق حقائق کی سمائی ممکن نہ تھی جو قرآن نازل کرنے والے کے پیش نظر تھے چنانچہ قرآن مجید نے ایمان کے معنوی دائرے کو وسیع کرنے کے لیے متعدد جگہوں پر تشریحی جملے استعمال کیے اور بعض جگہوں پر ایمان کی جگہ دوسرے الفاظ بھی استعمال کیے تاکہ اس کا حقیقی مفہوم متعین ہو جائے۔ ہم یہاں اظہارِ مدعا کے لیے قرآن پاک سے چند مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک جگہ مومن کی تعریف میں فرمایا گیا ہے:-

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ ذَكَرُونَ ۝ (باندہ: ۵۵)

بیشک تمہارا حامی و ناصر تو بس اللہ اور اس کا رسول ہے، اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور خشوع والے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:-

الَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّذِينَ هَدَىٰ رَبُّهُمْ إِلَىٰ الصِّرَاطِ
الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ
يُوقِنُونَ ۝ (تہان: ۱-۴)

اے ایمان والو! کتابِ حکیم کی آیات ہیں، ہدایت اور رحمت ان نیکو کاروں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے رب کے فضل سے راہِ ہدایت پر گام زن ہیں، اور یہی فی الواقع کامیاب اور برابر لوگ ہیں۔

آخری آیت میں مومنین کی جگہ محسنین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور محسنین کے معنی آپ جانتے ہیں کہ عمل کرنے ہی کے نہیں بلکہ نہایت عمدہ طریقے پر عمل کرنے کے ہیں۔ پھر آگے محسنین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں یعنی اقامتِ صلوة اور ایتاءِ زکوٰۃ اور ایمان بالآخرۃ

وہ بھی اعمال (اسلام) اور ایمان ہی کے زمرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بالکل اسی مفہوم کی حامل دوسری آیتوں میں محسنین کی جگہ مومنین کا لفظ ملتا ہے، مثلاً فرمایا:

طَسَّ تَدْتَلَكْ اَيْتُ الْقُرْآنِ وَرَكْتَابِ مُبِينٍ ۝ هُدًى وَبُشْرَةً
لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ
هُمْ يُوقِنُونَ ۝

طس، یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں، ہدایت اور بشارت ان مومنین کے لیے جو نازق قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت میں چند الفاظ کو چھوڑ کر وہ تمام الفاظ بھی موجود ہیں جو محسنین والی آیت میں موجود ہیں، اور دونوں آیتوں کا مطلب بھی ایک ہے، کیا اس سے یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ پہلی آیت میں مومنین کی جگہ محسنین کا لفظ محض مومنین کی تشریح کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہوں پر بھی محسنین کی طرح مومنین کی جگہ دوسرے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں گنجائش نہیں کہ ان سب کا احاطہ کیا جائے۔

لفظ ایمان کی قرآنی تشریح و توضیح کے بعد بھی عل کو ایمان کا جزو نہ ماننا اور اس کے لغوی مفہوم ہی کو حقیقی مفہوم قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اعمال، ایمان کے جزو لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن پاک نے ایمان کے نقد و نظر کا معیار اعمال ہی کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کی بہت سی آیتوں میں ان لوگوں کے ایمان کی نفی کی گئی ہے جو غیر صالح اعمال کے ترکیب ہوں۔ ہم اس کی چند مثالیں قرآن مجید سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) اِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا بِمَا آتَاكُمُ اللّٰهُ قَالُوْا كُوْنُوْا عَلَيْنَا وَا

يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَاوَدَّ اَنْ يَّهْوٰهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ

تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسِيْكُمْ ۗ اللّٰهُ مِنْ قَبْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ عِيْنًا ۝ (بقرہ: ۹۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے

ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آیا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور اس کے اسوا بہت کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

انکا کرتے ہیں (حالانکہ وہ جس چیز کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں) وہ حتیٰ ہی ہے جو مصدق ہے اس کا بھی جو ان کے پاس ہے کہہ دو کہ اگر تم واقعہ مومن ہو تو پھر اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو؟
یعنی تمہارا عمل تمہارے ایمان کی نفی کرتا ہے۔ اگر تم صاحب ایمان ہوتے تو تم سے یہ فعل ہرگز صادر نہ ہوتا۔ تم اپنے آپ کو مومن بھی کہتے ہو اور انبیاء کو قتل بھی کرتے رہے ہو۔ ایمان کے ساتھ اس فعل کا اجتماع محال ہے۔

(۲) اَوْ كَلِمَاتٍ عَهْدًا وَعَهْدًا اٰتَيْنَا فَرِيقًا مِّنْهُمْ بَلْ اَكْتَرْتُمْ لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ ﴿۱۰﴾ (بقرہ: ۱۰)

اور جب کبھی انہوں نے کوئی عہد بیان کیا تو ان کے ایک فریق نے ضرور اسے پس پشت ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں رکھتے۔
اس آیت میں نقص عہد کو ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے یعنی وہ مومن نہیں جس میں عہد و پیمان کا پاس و لحاظ نہیں ہے۔

(۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا اٰتَيْنَاكُمْ

بِقُوَّةٍ وَّاٰسْمِعُوا . قَالُوْا سَمِعْنَا وَّعَصَيْنَا . وَاَشْرٰٓءُوۡا فِیۡٓ فَاۡوِیۡهِمُ الْجِبَلُ

يٰۤاٰهٰرُ كُمْ يٰۤاٰهٰرُ كُمْ يٰۤاٰهٰرُ كُمْ اِنۡ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيۡنَ ﴿۱۲﴾ (بقرہ: ۱۲)

اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور طور کو تمہارے اوپر بلند کر کے کہا ”جو کچھ ہم نے تم کو

دیا ہے اسے پوری قوت سے پکڑ لو اور (باتوں کو) سنا کر دو“ انہوں نے جواب میں کہا

”ہم نے سنا اور نافرمانی کی“ اور ان کے کفر کے سبب بچھڑانے کے دلوں میں رنج بس گیا

تھا کہہ دو کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان بھی کیا خوب ہے جو تم کو ایسی بری باتوں کا حکم دیتا ہے

یہودی ہر طرح کی بد اعمالیاں کرتے تھے حتیٰ کہ خدا کی نافرمانی میں بالکل چھوٹ تھے

اور کلمہ کھلا فعل شرک کا ارتکاب کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مومن

بی کہتے تھے۔ اس آیت میں ان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم واقعی اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہو تو

تمہارا ایمان بھی کیا خوب ایمان ہے جو تم کو ایسے گندے افعال کے کرنے کا حکم دیتا ہے حالانکہ

حقیقی ایمان کا ان بری باتوں سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے۔

(۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ - (بقرہ: ۲۷۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جتنا کچھ سود بھی (کسی کے ذمہ) باقی ہو اس کو چھوڑ دو اگر تم واقعی مومن ہو۔

اس آیت میں سودی کاروبار کرنے والوں کو مومن قرار نہیں دیا گیا ہے چنانچہ اس کے بعد والی آیت میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو سود لینے اور دینے سے باز نہیں آتا اسے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

(۵) قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۚ قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۸۵﴾ (اعراف: ۸۵)

اس نے کہا "اے قوم کے لوگو! صرف ایک اللہ کی اطاعت و بندگی کرو" اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح اور روشن دلائل آگئے ہیں۔ پس (تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ) تم پورا پورا اپنا پورا دینو اور لوگوں کے مال میں کمی نہ کرو، اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ اگر تم واقعی مومن ہو۔

اس آیت میں ایمان کے بعد ناپ تول میں کمی کرنے کو ایمان و عدل کے منافی بتایا گیا ہے اور اسے فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۶) وَلَا تَلْمِزُوا أُمَّةً قَالَتْ إِمَّا يَأْتِيكُمُ الْبَيِّنَاتُ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَعْلَمُونَهَا سِيَرَةَ قَوْمِهِمْ كَمَا عَدُوٌّ لَهُمْ أَحْسَنُ يَوْمَ تُنْفَخُ الْأَسْفَادُ يَرْجِعُونَ كَلِمَةَ اللَّهِ وَكَرِهُواهَا وَأَخَذُوا بِرَبِّكُمْ إِذْ كَانَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا الْأَمْرُ الْأَكْبَرُ ﴿۱۶۴﴾ (نور: ۱۶۴)

اور تم نے جب اس بات کو سنا تھا تو یہ کیوں نہ کہا کہ ہم کو یہ باتیں کہہ کر ہم ایسی بات منسے نکالیں معاذ اللہ، یہ تو بہت بڑا بہتان ہے اللہ تم کو تیبہ کرتا ہے کہہ رہی حرکت دوبارہ نہ کرنا اگر فی الواقع تم ایمان والے ہو۔

اس آیت میں بہتان تراشی کو خلاف ایمان قرار دیا گیا ہے۔

(۷) أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ﴿۱۸﴾ (سجده: ۱۸)

کیا جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی مانند ہو جائے گا جو فاسق ہو، دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں مومن کو فاسق کی ضد بتایا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فاسق کے معنی نافرمان اور بد عمل کے ہیں۔ جب مومن فاسق کی ضد ہو تو مومن کے معنی فرماں بردار اور نیکو کار کے ہوئے۔ اسی بات کو قرآن مجید میں ایک جگہ دوسرے اسلوب میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبِيبٌ إِلَيْكُمْ إِلَا يُبَاتُ وَرَيْبَةً فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهًا لِأَيْكُمُ

الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّشِيدُونَ ﴿۷﴾ (حجرات: ۷)

لیکن اللہ نے تمہاری نظروں میں ایمان کو پسندیدہ بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں کو اس

سے زینت بخشی ہے۔ اور (اسی طرح) کفر، بد عملی اور نافرمانی کو تمہاری نظروں میں پسندیدہ

نہا دیا ہے۔ ایسے ہی لوگ دراصل ہدایت یافتہ ہیں۔

یہ آیت ہم کو بتاتی ہے کہ کفر، فسوق اور عصیان ایمان کے منافی ہیں۔ کفر کے معنی

انکار، فسوق کے معنی نافرمانی اور عصیان کے معنی کھلم کھلا ارتکاب جرم کے ہیں۔ قرآن کہتا

ہے کہ ان عناصر ثلاثہ کا اجتماع ایمان کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی

مومن بھی ہو اور اس کا قلب، کفر، فسوق اور عصیان سے داغدار بھی ہو۔ مومن ان اکتسابی

سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ اسی کو آیت مذکورہ میں حبت ایمان اور زینت ایمان سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک مومن شرور اور ذنوب سے اس طرح دور بھاگتا ہے جس طرح ایک

نفس الطبع آدمی گندگی سے دور رہتا ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے۔ اور ایمان

اس کو اسی طرح محبوب ہوتا ہے اور اس کے قلب و دماغ کی زینت بنا ہوتا ہے جس

طرح رنگ و بو پھول کی زینت ہے اور ہر خوش ذوق انسان کے دل میں اس کی محبت و طلب

جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی بات کو ایک جگہ قرآن پاک میں "کتبت فی القلب" بھی کہا گیا ہے۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ ﴿۲۲﴾ (مجادلہ: ۲۲)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے۔

قرآن مجید میں آپ دیکھتے ہیں کہ بعض مقامات پر ایمان لانے والوں کو ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں ”آمِنُوا“ کا لفظ آتا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا (نار: ۱۳۶)

اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔

اس آیت کا پہلا کلمہ جو خطاب ہے اس سے مراد اقرار لسانی ہے اور دوسرا کلمہ (آمِنُوا) جو تکرار ہے اس کا مطلب عمل ہے یعنی اے لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو عمل سے بھی ایمان لاؤ۔ ایمان اور عمل کی اس حقیقت کو قرآن پاک کی اس آیت میں نہایت عمدہ طور پر بیان کیا گیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَ
جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ ۗ أُولَئِكَ هُمُ
الضَّالِقُونَ ۝ (حجرات: ۲۹)

بیشک حقیقی مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی مومن وہی ہے جو صرف زبان ہی سے ایمان نہیں لانا بلکہ عمل سے بھی اس کا ثبوت دیتا ہے اور ثبوت یہی ہے کہ وہ ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں جان اور مال دونوں سے جدوجہد کرتا ہے۔ فی الواقع سچے ایمان کی کسوٹی امتحان اور عمل ہی ہے۔ جو شخص خدا کی راہ میں نہ جان کی پروا کرے اور نہ ہی انفاق مال سے گریز کرے اس کے مومن صادق ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ جان اور مال ہی دو ایسی چیزیں ہیں جن سے ایک انسان کو انتہائی قلبی تعلق ہوتا ہے اور جب جان و مال سے زیادہ عزیز ایمان ہو جائے تو پھر ایمان کے کامل ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ایمان ایک پوشیدہ قلبی حالت کا نام ہے اور اس کا جاننا اسی

وقت ممکن ہے جب آدمی زبان سے اس کا اظہار کرے، لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ زبان سے ایمان کا اقرار کرے لیکن حقیقت وہ وہ من نہ ہو اس لیے صادق و کاذب کے درمیان فرق دینا یا رکاز لایہ صرف عمل ہی ہو سکتا ہے عمل ہی تباہی کا لگول اپن دعویٰ ایمان میں بچا ہے اور کون بتیو لیا، قرآن پاک سے عمل ہی کو ایمان کے صدق و کذب کی سوٹی قرار دیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَجِرَاتٍ فَاصْتَجُوْهُنَّ
 اِنَّهُنَّ اَعْلَمْنَ بِاِيْمَانِهِنَّۙ فَاِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ اِلٰى الْكُفْرٰٓءِ

(متحدہ : ۱۰)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مہاجر عورتیں آئیں تو ان کے متعلق خوب اپنی طرح جانچ پرکھ کر لو، اللہ ان کے ایمان سے خوب باخبر ہے، پس اگر وہ امتحان کے بعد موثرت ثابت ہو جائیں تو انھیں کفار کے حوالہ نہ کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایمان ایک پوشیدہ چیز ہے اور اس کا صحیح صحیح حال صرف خدا ہی جانتا ہے۔ انسان صاحب ایمان کے عمل ہی کو دیکھ کر اس کے متعلق کچھ جان سکتا ہے۔ مذکورہ آیت میں امتحان سے یہی مراد ہے کہ ان کے طرز عمل پر نظر رکھی جائے اور جب ان کے ظاہری اعمال سے معلوم ہو جائے کہ وہ واقعہً مخلص اور مومن عورتیں ہیں تو پھر انھیں کفار کے حوالہ نہ کیا جائے۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ ایمان قلب کی ایک کیفیت یا صفت کا نام ہے اور اعضاء سے اس کا اظہار عمل ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ قلب میں ایمان ہو اور اس کا اظہار اعمال سے نہ ہو۔ اگر خوف کے وقت دل کی دھڑکن کے ساتھ ہی اعضاء و جوارح میں لرزہ پیدا ہو سکتا ہے، خوشی کے وقت فرط مسرت سے چہرہ گلنار ہو سکتا ہے، امیدوں اور آرزوؤں کی کامرانی دیکھ کر باجھیں کھل سکتی ہیں اور دل کے مغموم ہونے سے چہرہ افسردہ و طول اور آنکھیں اشک آلود ہو سکتی ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دل حرارت ایمان سے پر جوش ہو اور اعضاء و جوارح پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو۔

اگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی کو عمل کے جزو ایمان ہونے میں کسی طرح کا کوئی

شبیہ ہو تو وہ قرآن مجید کی اُن تمام آیتوں پر ایک نظر ڈال لے جو ”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ سے شروع ہوتی ہیں ہم یہاں بطور مثال چند آیات قرآنی درج کرتے ہیں :

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحَسُنَ مَا أَجْرُهُمْ (رعد-۲۹)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے خوش حالی اور نیک فرجامی ہے۔

ایک دوسری جگہ آیا ہے :

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (تین-۶)

مگر ان وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لیے غیر منقطع بخشش ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے :

وَالْعَصِيرُ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر)

قسم ہے زمانے کی، انسان بڑے خسارے میں ہے بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے

اور اچھے عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق بات اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

قرآن پاک میں ہر جگہ ”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا“ کے ساتھ ”وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کے کلمے

کا التزام خود تبار با ہے کہ ایمان اور عمل میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ میں یہاں

آپ کی توجہ ایک اہم قرآنی نکتہ کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات

پر ایمان اور عمل صالح کی جزا کو باغات اور نہروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے یعنی جو

ایمان لائے گا اور اچھا عمل کرے گا اس کو آخری زندگی میں بطور جزا باغات اور نہریں ملیں

گی۔ اس پر تھوڑا اٹھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف روز جزا کی تمثیل ہی نہیں ہے بلکہ

معنوی طور پر ایمان اور عمل صالح کے تعلق اور اس کی افادیت و لزوم کو بھی ظاہر کر رہا ہے

درخت کو دیکھیں کہ اس کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ زمین کے اندر پیوست ہوتی

ہیں اور شاخیں آسمان کی طرف پھیل کر ایک سائبان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور باس ٹھہرتی

وہ اپنے سائے اور پھلوں سے مخلوق خدا کو آرام و راحت پہنچاتی ہیں لیکن درخت کی تبادلہ

اور اس کی راحت رسائی نہروں کے وجود پر منحصر ہے۔ اگر درخت کو پانی نہ ملے تو درخت نہ سر سبز و شاداب رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے پھل پھول سے انسان کو کوئی لطف و راحت پہنچا سکتا ہے۔

یہی حال ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ نخل ایمان کی جڑیں قلب کی گہرائیوں میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں (اعمال) باہر پھیل کر اس کے وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس طرح باغ کا وجود پانی پر منحصر ہے اسی طرح نخل ایمان بھی صرف اسی صورت میں شاداب رہ سکتا ہے اور بندگانِ خدا کو نعمتِ ایمان کی حلاوتوں سے شاد کام کر سکتا ہے جب اعمالِ صالحہ کی نہریں اسے برابر سیراب کرتی ہوں۔ اگر اعمالِ صالحہ کی نہریں نہ ہوں تو شجرِ ایمان نہ پھل پھول لاسکتا ہے اور نہ ہی زیادہ دنوں تک اپنے وجود کو قائم رکھ سکتا ہے۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ اچھا درخت اچھی زمین میں پھل نہ دے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ نخل ایمان کی جڑیں قلبِ سلیم میں موجود ہوں اور وہ پھولوں اور پھلوں (اعمالِ صالحہ) سے محروم ہو۔ جس طرح درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح حقیقی ایمان کی شناخت کا ذریعہ اچھے اعمال ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:-

”کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور برا درخت برا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت برا پھل نہیں لاسکتا نہ برا درخت اچھا پھل لاسکتا ہے۔ جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ پس ان کے پھلوں سے تم ان کو پہچان لو گے۔“ (متی، باب: ۱۷: ۲۰)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر اعمال جزو ایمان ہوتے تو پھر امنوا کے بعد و عملوا الصلوات کے جملے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور ایمان پر اعمال کا عطف لا حاصل ہوتا اور تکرار کہلاتی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ ایمان کے معنی تصدیق اور ایقان کے ہیں لیکن دینی اصطلاح بن جانے کے بعد اس کے مفہوم میں کافی وسعت پیدا ہو گئی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے لغوی مفہوم کے ساتھ ہی اس کے اصطلاحی مفہوم کو بھی جگہ جگہ واضح کر دیا جائے تاکہ اہل ایمان کو اس لفظ کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے اور وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ لفظ ایمان سے اللہ کا مقصود کیا ہے؛ اگر اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت نہ کی جاتی تو یہ اپنے لغوی معنی ہی میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ اسی لیے قرآن پاک میں جہاں کہیں "ان الذین امنوا" کا جملہ آیا ہے اسی سے متصل "وعملوا الصلحت" کا جملہ بھی موجود ہے۔ یہ دراصل "امنوا" کی تشریح ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حمید الدین فراہی فرماتے ہیں:

”قرآن مجید میں ایمان کے بعد جو عمل صالح کا ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی توضیح و تفصیل ہوتی ہے۔ اور اس کی نوعیت بعینہ وہی ہوتی ہے جو عطف خاص علی العام کی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اطاعت رسول کو اطاعت اللہ پر عطف کیا ہے۔ یہ بھی عطف تفصیل ہے۔ کل کے بعد جزو اور عام کے بعد خاص کا ذکر کر کے تفصیل کی جاتی ہے کیونکہ بعض الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل واضح ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے، اور عقل و دل کے معاملہ میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس لیے ایمان کے دو شاہد قرار دئے گئے ایک قول اور دوسرا عمل؛ چونکہ قول بھی جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن قرار نہیں دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل بھی اس کے ایمان کی تصدیق کرے۔ پس عمل ایمان کی کسوٹی ہے۔“

۱۰ تفسیر سورہ والحصہ - صفحہ ۲۲

”امنوا“ کے لجد ”و عملوا الصلحت“ کا جملہ صرف ایمان کی توضیح و تفصیل ہی نہیں کرتا بلکہ ایمان اور عمل کے درمیان جو پوشیدہ ربط و تعلق ہے اس کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح کے ربط و تعلق کی دوسری مثالیں بھی قرآن مجید میں موجود ہیں، مثلاً اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ اس آیت میں درجہ بدرجہ اس تعلق کو واضح کیا گیا ہے جو اطاعت اللہ، اطاعت رسول اور اطاعت اولی الامر میں پایا جاتا ہے یعنی اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی لازم ہے کیونکہ وہ اللہ ہی کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے، اور اسی طرح اولی الامر کی اطاعت بھی مسلمانوں پر اس وقت تک لازم ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی راہ پر گام زن ہے۔

اس ربط و تعلق کی دوسری مثال اقیما الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ ہے۔ اقیما الصلوٰۃ پر و اتوا الزکوٰۃ کو عطف کر کے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کے گہرے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بیشتر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ امر ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا وجود لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں کسی طرح کی تفریق جائز نہیں ہے۔ یہی حال امنوا و عملوا الصلحت کا بھی ہے۔ اس میں و عملوا الصلحت کا جملہ ایمان کے ساتھ اس کے لازمی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

احادیث سے استشہاد

احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ایمان کے تتر سے اوپر شعبے ہیں۔ ان میں سب سے افضل لالا الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹا دینا ہے اور حیا بھی ایمان کا جز ہے،“

سہ بخاری و سلم۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی ہم سے خطاب فرمایا تو کم ہی ایسا ہوا ہے کہ آپ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں، اور اس شخص میں دین نہیں جو عہد کا پابند نہیں۔“

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ:-

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔“

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب افضل ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

”افضل ایمان یہ ہے کہ تم اللہ ہی کے لیے کسی سے محبت کرو اور اللہ ہی کے لیے کسی سے بغض و نفرت رکھو اور اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں لگانے رکھو۔“ حضرت معاذؓ نے عرض کیا ”اور کیا یا رسول اللہ؟“ آپ نے فرمایا ”دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو اور ان کے لیے بھی اس کو ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو۔“

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”ایمان والوں میں زیادہ کامل الایمان وہ شخص ہے جس کا اخلاق ان میں سب سے بہتر ہو۔“

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نظر میں اس کے ماں باپ اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

بخاری ہی میں ایک دوسری روایت عبداللہ بن ہشام سے ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:
 ”ہم ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔
 آپ نے حضرت عمرؓ کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں تھام رکھا تھا۔ حضرت
 عمرؓ کہہ رہے تھے ”یا رسول اللہ لانت احب لی من کل شیء الا
 نفسی الّتی بین جنبی (یا رسول اللہ آپ مجھے سوا اپنی جان کے،
 ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں)۔ آپ نے فرمایا لا والذی نفسی بیدک
 حتی اكون احب الیک من نفسک“ (اس کی قسم جس کے
 ہاتھ میں میری جان ہے، ایسا نہیں جب تک کہ میں تم کو تمہاری جان
 سے بھی عزیز نہ ہو جاؤں) حضرت عمرؓ نے فرمایا ”واللّٰہ لانت احب
 الی من نفسی“ (خدا کی قسم آپ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں)
 آپ نے فرمایا ”الآن عمر“ (عمر اب ایمان کا معاملہ پورا ہو گیا)

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے ایمان و عمل کا
 سرچشمہ ہے۔ محبوب سے سچی محبت کی علامت کیا ہے؟ یہی کہ محبت کرنے والا اس
 کے ہر ایک فعل کا کامل اتباع کرے اور اس کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دے، اور
 کبھی کوئی ایسا کام نہ کرے جو اس کے محبوب کی مرضی اور پسند کے خلاف ہو بلکہ ہمیشہ وہ
 کام کرے جس سے محبوب کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل ہو سکے، غرض یہ کہ تن من
 سے اس کا جہاں تثار بن جائے۔ زبان سے محبت کا دعویٰ کرنا اور محبوب کی کوئی بات نجی
 نہ ماننا اور ہر وہ کام کرنا جو محبوب کی نظر میں ناپسندیدہ ہو، صریحاً ریاکاری ہے۔

ایک روایت حضرت ابوالمہدی سے بھی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:-
 ”ہا ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ”ایمان کیا ہے؟
 آپ نے فرمایا: ”جب تمہیں اپنے اچھے کام سے خوشی اور برے کام سے
 تکلیف اور افسوس ہو تو تم مومن ہو۔“ اس نے عرض کیا ”گناہ کیا چیز ہے؟“
 فرمایا ”جب تیرے دل میں کوئی چیز تردد پیدا کرے اور مشتبہ معلوم ہو تو

اسے چھوڑ دے" سہ

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی یعنی اچھے کام کو ایمان قرار دیا ہے اور برے فعل کو ایمان کی ضد یعنی گناہ بتایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لفظوں میں ایمان اور نیکی و بدی کے متعلق جو بصیرت افروز اور دانش مندانہ بات ارشاد فرمائی ہے وہ ایمان کے حقیقی مفہوم اور نیکی و بدی کی حقیقت کو بالکل واضح کر دیتی ہے اور نیکی و بدی کے متعلق تمام جدید و قدیم فلسفیانہ توجیہات سے کہیں زیادہ بلند و بزرگ ہے۔

علماء اسلام کی تحریروں سے استشہاد

علماء اسلام کی اکثریت اسی بات کی قائل ہے کہ اعمال ایمان کے جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم امام بخاریؒ کی رائے نقل کر چکے ہیں سہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:-

”بیشک تو زبان سے کہتا ہے کہ کوئی 'معبود' نہیں سوا اللہ کے اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں مگر جان لے کہ اس سے تجھ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یاد رکھو ایمان کے دو جزو ہیں، ایک قول اور دوسرا عمل، قول اس وقت تک نفع نہ دے گا جب تک کہ دوسرا جزو یعنی عمل بھی نہ ہو۔ اگر تو گناہ کرنا چلا جائے، خدا کی مخالفت پراڑا رہے اور برائیوں پر اصرار کرتا رہے، نماز، روزہ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور خیر خیرات سے غافل رہے، غرض یہ کہ نیکی کے سارے کاموں کو طاق لیاں میں ڈال کر صرف ان زبانی گواہیوں پر اکتفا کرے تو اس سے تجھے قطعاً کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ تیری یہ زبانی شہادت دلیل کی طالب ہے، تو معبود کسی کو کہہ رہا ہے اور اطاعت کسی کی کر رہا ہے۔“ سہ

سہ احمد۔ سہ فرماتے ہیں ہو (ایمان) قول و فعل یزید و ینقص۔ سہ خطبات غوث الاعظم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں:

”کیا یہ بات افسوسناک نہیں ہے کہ تمہاری زبان تو مسلمان رہے اور فعل کافر، جلوت میں تو مسلمانی کی بہار ہو اور خلوت میں کفر کی خزاں تمہاری روح کے گلشن پر طاری ہو“۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایمان کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”تم کو کامیابی نہیں مل سکتی ہے۔ اس کی سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان، یقین، اطمینان، جماؤ، تسکین اور اقرار پیدا ہو۔ لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل اور تصور کا یہ نقشہ کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں، ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ نہ نہ کر لوگے صرف پہلی منزل کو طے کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس دوسری منزل کا نام قرآن مجید کی بولی میں عمل صالح ہے یعنی وہ کام جو اچھا ہے، جسے اچھائی کے ساتھ کرنا ہے۔ سچائی اور صحیح طریقے سے انجام دینا ہے“۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ عمل کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اسلام، ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت و سبب ہے۔ یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم بریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اب اگر کوئی ایسا شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں ایمان کے مطابق کوئی تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہئے کہ ایمان

نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نئی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور یوں کا وصف لازم بتاتا ہے۔^۱

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

”قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو عمل صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے۔ جب وہ اس دعویٰ کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے جب تک بیج زمین میں نہ ہو کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لا کر عمل صالح کریں۔“^۲

جزائے اعمال

جزائے اعمال کی دو صورتیں ہیں، ایک دنیوی جزا اور دوسری اخروی جزا۔ تورات میں اعمالِ حسنہ کی جو جزا بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کو ای دنیا میں مال و دولت، جاہ و چشم

^۱ سیرت النبی، جلد چہارم صفحہ ۸۸۷۔

^۲ تفہیم القرآن، جلد ششم تفسیر سورہ والعصر، صفحہ ۲۵۳۔

اور ملک و حکومت حاصل ہو جائے۔ رُبط گویا اس کے یہاں جزا کا تصور بالکل دنیاوی ہے۔ اس کے برعکس انجیل میں جزا کا جو تصور دیا گیا ہے وہ خالص اُخروی ہے۔ یعنی آسمانی بادشاہی۔ قرآن مجید کا نقطہ نظر دیگر امور کی طرح اس معاملے میں بھی عقلی اور روحانی دونوں اعتبار سے زیادہ جامع اور کامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مومن کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور اُس دنیا (دار آخرت) میں بھی عمدہ جزا ہے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے۔

فَأَشْرَهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحَسَنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُجِبُ

الْمُحْسِنِينَ ۗ (آل عمران: ۱۴۸)

اللہ نے انھیں دنیا کا اجر دیا اور آخرت کا بہترین اجر بھی، اور اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيٰوةً

طَيِّبَةً، وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (نحل: ۹)

جس نے اچھا کام کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اسے ایک پاکیزہ

زندگی گزارنے کے تمام وسائل فراہم کریں گے۔ اور اُن کے کاموں پر ہم اُن کا بہترین

اجر انھیں عطا کریں گے۔

دنوی جزا

اس دنیا کی جزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ مومن کو ذلت و مسکنت، تنگی معا

اور بے خونی و بے اطمینانی کی جگہ عزت و سروری، فراخی رزق اور ذہنی و قلبی اطمینان و

سکون حاصل ہو جائے لیکن ایک مومن کے لیے دراصل سب سے عمدہ جزا یہ ہے کہ

اس کی زندگی ایک پاکیزہ اور نیکو کار انسان کی زندگی ہو جائے اور اسے روحانی مسرت

اور قلبی سکون کی وہ دولت بے بہا مل جائے جس کے مقابلے میں دنیا کا ہر سامان لطف

وراحت ناچیز ہے۔ روحانی مسرت اس کے سوا اور کیا ہے کہ مومن کا قلب ہر طرح کی حرص و ہوا، بغض و حسد اور حزن و طال کے داغ دھبوں سے پاک صاف ہو کسی آدمی کو دنیا کا ہر سامانِ عیش و تنعم مل جائے لیکن اس کے قلب کو اطمینان و سکون اور اس کی روح کو مسرت و شادمانی حاصل نہ ہو تو مادی نعمتیں اور ہر طرح کی عزت و سر بلندی اس کے لیے بے کار و بے سود ہے۔ قلبی تسکین اور روحانی انبساط ایک ایسی سعادت ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے ہر صالح اور نیکو کار بندے کو نوازتا ہے۔ اسی کو آیت مذکورہ میں حیاتِ طیّبہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ تو ایک مومن کی انفرادی جزا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کی جماعت کو اجتماعی جزا سے بھی نوازتا ہے اور یہ زمین میں غلبہ و اقتدار ہے :

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي

الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ (نور: ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے اور اچھا عمل کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین کی خلافت عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو خلافت عطا کی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض خدا کی وہ بہترین جزا ہے جس سے وہ اس دنیا میں مومنوں کو نوازتا ہے۔ استخلاف فی الارض کا جملہ صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد صرف کسی خطہٴ ارض پر حکومت نہیں ہے بلکہ زمین کے ایک بڑے حصے پر غلبہ و اقتدار اعلیٰ مراد ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہیں دنیا کی تمام طاقتوں پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

اس آیت سے بعض حضرات بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ آج زمین کے ایک بڑے حصے پر ان لوگوں کی حکومت ہے جو ایمان اور عمل صالح سے محروم ہیں، بلکہ بعض ملکوں جیسے روس و چین وغیرہ میں ایسی جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں جو نہ صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ سے تہی دامن ہیں بلکہ خدا کے وجود کی بھی قائل نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خود کو مومن کہنے والے اگرچہ بعض جگہوں پر ملک و حکومت

کے مالک ضرور ہیں لیکن کفار اور فاسقین کے مقابلے میں پست و کمزور ہی نہیں بلکہ ہر شے جیسا میں ان کے محتاج و دست نگر بھی ہیں۔ کم نظر اور کوتاہ فہم لوگ اس صورت حال کے پیش نظر استخلاف فی الارض کی عجیب و غریب تاویلات کرتے ہیں اور جو لوگ جہل و کوری میں مبتلا ہیں وہ وعدہ خداوندی کی صداقت کے بارہ میں مشکوک ہو جاتے ہیں۔

یہ دنیا دار العمل ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز خواہ وہ مال و دولت ہو، خواہ صحت و قوت، خواہ عزت و شہرت اور خواہ ملک و حکومت، سب کے حصول کے لیے ایک ضابطہ اور قانون مقرر فرما دیا ہے، اور یہ کسب و سی کا قانون ہے۔ لیس للانسان الاماسعی (انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے) کسب و سی کا یہ قانون ہر فرد اور جماعت کے لیے یکساں ہے، اس میں مومن و کافر کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اگر ایک کافر اور منکر خدا بھی زمین میں تخم ریزی کرتا ہے اور اس کے بار آور ہونے کے تمام اسباب و وسائل فراہم کرتا ہے اور ہر طرح کی محنت و مشقت کرتا ہے تو زمین سے غلہ ضرور پیدا ہوگا۔ زمین صرف اس بنا پر اس کی سعی و محنت کو نتیجہ خیز ہونے سے نہیں روک دے گی کہ بیج ڈالنے والا ایک کافر و منکر ہے۔ زمین سے غلہ اگانے کے لیے جو قانون اور ضابطہ حکیم مطلق نے بنا دیا ہے اگر اس کی پیروی ایک کافر و منکر بھی کرتا ہے تو وہ اس دنیا میں اپنے عمل اور سعی و محنت کے نتائج سے محروم نہیں رہ سکتا۔ یہی حال ہر کسب خیر کا ہے۔

زمین پر غلبہ و اقتدار کا معاملہ بھی اسی کے تابع ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں عروج و سر بلندی اسی قوم کو ملتی ہے جو نظم و اتحاد، صبر و ثبات، عزم و استقلال، جہد مسلسل اور ایثار و قربانی کے اوصاف سے مشہف ہوتی ہے، اور جو قوم عروج کے ان عناصر ترکیبی سے محروم ہوتی ہے اس کے خانہ تقدیر میں ذلت و نکبت اور محتاجی و غلامی لکھ دی جاتی ہے۔

عہد رسالت کی ساری ظفر مندیاں اور دو خلافت کی ساری عظمت و سر بلندیاں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے سوز لقیں، جوش و غل، صبر و ثبات، ایثار جان و مال اور خدا کی ذات پر غیر مترزل اعتماد و توکل کا نتیجہ تھیں۔ دنیا میں آج بھی جو قوم بام عروج پر فائز

ہے اس کا سبب بھی ان کا قومی اتحاد، ذہنی بیداری، حربی علوم میں ان کا تفوق اور ایثار و قربانی ہے۔ جرمن اور جاپانی قوم اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ روس اور امریکہ کی معاشی قوت اور حربی برتری کا راز بھی اسی جہد مسلسل میں پوشیدہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قوموں کے عروج و زوال اور عز و نصب کا ایک متعین قانون الہی ہے اور تاریخ کے ہر دور میں عروج و زوال کا یہ قانون بلا امتیاز ملک و قوم اور مذہب و مسلک اپنا کام کرتا رہا ہے۔ اگر کوئی انسانی جماعت زوال یعنی اختلاف و انتشار، بزدلی و بے غیرتی، عجلت و بے صبری، ذہنی و فکری جمود و تعطل (Mental Stagnation) اور غیر کوشی و نفس پرستی کی راہ میں گام زن ہو جائے تو اسے یقیناً شکست و نامرادی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ قانون زوال کے نتائج یعنی ذلت و نکبت سے صرف اس وجہ سے نہیں بچ جائے گی کہ وہ اعتقاداً مسلم ہے۔ اسی طرح اگر کوئی انسانی جماعت عروج کی راہ میں گام زن ہے یعنی اتحاد و اتفاق، عقلی بیداری اور سخت کوشی و جاں فروشی کا مظاہرہ کرتی ہے تو وہ صرف اس وجہ سے اپنے ایثار و عمل کے ثمرات سے محروم نہ رہے گی کہ وہ کافروں اور منکروں کی جماعت ہے۔

بلاشبہ اگر انسانوں کی کوئی ایسی جماعت تیار ہو جائے جو صحیح معنوں میں مومن و مسلم ہو اور ساتھ ہی جاں فروشی کے لیے بھی کمر بستہ ہو تو دنیا کی ہر قوم خواہ وہ مادی عروج و اقبال کے کسی مقام پر بھی فائز ہو، اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گی کیوں کہ اس جماعت کے ساتھ ہمیشہ خدا کی نصرت و حمایت ہوتی ہے اور جس قوم کو خدا کی نصرت و حمایت حاصل ہو جائے اسے کون شکست دے سکتا ہے :

لَا يَنْصُرُكُمْ اللَّهُ فَلَا تَغْلِبْ لَكُمْ. (آل عمران: ۱۶۰)

اور اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

آج زمین پر کفار و منکرین کا غلبہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلم قوم اس معیار پر پوری نہیں اترتی یعنی ایمان اور عمل صالح کے معیار پر، جو اللہ نے اسے زمین کی خلافت عطا کرنے کے لیے معین کر رکھا ہے۔ زمین پر کفار و منکرین کو غلبہ دے کر اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر

یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ زمین کی خلافت ان کا کوئی پیدائشی حق نہیں ہے کہ وہ خواہ کسی ہی سیرت و کردار کے مالک ہوں، زمین پر غلبہ و اقتدار اعلیٰ بہر حال انہی کو حاصل ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو امام عالم بناتے وقت ان کے اس سوال ”ومن ذریعتی“؟ کے جواب میں ارشاد فرمائی ہے۔

لَا يَتَّالِ عَهْدِي مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۷۴﴾ (بقرہ: ۱۷۴)

میرا عہد ظالموں کے ساتھ نہیں ہے۔

فی الواقع اللہ تعالیٰ اس دنیا میں غلبہ و اقتدار اسی قوم کو عطا کرتا ہے جو اس کی اہل ہوتی ہے کسی نا اہل کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے سرفراز نہیں کرتا، اور جب اہل بھی نا اہل ثابت ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے زمین کا اقتدار چھین لیتا ہے۔ فرمایا:

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغْتَبِرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ

يُغْتَبِرُوا مَا يَأْنِفُسُهُمْ ۖ (انفال: ۵۳)

اللہ کی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔

جس اہلیت کی بنیاد پر کسی قوم کو زمین کا وارث بنایا جاتا ہے اس کی دو شرطیں ہیں، ایک ایمان و عمل صالح اور دوسری کسب و سعی۔ اگر کوئی قوم بھی ان دو شرطوں پر پوری نہیں اترتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ زمین کا اقتدار اس قوم کے سپرد کرتا ہے جو کسب و سعی اور اہلیت کے اعتبار سے دوسری قوموں پر برتری رکھتی ہے۔ یہ وہ قانون قدرت ہے جو روز ازل سے متعین ہے اور کسی حال میں بھی تبدیل نہیں ہوتا:-

وَلَكِنْ يَجْعَلُ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿۶۲﴾ (احزاب: ۶۲)

اور تم اللہ کے طریقے میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

آخری جزا

ایک مومن کے اعمال حسنہ کی دوسری جزا اخروی ہے یعنی بہشت جاوداں۔ اخروی

جزا ہی مومن کی اصل جزائے عمل ہے کیوں کہ وہ غیر منقطع اور غیر فانی ہے۔ اس جزا کا ذکر قرآن مجید میں کثرت سے آیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے :-

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿۱۲۲﴾ (نساء: ۱۲۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کی ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۲﴾ (اعراف: ۲۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، اور ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ جَنَّاتٍ عَذْرَىٰ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ جَزَاءُ مَنْ سَزَا ﴿۷﴾ (طہ: ۷)

اور جو شخص اس کے پاس مومن بن کر اچھے اعمال کے ساتھ آئے گا اس کے لیے بلند درجات ہیں، ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی جزا ہے ہر اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔

آخری جزا کا مادی تصور

آخری جزا کا ایک تصور تو قرآن نے وہ دیا ہے جس میں جنت کی پر بہار نعمتوں اور اس

کی داریا آسائشوں کا ذکر ہے یعنی گھنے باغات، ارواں چشمنے، نخل ممدود، انواع واقسام کے پھل، لیزر و دل پسند مشروبات، پیری تمثال حوریں، حاضر باش غلام و خدام، تحیات و سلام سے معمور فضائیں اور بے تکلف آراستہ مٹھل احباب وغیرہ۔ یہ تصور جزا تمام تراویہ ہے۔ ان نعمتوں کا ذکر قرآن مجید نے ایک جگہ بڑے دل کش اسلوب میں کیا ہے:

عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ۖ مُتَنكِيْنٍ عَلَيْهَا مُتَقِِّلِيْنَ ۖ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ
وَلَدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۖ بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقَ ۖ وَكَأْسٍ مِنْ مَّعِينٍ ۖ
لَّا يَصْدَعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْفِقُونَ ۖ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ۖ
وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۖ وَخَوْرٍ عَيْنٍ ۖ وَكَأْمَالِ اللُّلُؤِ
الْمَكْنُونِ ۖ جَزَآءٍ لِّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۖ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا
وَلَا تَأْتِيهَا ۖ إِلَّا قِيلًا سَلَمًا سَلَمًا ۖ وَأَصْحَابُ الِیْمِيْنَ ۖ مَا
أَصْحَابُ الِیْمِيْنَ ۖ فِي سِنْدٍ مَّخْضُودٍ ۖ وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۖ وَظِلِّ
مَنْدُودٍ ۖ وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ ۖ وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۖ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا
مَنْوَعَةٍ ۖ وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ۖ إِنَّا أَنشَأْنَهُمْ إِنْشَاءً ۖ
فَجَعَلْنَهُمْ أَنْبَآءَ ۖ عُرُبًا أَتْرَابًا ۖ (واقعہ: ۱۵-۳۷)

وہ لوگ زرنگار تختوں پر نیکہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اور لڑکے جو عییش لڑکے ہی رہیں گے، ان کی خدمت میں آنجور سے آفتاب اور شراب سے لبریز جام لیے ہوئے ہمہ آن مصروف گردش ہوں گے۔ (شراب کے یہ جام پی کر) نہ ان کو درد سر لاحق ہوگا اور نہ اس سے ان کی عقلوں میں کوئی فتور واقع ہوگا (اور ان کے علاوہ ان کے لطف و راحت کے لیے) دل پسند میوہ جات اور چڑیلوں کے گوشت اور ایسی آہو چشم عورتیں ہوں گی جیسے پوشیدہ رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان کے اعمال کے صلہ میں ان کو ملے گا (ان تمام اسباب عیش و راحت کے باوجود) وہاں وہ نوا اور گناہ کی کوئی بات نہ سنیں گے۔ بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی صدائے دلنوا سنائی دے گی۔ دابنے ہاتھ والے اور کیا ہی اچھے ہیں دابنے ہاتھ والے، وہ ان باغوں میں

ہوں گے جیساں بے خار بیریاں، تہہ بہ تہہ کیلے، پھیلے ہوئے سائے، آبِ سرداں اور کثرت سے پھیل جانے والے جو نہ کبھی ختم ہوں گے اور زنان کے کھانے پر کوئی روک ٹوک ہوگی۔ اور اونچے اونچے فرش ہوں گے اور ایسی عورتیں وہاں ہوں گی جن کو ہم نے خاص طور پر بنایا ہوگا۔ وہ ہمیشہ کنواری ہی رہیں گی، شوہر سے محبت کرنے والی اور ہم سن ہوں گی۔

دوسری جگہ آیا ہے

وَلَقَمَّهُمْ نُضْرَةً ۙ وَسُرُورًا ۙ وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۙ
 مُتَّكِنِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرْبَابِ ۙ لَا يِرُونَ فِيهَا كُنُسًا وَلَا ذَمِيرًا ۙ
 وَدَائِبَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذُلَّتْ قَطُوفُهَا تَذَلِيلًا ۙ وَيُطَافُ
 عَلَيْهِمْ بِأَنْبِيَاءٍ مِّنْ فَضْوَةٍ ۙ وَ أَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرًا ۙ قَوَارِيرًا
 مِّنْ فَضْوَةٍ ۙ قَدَرُوا مَا تَقْدِيرًا ۙ وَيُنْفِقُونَ فِيهَا كَاسًا كَانَتْ
 مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۙ عَيْنًا فِيهَا تُسْقَى سَلْسَبِيلًا ۙ وَيُطُوفُ
 عَلَيْهِمْ وَلَدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۙ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لَوْلَا أَمْنُهُمْ
 فَلَا رَأْيَ تَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ۙ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٌ
 خَضِرٌ ۙ وَاسْتَبْرَقٌ ۙ وَوَحُلُوا أَسَاوِرَ مِّنْ فَضْوَةٍ ۙ وَسَقَهُمْ رَبُّهُمْ سَرَابًا
 طَهُورًا ۙ إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً ۙ وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا ۙ (پہر: ۱۱)

اور ان کو تازگی اور خوشی عطا کرے گا (یعنی چہروں کو تازگی اور قلوب کو مسرت عطا کرے گا) اور ان کو خیالات و عمل کی استقامت کے نتیجے میں جنت اور لباس حریر بخشے گا۔ اور وہ جنت میں تختوں پر گاؤں کی طرح لگائے ہوں گے۔ نہ وہاں گرمی کی پیش ہوگی اور نہ جاڑے کی ٹھہر (بلکہ معتدل موسم ہوگا) جنت کے درختوں کے سائے ان کے اوپر دراز ہوں گے اور پھلوں کے خوشے ان کے قبضہ قدرت میں ہوں گے (یعنی ہر وقت بلا کسی مشقت کے لے سکیں گے) ان کی خدمت میں چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے ہمہ آں پیش کیے جائیں گے، شیشے بھی وہ چوچاندی کی

قسم کے ہوں گے اور جن کو کارکنانِ بہشت نے مناسب اور موزوں اندازے کے مطابق بھرا ہوگا۔ وہاں ان کو ایسے جام شراب پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ شراب جنت کے ایک ایسے چشمہ سے لائی جائے گی جس کا نام وہاں سبیل مشہور ہوگا۔ ان کی خدمت میں ایسے لڑکے ہر آن معروف گردش ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ اور جب تم ان کو دیکھو گے تو گمان کرو گے کہ گویا یہ موتی ہیں جو بکھرے ہوئے ہیں۔ اور وہاں تم جہاں کہیں بھی نظر ڈالو گے تم کو ہر جگہ نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک عظیم سلطنت کا جاہ و جلال نظر آئے گا۔ وہاں جنتی بایک ریشم کے بنزل لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے زیب تن کیے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے لنگن پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا رب ان کو نہایت ہی پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمہارے اعمال کی جزا، اور تمہاری سعی و عمل کو آج شرف قبول حاصل ہوا۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے:۔

وَأَمَّا ذُنُوبُهُمْ فَبَأْكُفَّةٍ ۖ وَ لَخِيمٌ وَمَا يَشْتَهُونَ ۝ يَتَنَزَّعُونَ فِيهَا كَأَسَا لًا لَقَوُ
فِيهَا وَلَا تَأْتِيهِمْ ۝ (طور: ۲۳، ۲۴)

اور ہم ان کو دل پسند میوے اور گوشت وافر مقدار میں فراہم کریں گے وہ جنت میں ایسے خوش طبع اور بے تکلف ہوں گے کہ جام شراب لینے میں باہم دگر مسابقت کریں گے لیکن نہ تو وہاں کوئی ہرزہ سرائی ہوگی اور نہ گناہ و گندگی کی کوئی بت۔

ان آیات میں انسانی آرزوں کی مرقع کشی بڑی جذبات انگیز ہے۔ حقیقت یہ

ہے کہ اس سے زیادہ موزوں الفاظ اور نادر سیرا پر بیان میں عالم غیر مادی یعنی آخرت کی مسرتوں کی تصویر کشی انسانی زبان میں ممکن نہیں ہے۔ ان تینوں آیتوں کو طاکر دیکھئے تو نشاطِ ہستی کی تصویر ہر پہلو سے مکمل نظر آتی ہے۔

انسان کی محنت اور اس کے اچھے کاموں کی اس سے بہتر اور کیا جزا ہو سکتی ہے۔

کہ اس کا مسکن سرسبز و شاداب لہلہاتے ہوئے باغات ہوں، کھانے کے لیے لذیذ اور خوش مزہ پھل اور گوشت ہوں، سیرابی کام و دہن کے لیے چشمہ رواں کا صاف

شیریں پانی اور بادہ خوش رنگ کے چھلکتے ہوئے جام و ساغر ہوں، پوشش کے لیے حریر اور اطلس و دیبا کے کپڑے اور خدمت کے لیے چاق و چوبند خدام ہوں، سیر و تفریح کے لیے باغات کی سایہ دار روح پرور فضائیں اور نہروں کے کنارے، جہاں کی صبح، صبح دل کٹا اور شام، شام طرب انگیز ہو۔ اگر ان نعمتوں کے ساتھ ہی خوش حال اور خوش خصال رفیقہ حیات اور بے تکلف محفل اجاب بھی میسر ہو تو پھر انسان کے لیے خواہش اور آرزو کرنے کے لیے کون سی چیز باقی رہ جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسانی آرزوؤں کی اس سے بہتر تصویر کشی ممکن نہیں ہے۔

باغات اور نہروں کے کثرت ذکر سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ مسرت کی یہ تصویر صرف عربوں کے مذاق و مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ بلاشبہ باغات اور چشمے عربوں کی غیر مبنی زندگی کی ساری مسرتوں کا مرکز اور بقائے حیات کا ذریعہ تھے۔ لیکن یہ خصوصیت کچھ انہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ ماضی کی دوسری تمام اقوام کے نزدیک بھی باغات اور نہروں کا وجود، قیام و بقائے زندگی اور آسودگی قلب و نظر کا ایک عمدہ ذریعہ رہا ہے، اور یہی صورت آج بھی برقرار ہے۔

اخروی جزا کے مادی تصور کی حقیقت

ایک عام انسان اپنے اچھے اعمال کی جو بہتر سے بہتر جزا چاہ سکتا ہے یا بالفاظ دیگر لطف و مسرت کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی تخیل ہو سکتا ہے قرآن نے اسے خوبصورت الفاظ اور دل کش اسلوب میں بیان کر دیا ہے۔ اگر قرآن مجید انسانی اعمال کی جزا کو مادی صورت میں پیش نہ کرتا تو عام انسانوں کے لیے اخروی زندگی اور اس کی مسرتوں کا تصور ناقابل فہم ہوتا اور اس کی طلب و آرزو ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی مادی مسرتیں تو ہیں جن کے حصول کے لیے وہ اس دنیا میں ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور ان کو پانچا جانے کے بعد وہ مطمئن اور شاد کام ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی نعمتیں پار آور ہوئیں، گویا اس کے ہر ایک عمل کا محرک مادی مسرتوں کا حصول ہے۔ چنانچہ

قرآن حکیم نے بھی اعمالِ حسنہ کی جزائیں انہی مادی مسرتوں کو پیش کیا جن سے اس کے قلب و نگاہ آشنا ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس کے اندر جذبہٴ عمل بیدار ہو اور وہ اس جہانِ فانی کی فانی مسرتوں کو چھوڑ کر آخروی زندگی کی لافانی مسرتوں کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو سکے، اور اس حیاتِ فانی کی ہر کلفت و آزار کو اس حیاتِ جاوداں کے لطف و شادمانی کی امید میں منہی خوشی گوارا کر سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جنت کی نعمتوں کا بیان انسانی فطرت اور مزاج کی رعایت سے کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ نعمتیں جن الفاظ میں بیان کی گئی ہیں وہ وہاں واقعہً اسی شکل و انداز میں ملیں گی۔ اس عالمِ غیر مادی کی نعمتوں کا حجب بھی کوئی نقشہ کھینچا جائے گا لازماً وہی ہوگا جو عالمِ مادی میں موجود ہے۔ عالمِ غیر مادی کی نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان بھی کر دی جاتی تو ہمارا فہم ان کے ادراک سے عاجز ہوتا۔ ہم عالمِ آخرت کی ہر نعمت کا تصور دنیاوی نعمتوں کی شکل ہی میں کر سکتے ہیں۔ مزید برآں انسانی زبان کے تمام الفاظ مادی خواص رکھتے ہیں یعنی ہم ان کے ذریعہ صرف عالمِ مادی کی نعمتوں کو ہی بیان کر سکتے ہیں، ان الفاظ کے ذریعہ عالمِ غیر مادی کی نعمتوں کی تصویر کشی ممکن نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جو ایک انسانی زبان میں نازل ہوا ہے، بہشت کی نعمتوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ حقیقی نہیں مجازی ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعہ ہم آخروی نعمتوں کا ایک دھندلا سا تصور قائم کر سکتے ہیں اور بس، رہی ان نعمتوں کی اصل حقیقت تو ہم اس کو اس دنیا میں صحیح طور پر نہیں جان سکتے جیسا کہ خود قرآن مجید میں آیا ہے :-

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قَوتِ رَبِّكَ عَنِ جَزَاءِ إِيمَانِكَ أَنْ تَكُنْ مِنَ الْيَعْمُوكِ ۝ (سجده: ۱۷)

آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان ان کے رب نے ان کے اعمال کی جزا کے طور پر چھپا رکھا ہے، اس کی کسی متنفس کو بھی خبر نہیں ہے۔

اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :-

”خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح اور نیکو کار بندوں کے لیے وہ سامانِ راحت تیار کر رکھا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔“

آخری جزا کا غیر مادی تصور

قرآن مجید نے جزائے آخرت کے مادی تصور کے ساتھ ہی اس کا ایک غیر مادی تصور بھی پیش کیا ہے اور یہی حقیقی اور اصلی تصور ہے۔ اس تصور جزا کو صحیح طور پر صرف رازدارانہ محبت اور اربابِ فکر و نظر تک سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس جزا کو رضائے الہی اور دیدارِ رب سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكَنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ، وَرِضْوَانٍ
مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ (توبہ: ۷۲)

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغت کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان ہمیشہ رہنے والے باغات میں ان کے لیے پرفضا اور دل کش رہائش گاہیں ہوں گی۔ اور ان سے بھی بڑی نعمت جو انھیں وہاں حاصل ہوگی وہ خود اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

يَأْتِيهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ اَرْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ۝

(فجر: ۲۷-۲۸)

اے نفسِ مطمئنہ، اپنے رب کے حضور میں اس طرح چل کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:-

وَجُودًا يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ۝ لِي رَتَّبَهَا نَارًا ۝ (قیام: ۲۳، ۲۲)

بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک مومن صادق کے لیے باغات، نہروں اور علی شان مسکن سے کہیں زیادہ مرغوب اور دل پسند نعمت باری تعالیٰ کی خوشنودی، اس کی رحمت و رضا اور اس کا قرب و دیدار ہے۔ سوچئے، ایک عاشق کی سب سے بڑی آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ یہی ناکہ اسے محبوب کا دیدار اور اس کا قرب و ملاقات حاصل ہو جائے۔ او ایک عاشق پر محبوب کا سب سے بڑا لطف و کرم بھی یہی ہے کہ وہ اس کو اپنے دیدار سے مشرف کر دے، اور دو چار میٹھے بول بول کر اپنی رضا اور خوشنودی کا اظہار کر دے۔ یہی محبت کا اصل مطلوب اور ایک سچے عاشق کی دلی آرزو ہوتی ہے۔ اس دیدار و ملاقات کے بعد ایام ہجر کی تمام کلفتیں اور رروح فرسائیاں ختم ہو جاتی ہیں، اور مسرت سے لبریز قلب، شکیب آزار، راہ محبت کا ہرنج و غم بھول جاتا ہے۔ محبوب کا رونے تاباں، عاشق کے ہزخیم دل کا اس طرح مداوا بن جاتا ہے جیسے اس کے دل نے کبھی کوئی زخم کھایا ہی نہیں تھا۔

فی الواقع روزِ آخرت دیدارِ الہی اور قربِ خداوندی سے یہی کیفیت مومنوں کے اوپر بھی طاری ہوگی۔ یہ وہ روزِ سعادت ہے جس کی تمنا ہر اس مومن صادق کے دل میں پائی جاتی ہے جو روزِ محبت آشنا اور قرب و دیدار کے مفہوم سے واقف ہے، جس کے نزدیک باغات، نہروں اور حور و قصور سے زیادہ محبوب شے خود پروردگار کا دیدار و قرب ہے۔

باری تعالیٰ کے دیدار کی حقیقت کیا ہے، یہ انسانی عقل و فہم کے لیے ناقابل ادراک ہے۔ اسی لیے ہر انسان کے دل میں اس کی طلب و آرزو کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزِ آخرت کی اس جزا کا ذکر قرآن نے اتنی شدت کے ساتھ نہیں کیا ہے جتنی شدت کے ساتھ اس نے مادی مسرتوں یعنی باغ و نہر، لباس و طعام، حور و قصور اور دیگر اسبابِ راحت کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ یہ نعمتیں دیدہ و شنیدہ ہیں اور ان کی طلب

ہر انسان کے دل میں فطرۃ موجود ہوتی ہے۔ رہے روز محبت یعنی قرب و دیدار کی حقیقت تو اس سے ہر نظر مانوس اور ہر قلب آشنا نہیں ہوتا، لیکن قرآن مجید نے اس کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ رہ روانِ راہ محبت تیز گام ہوں اور ان کے قلوب کو بھی سامان تسکین مل سکے۔ کون کس راہ پر چلے اور کس جزا کا طلب گار بنے یہ ہر ایک کی استعداد ذہنی، مذاق طبعیت اور حسن طلب پر موقوف ہے۔

عمل غیر صالح کا مفہوم

جیسا کہ ہم عمل صالح کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں کہ انسان کے وہ تمام اعمال جو عدل و قسط سے متجاوز اور اس کے لیے اور سماج کے لیے مضر تر رساں ہوں یا دوسرے لفظوں میں اللہ کی رضا و خوشنودی کے خلاف ہو ائے نفس کے اتباع میں کیے گئے ہوں، اعمال غیر صالحہ میں داخل ہیں مثلاً شرک، قتل ناحق، زنا، چوری، رہزنی، شراب نوشی، امر دہشتی، قمار بازی، فحش گوئی، دروغ اور بہتان طرازی، جھوٹی شہادت، خیانت، دجل و فریب اور ظلم و عدوان وغیرہ۔ ان اعمال کی مضرتوں سے نہ تو ان کا ارتکاب کرنے والا محفوظ رہتا ہے اور نہ معاشرہ۔ پوری تاریخ انسانی ان افعال بد کے تباہ کن نتائج سے بھری پڑی ہے۔

کیا ایمان کے ساتھ اعمال غیر صالحہ کا اجتماع ممکن ہے؟

گزشتہ صفحات میں ہم آپ کو یہ بتا چکے ہیں کہ ایمان کا دوسرا نام علم ہے۔ علم اس روشنی کا نام ہے جو انسان کے قلب و دماغ کی ظلمتوں کو دور کر کے اس کو صحیح اور غلط اور اچھے اور برے میں امتیاز کی صلاحیت عطا کرتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (البقرہ: ۱۷۷)

اللہ ایمان لانے والوں کا کار ساز ہے۔ انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ علم ہی کے ذریعہ ایک انسان غلط افعال کے نقصان دہ نتائج سے بچتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے۔ آگ کے متعلق ہمارے اس علم کا نتیجہ

ہے کہ ہم بقید ہوش و حواس آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اسی طرح اگر ہم سے کوئی کہے کہ پہاڑ سے کود جاؤ تو ہم ایسا کبھی نہ کریں گے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ پہاڑ سے کودنا ہلاکت کا باعث ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کے نتائج کا علم ہی ہم کو غلطیوں سے بچاتا ہے اور ہم بہت سے نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں۔

جب صورت واقعہ یہ ہے تو پھر یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ ایمان کی روشنی سے قلب و دماغ منور ہوں اور اس کے باوجود ایک مومن وہ کام کرے جو سراسر ایمان کے منافی ہو اگر ایک شخص آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کا دماغ ماؤف ہے اور وہ پاگل ہے یا وہ آگ کے خواص و نتائج سے ابھی واقف نہیں ہے جیسے بچہ۔ اگر ایک آدمی کا دماغ بالکل صحیح ہے اور آگ کے خواص و نتائج سے بھی آگاہ ہے تو وہ یقیناً آگ میں ہاتھ ڈالنے سے احتراز کرے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص مومن ہے یعنی وہ علم و یقین کی روشنی رکھتا ہے اور ساتھ ہی افعال بد کے مہلک نتائج سے بھی بخوبی واقف ہے تو وہ کبھی جان بوجھ کر خود کو ہلاکت میں نہیں ڈال سکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص جو خود کو مومن کہتا ہے، برے افعال کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں یا تو وہ علم نہیں رکھتا اور اعمال کے نتائج و عواقب سے بالکل بے خبر ہے، یا نتائج کا علم تو رکھتا ہے لیکن صحیح ممنوں میں اسے ان پر یقین نہیں ہے۔ علاوہ بریں خواہشات نفسانی کی پیروی اور برے اعمال کی کثرت نے اس کے قلب و دماغ کو تاریک بنا رکھا ہے اور وہ شب بیاہاں کے مسافر کی طرح تاریکیوں میں ٹھوکرین کھا رہا ہے۔

ایمان کامل کے ساتھ فحور و فواحش کا اجتماع ناممکن ہے جیسے روشنی کے ساتھ تاریکی آگ کے ساتھ پانی اور خوشبو کے ساتھ بدبو وغیرہ۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص کا ایمان یعنی علم و یقین اس درجے کا نہیں ہوتا اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ کئی علم یا بے خبری میں اور یا کبھی خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کر ایک مومن سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو ایمان کے متافی ہو۔ اس امکانی خطا پر قرآن مجید کی چند آیتوں سے بخوبی روشنی پڑتی ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:-

وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا

عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنْ أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۰۲﴾ (توبہ: ۱۰۲)

اور کچھ دوسرے لوگ جنہوں نے اپنی خطاؤں کو تسلیم کر لیا ہے اور جن کے اعمال مخلوط ہیں یعنی کچھ اچھے اور کچھ برے عین ممکن ہے کہ اللہ ان کے حال پر متوجہ ہو (یعنی ان کی توبہ قبول کرے) بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَإِنْ طَلَبْتُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَاتِلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا (حجرات: ۹)

اور اگر مومنوں کے دو گروہ باہم لڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک مومن سے گناہ کا صدور ممکن ہے لیکن گناہ کی یہ حالت دائمی نہیں ہوتی بلکہ جیسے ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اس کی زبان پر کلمات استغفار جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کا طرز عمل عادی مجرموں جیسا نہیں ہوتا جو دیدہ و دانستہ مسلسل جرم کا ارتکاب کرتے جاتے ہیں اور کبھی ان افعال شنیعہ پر نادام تک نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف ایک مومن کی صفت قرآن نے یہ بتائی ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ

فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ ۚ وَمَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ فَمَا لَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ

وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۳۵﴾ (آل عمران: ۱۳۵)

اور وہ لوگ کہ جب ان سے کوئی برا فعل سرزد ہو جاتا ہے یا وہ اپنے نفس پر کوئی ظلم کر بیٹھے ہیں تو فی الفور اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشنے والا ہے؟ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں (یعنی جب ان کو خطا کا احساس ہو جاتا ہے) تو پھر دیدہ و دانستہ اس پر اڑے نہیں رہتے۔

توبہ و استغفار

ایمان علم و یقین کا نام ہے اور گناہ جہالت کا جس وقت ایک مومن گناہ کا ارتکاب

کرتا ہے۔ علم کی یہ روشنی مدہم پڑ جاتی ہے اور اس کی ایمانی کیفیت بدل جاتی ہے۔ لیکن جس گھڑی اسے اپنی خطا کا احساس ہوتا ہے وہ اپنے فعل پر نادم و پشیمان ہوتا ہے، اللہ سے توبہ و استغفار کرتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اب دیدہ و دانستہ اس خطا کا ارتکاب نہیں کرے گا اور اس طرح اس کی ایمانی کیفیت لوٹ آتی ہے۔ رندامت اور توبہ و استغفار اس بات کی علامت ہے کہ مومن حالت جہل سے نکل کر حالت علم میں آ گیا ہے اور یہی ایمان ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”زنا کرنے والا اس حال میں زنا نہیں کرتا کہ وہ مومن ہو اور جو اس حالت میں چوری نہیں کرتا کہ وہ مومن ہو، لیکن توبہ پیش کی جانے والی چیز ہے۔“
اس باب میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے بھی روایت ہے نیز حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر مثل سائبان کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ یہ فعل کر چکتا ہے (اور اس پر پشیمان ہو کر توبہ کرتا ہے) تو ایمان اس کے پاس لوٹ آتا ہے۔“ لہ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد ارتکاب گناہ ممکن ہے لیکن جو چیز گناہ کے اثر کو زائل کر دیتی ہے وہ مومن کا توبہ و استغفار اور اصلاح حال کا جذبہ ہے۔ مومن گناہ کر کے خدا کی رحمت سے دور اور اس کے عذاب سے قریب ہو جاتا ہے لیکن توبہ و استغفار سے وہ خدا کی رحمت سے قریب اور اس کی مغفرت کا مستحق ہو جاتا ہے جو شخص گناہ کرتا ہے لیکن توبہ و استغفار نہیں کرتا اور اسی حالت گناہ میں بغیر توبہ و استغفار کے مرتا ہے تو وہ عذاب جہنم کا سزاوار ہے۔ اللہ کی رحمت و مغفرت تو ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہ کے بعد فی الفور توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اصلاح اعمال کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

لہ ترمذی، ابواب الایمان۔

كَتَبَ رَبِّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَن تَكُونَ مِن عِجَالٍ مِّنكُمْ سَوِيًّا
 بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ ۖ وَأَصْلَحَ ۚ فَأَنشَأَهُ عَفْوَ رَحِيمٍ (انعام: ۵۴)
 تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم بٹھرایا ہے کہ تم میں سے جس شخص نے
 بھی نادانی میں کوئی خطا کی پھر اس کے بعد (اللہ سے) توبہ کی اور اپنے عمل کی اصلاح کی
 تو وہ یقیناً اس کو معاف کر دے گا کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:

إِنَّ الْمُنْفِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۖ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ
 نَصِيرًا ۗ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا
 دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِي اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ
 أَجْرًا عَظِيمًا (نساء: ۱۲۵، ۱۲۶)

بے شک منافقین آگ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے اور وہ کسی کو اپنا حامی
 و ناصر نہ پاسکیں گے۔ مگر ہاں وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنے عمل کی اصلاح کی اور
 اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کر لیا اور اطاعت کو اسی کے لیے خاص کر لیا، ایسے لوگوں کا
 شمار مومنوں کے ساتھ ہوگا اور عنقریب اللہ مومنوں کو اجر عظیم سے نوازے گا۔

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ توبہ و استغفار سے مومن کا ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے، لیکن
 توبہ و استغفار صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ گناہ کے ارتکاب کے بعد بس اظہارِ شرمندگی
 کر دیا جائے اور اللہ سے معافی مانگ لی جائے۔ اصل توبہ و استغفار جیسا کہ مذکورہ آیات
 قرآنی سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ بندہ ارتکاب گناہ کے بعد اپنے فعل پر نادم ہو، خدا کے
 آگے کامل نیاز و بندگی کے ساتھ سہجہ کا کر اپنی خطا کی معافی چاہے، جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے
 اس کی تلافی کی حتیٰ المقدور کوشش کرے اور آئندہ اس کو نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرے،
 نیز خدا کے تمام احکام و ہدایات پر خلوص دل سے عمل کرے، غرض یہ کہ اپنے ہر فعل سے
 ثابت کر دے کہ وہ پہلے خطا کا ضرور تھا لیکن اب خدا کا مخلص اور نیکو کار بندہ بن چکا ہے۔
 توبہ و استغفار کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ جلد از جلد کرنی جائے، کون

جانتا ہے کہ زندگی کا چراغ کب گل ہو جائے۔ توبہ و استغفار کے بعد اصلاح عمل ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ آدمی اجل معین کی آمد سے بہت پہلے تائب ہو کر اعمالِ حسنہ کے ذریعہ ملائیِ مافات کر لے۔ موت کے وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی یعنی آدمی زندگی بھر گناہ کرتا رہے اور کبھی توبہ و استغفار نہ کرے لیکن موت کو پاس کھڑی دیکھے تو جھٹ توبہ و استغفار کرنے لگے۔ ایسی توبہ خدا کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ سچا مومن تو وہ ہے جو از گناہ کے بعد فوراً توبہ و استغفار کے جملہ مراحل طے کر لیتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ
مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ، وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا
حَكِيمًا ۝ وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ
أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ اللَّهَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَ لَمْ كُفَّارًا
أُولَٰئِكَ آعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (نساء: ۱۷۷-۱۸۰)

اللہ کے نزدیک صرف انہی لوگوں کی توبہ قابل قبول ہے جو نادانی میں خطا کرتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اور اللہ عظیم و حکیم ہے۔ ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برائیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آگتا ہے تو کہتا ہے ”اب میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں“ اور اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی جن کی موت حالت کفر میں واقع ہوتی ہے۔ ہم نے ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک توبہ گزار بندہ کی توبہ و انابت سے جتنا خوش ہوتا ہے اس کا کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا ادھر اشکوں کے جلو میں ایک بندہ مومن کا دست استغفار اٹھتا ہے اور ادھر رحمت و مغفرت کی آغوش اس کے لیے وا ہو جاتی ہے: ۷
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لے قطرے جو گر پڑے عرقِ انفعال کے
ایک توبہ گزار بندہ کی مثال اس مسافر کی سی ہے جو بیابان میں اپنی راہ بھول گیا
ہو اور کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکنے اور تکلیفیں اٹھانے کے بعد صحیح راہ پر گام زن ہو جائے یقیناً

وہ اس راہ یابی پردل میں نہایت مسرور ہوگا یہی کیفیت ایک بندہ تائب کی ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی اس وقت بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جب ایک خطا کار بندہ اپنے گناہوں سے تائب ہو کر بر و تقویٰ کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسی بات کو تمثیلات کے پیرایہ میں یوں بیان فرمایا ہے :

”کون ایسا ہے جس کے پاس سو بھیریں ہوں اور ان میں سے ایک کھوجائے تو ننانوے کو بیاباں میں چھوڑ کر اس کھوئی کھوئی ہوئی کو جب تک مل نہ جائے ڈھونڈتا نہ رہے پھر جب مل جاتی ہے تو وہ خوش ہو کر اسے کندھے پر اٹھالینتا ہے ۵ اور گھر پہنچ کر دوستوں اور پڑوسیوں کو بلاتا اور کہتا ہے، میرے ساتھ خوشی کرو کیوں کہ میری کھوئی کھوئی بھیر مل گئی ہے ۵ میں تم سے بچ کہتا ہوں کہ اسی طرح ننانوے راستبازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گنہگار کے باعث آسمان پر زیادہ خوشی ہوگی ۵ یا کون ایسی عورت ہے جس کے پاس دس درہم ہوں اور ایک کھوجائے تو وہ چراغ جلا کر گھر میں جھاڑو نہ دے اور جب تک مل نہ جائے کوشش سے ڈھونڈتی نہ رہے ۵ اور جب مل جائے تو اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو بلا کر نہ کہے کہ میرے ساتھ خوشی کرو کیوں کہ میرا کھویا ہوا درہم مل گیا ۵ میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی طرح ایک توبہ کرنے والے گنہگار کے باعث خدا کے فرشتوں کے سامنے خوشی ہوتی ہے“ آپ نے مزید فرمایا :-

”کسی شخص کے دو بیٹے تھے ۵ ان میں چھوٹے نے باپ سے کہا، اے باپ مال کا جو حصہ مجھ کو پہنچتا ہے مجھے دیدے۔ اس نے اپنا مال متاع بانٹ دیا ۵ اور بہت دن نہ گزرے کہ چھوٹا بیٹا اپنا سب کچھ جمع کر کے درواز ملک کو روانہ ہوا اور وہاں اپنا مال بد چلنی میں اڑا دیا ۵ اور جب خرچ کر چکا تو اس ملک میں سخت کال بڑا اور وہ محتاج ہونے لگا

پھر اس ملک کے ایک باشندہ کے یہاں جا پڑا۔ اس نے اس کو اپنے کھیتوں میں سوچرانے بھیجا اور اسے آرزو تھی کہ جو پھیلیاں سو رکھاتے ہیں انہی سے اپنا پیٹ بھر لے مگر کوئی اسے نہ دیتا تھا۔ پھر اس نے ہوش میں آکر کہا: میرے باپ کے کتنے ہی مزدوروں کو افراط کے ساتھ روٹی ملتی ہے اور میں یہاں بھوکا مر رہا ہوں۔ میں اٹھ کر اپنے باپ کے پاس جاؤنگا اور اس سے کہوں گا "اے باپ میں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہوا ہوں اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر تیرا بیٹا کہلاؤں۔ مجھے اپنے مزدوروں جیسا کر لے" وہ پس وہ اٹھ کر اپنے باپ کے پاس چلا۔ وہ ابھی دور ہی تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے باپ کو اس پر ترس آیا اور دوڑ کر اس کو گلے لگا لیا اور بوسے لیے۔ بیٹے نے اس سے کہا "اے باپ میں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہوا۔ اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر تیرا بیٹا کہلاؤں۔" باپ نے اپنے نوکروں سے کہا "اچھے سے اچھا جامہ نکال کر اسے پہناؤ اور اس کے ہاتھ میں انگوٹھی اور پاؤں میں جوتی پہناؤ اور پلے ہوئے پچھڑے کو لاکر ذبح کرو تاکہ ہم خوشی منائیں۔ کیوں کہ میرا یہ بیٹا مردہ تھا اب زندہ ہو گیا ہے، کھو گیا تھا اب مل گیا ہے۔ پس وہ خوشی منانے لگے۔ لیکن اس کا بڑا بیٹا کھیت میں تھا جب وہ آکر گھر کے نزدیک پہنچا تو گانے بجانے اور ناچنے کی آواز سنی۔ اور ایک نوکر کو بلا کر دریافت کرنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اس سے کہا، تیرا بھائی آ گیا ہے اور تیرے باپ نے پلاہوا بچھڑا ذبح کر دیا ہے کیونکہ اسے پھلا چنگا پایا۔ وہ غصہ ہوا اور اندجانا نہ چاہا مگر اس کا باپ باہر جا کر اسے منانے لگا۔ اس نے باپ سے جواب میں کہا "دیکھ میں اتنے برسوں سے تیری خدمت کرتا ہوں اور کبھی تیری حکم عدولی نہیں کی مگر تو نے مجھے کبھی ایک بکری کا بچہ بھی نہ دیا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی مناتا ہوں لیکن جب تیرا یہ بیٹا آیا جس نے تیرا مال و

متاع کیوں میں اڑا دیا تو تو نے اس کے لیے پلا ہوا بچھڑا ذبح کرا یا وہ اس نے اس سے کہا بیٹا! تو! تو ہمیشہ میرے پاس ہے اور جو کچھ میرا ہے وہ تیرا ہی ہے۔ لیکن خوشی منانا اور شادماں ہونا مناسب تھا کیوں کہ تیرا یہ بھائی مردہ تھا اب زندہ ہوا، کھویا ہوا تھا اب طا ہے۔

گناہ کبیرہ اور توبہ و استغفار

کیا توبہ و استغفار سے گناہ کبیرہ بھی معاف ہو سکتے ہیں؟ قرآن پاک سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ توبہ و استغفار سے انسان کے گناہ کبیرہ بھی معاف ہو سکتے ہیں بشرطیکہ بندہ آئندہ خدا کی کامل اطاعت و بندگی کا ثبوت دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاٰتِيْنَا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّآتِيَنَّكُمْ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَّرُوْنَ ۝ (زمر: ۵۳، ۵۴)

(اے محمد) میرے ان بندوں سے کہہ دو جنہوں نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے، کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا، بلاشریہ وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (اس کی اس شان رحمت کا تقاضا ہے کہ تم اس کی طرف پلٹ آؤ اور سر اطاعت جھکا دو قبل اس کے کہ تم کو عذاب آدلوپے اور پھر نہیں کہیں سے کوئی مدد نہ مل سکے۔

اس آیت میں ”اٰتِيْنَا“ کے بعد ”اسلموا“ کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ توبہ کے بعد خدا کی کامل اطاعت اور فرماں برداری ضروری ہے اور یہی چیز اسے عذاب خداوندی سے نجات دے سکتی ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَاَضَلَّهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

الْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيُعْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۹﴾ (۳۹: ۳۹)

جس نے ظلم گناہ کے بعد توبہ کی اور اپنے اعمال کو درست کر لیا تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ بیشک اللہ مغفرت والا اور رحمت والا ہے۔ کیا تم کو خبر نہیں کہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے نرا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا :-

قَالَ مَا مِنْ تَابٍ وَآمَنٍ وَعَمِلَ صَالِحًا فَغَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿۶۷﴾

(قصص: ۶۷)

پس جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھا عمل کیا تو امید ہے کہ ایسے لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہوں گے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اگر ایک بندہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور اعمال صالحہ کے ذریعہ گزشتہ کی تلافی بھی کرتا ہے تو وہ یقیناً رحمت خداوندی کا مستحق ہوگا۔ فی الواقع توبہ و استغفار وہ نسخہ کیمیا ہے جو ہر کھوٹے کو کھرا اور مسِ خام کو کندن بنا دیتا ہے۔ توبہ و استغفار ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کی سنت اور اعراض و استکبار ابلیس ملعون کا شیوہ ہے۔ جو سنت آدم کی پیروی کرے گا وہ خدا کی رحمت و مغفرت کا سزاوار ہوگا اور جو ابلیس کا طرز عمل اختیار کرے گا وہ ملعون و نامراد ٹھہرے گا۔ پس جو شخص اس دنیا میں توبہ و استغفار نہیں کرتا بلکہ تمرد و سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اسی حالت میں اس دارفانی سے کوچ کر جاتا ہے تو اس کے لیے روز قیامت، خدا کی رحمت و مغفرت کا ہر دروازہ بند ہوگا کیوں کہ اس نے توبہ و استغفار کے ذریعہ دنیا میں کلید مغفرت کو حاصل نہ کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّازٍ وَسَوْسَمٌ

وَرَأَيْنَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۶۸﴾ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ

لَهُمْ أَمْرٌ كَمَ تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ ۚ كُنْ يُغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۚ (منافقون: ۲۵)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُوٹو تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے دعائے مغفرت کرے تو تم دیکھتے ہو کہ وہ غرور و استکبار میں اپنے سروں کو پھیر کر بے رحمی برتتے ہیں خواہ تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔

یاد رکھیے کہ توبہ اور استغفار سے گناہ کبیرہ کا مرتکب صرف روزِ آخرت کی سزا سے بچ سکتا ہے، لیکن اس دنیا میں اگر اسلامی حکومت قائم ہے اور گناہ ظاہر ہو کر سماج میں ایک معلوم واقعہ بن گیا ہے، تو توبہ و استغفار سے کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب کی سزا منسوخ نہیں ہو سکتی ہے۔ سماج کے استحکام، تمدن کی بقا، اخلاق کی پاکیزگی اور فکر و نظر کی طہارت کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین کے مطابق اس کو سزا ملے۔ اس پر مفصل گفتگو آپ کو اگلے صفحات میں ملے گی۔

گناہ کبیرہ اور خوارج و معتزلہ کا نقطہ نظر

اس سلسلے میں معتزلہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ تو مطلق مومن ہوتا ہے اور نہ ہی مطلق کافر، بلکہ درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ علی الحسن بصری (متوفی ۱۸۴ھ) سے کسی نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

انا لا اقول ان صاحب الكبيرة مومن مطلقا ولا كافر مطلقا، بل هو في منزلة المنزلتين: لا مومن ولا كافر

میں گناہ کبیرہ کے مرتکب کو نہ تو مطلقاً مومن کہوں گا اور نہ ہی مطلقاً کافر، بلکہ وہ ان دونوں کی درمیانی منزل میں ہوتا ہے، نہ مومن نہ کافر۔

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ اسی درمیانی حالت میں مر جائے تو عذابِ جہنم کا سزاوار ہوگا، اور یہ سزا دائمی ہوگی۔

معتزل کا یہ نقطہ نظر صحیح نہیں ہے۔ اولاً تو یہ عدل کے منافی ہے کہ ایک گناہ کی پاداش میں مرتکب گناہ کو عذاب جہنم کی دائمی سزا ملے۔ قرآن نے یہ بات واضح لفظوں میں بیان کر دی ہے کہ مومن کے اعمال حسنة کی جزا تو دو چیزیں اور سہ چیزیں ہوں گی، لیکن گناہگار کو سزا بقدر گناہ سزا ملے گی گویا اگر اس سے زیادہ سزا دی گئی تو یہ صریح ظلم ہوگا، اور خدائے عادل کی ذات ظلم وحق تلفی سے پاک ہے، وہ خود فرماتا ہے:

اَلْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ اَلْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡرٌ

الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾ (مومن: ۱۷)

آج کے دن ہر متقن کو اس کے کیے کی پوری پوری جزا ملے گی۔ آج کوئی ظلم نہ ہوگا

بیشک اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔

ثانیاً یہ طے کرنا کہ کون جہنم کی سزا کا مستحق ہے اور کون جنت کا سزاوار ہے، کس کو خلودِ نار کی سزا ملے گی اور کون عذاب جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد خدائی رحمت و مغفرت سے سرفراز ہوگا؟ ان باتوں کے متعلق کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود سے فیصلہ کرتا پھرے کیوں کہ عذاب اور مغفرت کا تمام اختیار صرف خدائے علیم وخبیر کے ہاتھ میں ہے:

قَبِيۡضٌ لِّمَنۡ يَّشَاءُ وَيَعۡذِبُ مَنۡ يَّشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰۤىٰ كُلِّ شَيْۡءٍ

قَدِيۡرٌ ﴿۲۸۳﴾ (بقرہ: ۲۸۳)

ہوگا۔

وہ جس کو چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خدا عادل ورحیم ہے اور علیم و حکیم بھی، وہ روزِ آخرت خود فیصلہ کرے گا کہ آج کون سزا کا مستحق ہے، کون انعام کا اور کون پروانہ مغفرت کا سزاوار ہے۔ سزا، انعام اور مغفرت تینوں امور کا فیصلہ کامل عدل کے ساتھ ہوگا۔ کسی انسان کو خواہ وہ کسی مرتبہ و مقام کا مالک ہو اس دنیا میں سزا، انعام اور مغفرت کا پروانہ تقسیم کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

سہ یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ اسلامی تاریخ کے تقریباً ہر دور میں ایسے علماء موجود رہے ہیں جنہوں نے کتنی ہی خداترس اور نیکوکار انسانوں کے خلاف کفر کے فتاوے صادر کیے ہیں۔ یہ کام انھوں نے (بقبر حاشیہ اعلیٰ صوفیہ)

گناہ کبیرہ کے باب میں خوارج کا نقطہ نظر بھی صریحاً نقطہ عدل سے متجاوز اور کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معصیت کا مرتکب دائرہ ایمان سے نکل کر دائرہ کفر میں آجاتا ہے، اور وہ دوسرے کافروں کی طرح دائمی عذاب جہنم کا سزاوار ہوگا۔ اگر خوارج کے اس خیال کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں توبہ و استغفار کے جو الفاظ کثرت سے آئے ہیں وہ بے معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ توبہ و استغفار ارتکاب گناہ کے بعد ہی کی چیز ہے۔ اگر کسی گناہ کے ارتکاب سے مومن کافر ہو جاتا ہے اور دائمی عذاب جہنم کا سزاوار ہے تو توبہ و استغفار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات عقلاً بھی غلط ہے اور رحمت خداوندی کے بھی سراسر خلاف ہے۔

درحقیقت ایمان کے بعد ارتکاب گناہ ممکن ہے لیکن گناہ کے اثرات کو جو چیز زائل کر دیتی ہے وہ مومن کا توبہ و استغفار اور اصلاح حال کا جذبہ ہے۔ اس سلسلے میں ہم متقدم قرآنی آیتیں پچھلے صفحات میں نقل کر چکے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہے:-

وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾ (اعراف: ۱۵۳)

اور وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کیں پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے تو بیشک اللہ اس (توبہ و ایمان) کے بعد (ہر برائی سے) درگزر کرنے والا اور رحم

(بقیہ گذشتہ حاشیہ) کچھ اس انداز میں کیا ہے جیسے وہ خود ہر خطا و لغزش سے مامون ہوں۔ ان تکفیری مشاغل کے پس پردہ دراصل ان کی مذہبی اناہیت، خود پرستی و خود نمانی، بغض و حسد، معاصرانہ چنگ بولیت پرستی، کورانہ تقلید اور سب سے بڑھ کر دنیا پرستی جسے قرآن نے "اعلاد الی الارض" سے تعبیر کیا ہے، کا فرما ملتی ہے۔ کاش یہ علماء پوپ کی طرح پروانہ عذاب و گم رہی تقسیم کرنے کے بجائے خود اپنے گریبان میں منڈ ڈال کر دیکھتے کہ ان کے اعمال کا کیا حال ہے؟ وہ اس بات کو نہ بھولیں کہ انسان کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، کون آج کیا ہے اور کل کیا ہو جائے گا وہ نہیں جان سکتے۔ بڑے سے بڑا فاجر و بدکار متفقہ اور یوکار بن سکتا ہے، اور زہر و روغ کا حامل ضلالت و فسق میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کرنے والا ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرے اور کڑی توبہ چلا جائے، تو اپنے گناہ پر نادم ہو کر توبہ و استغفار کرے، اور نہ ہی حدود اللہ کی خلاف ورزی کی کوئی سزا سے اس دنیا میں ملے، اور اسی حالت فسق میں وہ مر جائے تو ایسا شخص روزِ آخرت اپنے اعمالِ بد کی پاداش میں یقیناً سزا کا مستحق ہوگا، لیکن اس سزا کی نوعیت کیا ہوگی، اور مدت سزا کیا ہوگی؟ ہم اس سلسلے میں کسی قیاس و گمان کی بنا پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

گناہ اور عذاب کے بارہ میں معتزلہ اور خوارج کی طرح ایک تیسرا فرقہ مرجیہ کا بھی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ گناہ اور ایمان دو علیحدہ چیزیں ہیں کسی گناہ کا مرتکب دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا خواہ وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، اور کوئی گنہگار مومن جہنم میں نہیں جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ سراسر قرآنی تعلیمات کے منافی ہے، اور یہ خدا کے عادل ہونے کی نفی بھی کرتا ہے حیرت ہے کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے یہ عقیدہ مسلمانوں میں کیسے راہ پانگیا، اور آج تک کسی نہ کسی صورت میں باقی بھی ہے۔ خود قرآن پاک اس عقیدہ باطل کی تردید ان الفاظ میں کرتا ہے:

لَيْسَ بِأَمَانَتِكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ
بِهِ وَلَا يَحْذَلْهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَلَيْسَ وَلَا تَصْبِرًا ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ
الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ
وَلَا يُظَلَّمُونَ تَقْتِيرًا ۗ (نساء: ۱۲۳، ۱۲۴)

نہ تو تمہاری آرزوں سے، اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوں سے کام چلنے والا ہے۔ جو برائی کرے گا، کا بدلہ پائے گا، اور وہ اللہ کے مقابلے میں کوئی حامی و ناصر نہ پائے گا، اور مرد و عورت جو بھی اچھے کام کرے گا اور دولتِ ایمان سے بہرہ ور بھی ہوگا، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرہ برابر بھی کوئی زیادتی نہ ہوگی۔

یہودیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ جہنم کی آگ ان پر حرام ہے، اور اگر جہنم میں گئے

بھی تو بس چند دنوں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خوش فہمی کو دور کرنے کے لیے فرمایا:-

وَقَالُوا لَنْ نَمُوتَ النَّازِلَآءِ اَيَّامًا مَّعْدُودَةًۦۙ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًاۙ فَلَنْ يُخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهُۥٓ اَمْ تَكْفُرُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّآحَاطَتْ بِهٖ حَاطَتُهُۥٓ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (بقرہ: ۸۱۴۸۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ آگ تو ہم کو بس چند دنوں کے لیے ہی چھوئے گی۔ کہہ دو کہ کیا اس بات کے لیے تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ اللہ اس عہد کی خلاف ورزی نہ کرے گا، یا تم اللہ کے سلسلے میں ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تم کو مطلق علم نہیں ہے۔ آخر تم کو دوزخ کی آگ کیوں نہیں چھوئے گی؟ جو بھی برائی کا سودا کرے گا اور اس کی خطائیں اس کو (سر سے پیر تک) ڈھانپ لیں گی، وہ دوزخی ہے اور اس میں ہمیشہ رہے گا۔

عمل غیر صالح کی سزا

تورات میں اعمال صالح کی جزا کی طرح جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں آپ کو بتا چکے ہیں اعمال بد کی جو سزائیں بیان کی گئیں ہیں وہ دنیوی نوعیت کی ہیں، اس کے برخلاف انجیل میں بیان کردہ سزائیں خالص اخروی نوعیت کی ہیں، لیکن قرآن میں اعمال بد کی جو سزائیں بیان کی گئی ہیں وہ دنیوی اور اخروی دونوں طرح کی ہیں، اور دیگر امور کی طرح اس باب میں بھی قرآنی تعلیم نقطہ عدل پر قائم ہے، اور انسانی عقل و فہم کے لیے تسلی بخش اور حیات آفریں ہے جیسا کہ اگلے صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

دنیوی سزا

انسان کے برے اعمال کی کچھ سزائیں تو اسے اسی دنیا میں مل جاتی ہیں مثلاً منگی، شہ

ذلت و رسوائی، مرعوبیت و محکومیت، اضطراب و غم، خوف جان و مال اور امراض و بلائیں وغیرہ۔ اس حقیقت کی طرف قرآن مجید کی یہ آیت واضح اشارہ کرتی ہے :-

فَإِذَا قَامُ اللَّهُ الْعِزَّى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ
لَوْ كُنَّا نَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾ (زمر: ۲۶)

پس اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دنیوی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی بڑا اور سخت ہے، کاش یہ جانتے۔

دنیوی سزائیں جو انسان کو برے اعمال کے صلے میں ملتی ہیں وہ دراصل اس کے برے اعمال کے لوازم و نتائج ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں صرف اس لیے ظاہر کر دیتا ہے تاکہ انسان خواب غفلت سے بیدار ہو کر تضرع اور حق شناسی کی راہ اختیار کرے، اور آخرت کے زیادہ دردناک عذاب سے نجات کا سامان کر لے۔ اس اہم حقیقت کی طرف قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر اشارے کیے گئے ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے :-

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ
كَثِيرٍ ﴿۳۰﴾ (شوری: ۳۰)

تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے اور وہ تمہاری بیشتر خطاؤں سے توہر نظر کر جاتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ آيَاتِنَا إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَ
الصَّرَاءِ لَعَلَّهُمْ يَضُرَّعُونَ ﴿۹۴﴾ (اعراف: ۹۴)

ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا تو یہ ضرور ہوا کہ اس کے باشندوں کو تنگی اور تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ تضرع کی راہ اختیار کریں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں ایک انسان کو جن مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑتا ہے یا تو وہ خود اس کے اپنے افعال بد کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور یا اس سے مقبوض بندے کی آزمائش ہوتی ہے فرمایا :-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِبَنِيٍّ وَمِنْ غُفْرٍ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ
 وَالشَّمْرِ إِذْ يَبْتَغِي الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ
 وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۝ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ (بقرہ: ۱۵۵-۱۵۷)

اور ہم تم کو خوف، فاقہ، مالوں، جانوں اور پھیلوں کے نقصانات میں سے کسی نہ کسی چیز سے
 ضرور آزما لیں گے۔ اور آپ ایسے صابریں کو بشارت دے دیجئے (جن کا حال یہ ہے) کہ
 جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم (اور ہماری ہر چیز) خدا کی ملک ہے، اور
 (ایک دن) ہم کو اس کی پاس جانا ہے۔ ایسے ہی لوگوں پر ان کے رب کی برکات اور رحمت
 کا نزول ہوتا ہے، اور یہی لوگ ہیں جن کی راہِ فکر و عمل درست ہے۔

اس دنیا میں برے اعمال کی ایک سزا وہ بھی ہے جو اسلامی حکومت کے تحت اس کے
 تعزیری قوانین کی رو سے گنہگاروں اور مجرموں کو دی جاتی ہے۔ یہ سزا پا کر ایک گنہگار مومن روزِ
 آخرت کی بدترین سزا سے بچ جاتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے کیے ہوئے گناہ پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ
 سے بصدق دل معافی مانگ لے، ایسی شکل میں دنیوی سزا کے بعد یہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ
 اپنی رحمت بے پایاں سے اس کے قصور معاف کر دے گا، رہے عادی مجرم تو ان کے لیے
 دنیا کی سزا آخرت کی سزا کا ایک حصہ ہے، روزِ آخرت بھی وہ سزا سے بچ نہیں سکیں گے:

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (بقرہ: ۱۱۳)

ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت و رولائی ہے اور آخرت میں بھی عذابِ عظیم تیار ہے۔

اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اشرار و مجرمین عیش و آرام کی زندگی گزارتے
 ہیں، اور انہیں ہر طرح کی دنیوی عزت و کامرانی حاصل ہوتی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر
 بہت سے نادان اور حقیقتِ حال سے بے خبر انسان اسے اللہ کا لطف و کرم گمان کر بیٹھتے
 ہیں، اور اشرار بھی یہی سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی غلط فہمی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی بندہ خدا کو خوش حالی اور مال و زر کی فراوانی حاصل
 ہے، اور وہ خدا کا مطیع و فرمان بردار بھی ہے تو یہ بیشک اللہ تعالیٰ کا انعام و اکرام ہے

جیسا کہ ارشاد ہے :

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (اعراف: ۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں (خوش حالی) کے دروازے کھول دیتے۔

لیکن اگر کوئی بندہ، خدا کی نافرمانی اور سرکشی کے باوجود خوش حال ہے تو یہ خدا کا انعام نہیں بلکہ اس کا عذاب ہے، ارشاد ہے:

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِم أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ وَحَقَّقْنَا إِذَا قَرَّبُوا بِمَا أَذُنُوا أَأَخَذْنَا مِنْهُمُ لِعَثَّتِهِمْ فَاذًا هُمْ مُبْلِسُونَ ﴿۴۴﴾ (الانعام: ۴۴)

جو کچھ نصیحت انھیں کی گئی تھی جب انھوں نے اسے بھلا دیا تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوش حالی کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان دنیوی نعمتوں میں جو انھیں عطا کی گئی تھیں، مست و مگن تھے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا، اور اب حال یہ تھا کہ وہ سزا پائیاں ہی پاس تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجرموں اور بدکاروں کو جو خوش حالی ملتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے، اور ایک نہ ایک اللہ انھیں ضرور مبتلائے عذاب کرتا ہے، اور اگر کبھی چھوڑ دیتا ہے تو یہ بھی کم عذاب نہیں کہ وہ اس دنیا سے اس حال میں جاتے ہیں کہ انھیں توبہ و استغفار کی بھی توفیق نہیں ملتی۔

اسلامی سزائوں کی حقیقت

اسلام کے تعزیری قوانین کی رو سے مجرمین کو جو سزائیں ملتی ہیں ان پر مغرب سے مرعوب بعض ارباب علم و خرد اعتراض کرتے ہیں کہ یہ سزائیں ظالمانہ ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ ان کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے؟

جرائم کے انسداد یا دوسرے لفظوں میں نفس انسانی کی تہذیب صرف دو طریقوں

سے ممکن ہے، ایک تحویف و تعذیب اور دوسرے ترغیب و تحریص۔ ایک بچے کی تعلیم و تربیت سے لے کر ایک خانان کی بقا اور ایک ملک کے قیام و انتظام، اور ایک اچھے انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لیے یہی دو عنصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں جو تعزیری قوانین نافذ العمل ہیں ان میں آپ کو یہی دو عنصر روح رواں کی حیثیت سے ملیں گے، اور اس میں بھی تحویف و تعذیب کا عنصر غالب ہوگا۔ درحقیقت کسی ملک کا انتظام و انصرام اور تہذیب و تمدن کی بقا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس ملک کے باشندوں کے اندر یہ قوی احساس نہ پایا جائے کہ ان کا ہر وہ فعل قابل مواخذہ اور لائق تعزیر ہے جو فرد یا سماج کے حقوق پر دست اندازی اور ملکی انتظام میں خلل ڈالنے کا سبب بنے گا۔ عدالتیں، جیل اور پولیس فورس کے قیام کی غرض اس کے سوا اور کیا ہوتی ہے کہ سماج کے جن افراد کے اندر مجرمانہ داعیات موجود ہوں ان کو کنٹرول کیا جائے۔

آج مغرب کے جن ملکوں میں تحویف کے عنصر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی جرائم کی سزا میں تخفیف کر دی گئی ہے وہاں شرح جرائم بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، اور اب حالت یہ ہے کہ کثرت کے ساتھ شراب نوشی، زنا کاری، چوری، رہزنی اور قتل جیسے جرائم ان کے سماج میں عام ہو گئے ہیں، اور یہی اخلاقی امراض ایک دن مغربی تہذیب و تمدن کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ کسی بھی سماجی نظام میں تحویف و انذار کے عنصر کو نکال دینے یا اسے غیر مؤثر بنا دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ حبثت النفس انسانوں کی جہالت و دنائت ابھر کر معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لے گی اور شریف النفس انسان سماج میں بالکل دب کر رہ جائیں گے۔

کسی انسانی سماج میں توازن و اعتدال صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتا ہے جب اس میں ترغیب کے ساتھ تحویف کا عنصر بھی حسب ضرورت موجود ہو۔ اسلامی نظام عدل انہی دو عناصر کے اعتدال پر قائم ہے۔ ایک طرف وہ سماج میں نیکوں کے فروغ کے لیے کوشش کرتا ہے تاکہ جو لوگ صالح طبیعت کے ہوں وہ شر و فساد سے محفوظ رہ سکیں اور دوسری طرف وہ برائیوں کے سدباب کے لیے سخت ترین

تدابیر اختیار کرتا ہے تاکہ جو انسانی طبائع غیر صالح ہوں وہ سخت تدابیر کے نتیجے میں غلط روی سے باز آجائیں۔

اس سلسلے میں اسلام سب سے پہلے دلوں میں خدا کے عظیم و خیر ہونے اور روزِ آخرت اعمال کی جزا و سزا کے تصور کو واضح کرتا ہے یعنی یہ بتاتا ہے کہ انسان کا ایک خالق و مالک ہے جو ہر جگہ اور ہر حالت میں اس کے ایک ایک فعل کی نگرانی کر رہا ہے، اور ایک دن جس کو مذہب کی زبان میں آخرت یا یوم الدین کہا جاتا ہے، وہ عدلِ کامل کے ساتھ ہر انسان کے اعمال کا محاسبہ کرے گا، اور اس کے لپچھے اور برے کاموں کی جزا و سزا دے گا۔ اس دن کسی کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا کہ وہ اعمال کے محاسبہ اور اس کے نتائج سے بچ جائے خواہ وہ اس دنیا میں کسی بھی مرتبہ و مقام کا مالک رہا ہو۔

محاسبہ اعمال کے اس تصور کو دلوں میں بٹھانے کے بعد وہ ان تمام اسباب و محرکات کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ایک انسان کو برائیوں کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایسا نظامِ اخلاق و تربیت مرتب کرتا ہے جو انسان کے اندر صالح جذبات و احساسات پیدا کرے، برے جذبات کو دبائے اور اس کے قلب و دماغ میں برائیوں سے ایک فطری تنفر پیدا کر دے۔ ان تمام تدابیر کے بعد ہی وہ سزاؤں کو نافذ کرتا ہے، کیوں کہ اصلاح و تربیت کی جملہ تدابیر کے باوجود اگر کوئی شخص فعلِ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی سماج کے جسم کا ایک ایسا سڑا ہوا عضو ہے جس کو کاٹ کر پھینک دینا باقی جسم کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اس متعفن عضو کو کاٹ کر علیحدہ کر دینا کوئی ظالماً فعل نہ ہوگا بلکہ ظلم یہ ہوگا کہ اس متعفن عضو کو باقی رکھا جائے اور وہ دوسرے اعضاء میں بھی نقصان کے جراثیم پھیلاتا رہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر انسان کا ایک جرم کسی سبب سے پوشیدہ رہ جائے یا اس سے لوگ دیدہ و دانستہ صرف نظر کر لیں تو نہ صرف اس کے اندر دوسرے جرائم کے ارتکاب کی تحریک پیدا ہوتی ہے بلکہ سماج کے دوسرے بہت سے نفس پرست اور مفسدانہ انسان بھی جرائم کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ سماج میں گناہ کا مرض پھیل

متعدی بن جانا ہے۔ اسلامی نظام کا استحکام اور اس کے اخلاقی اصولوں کا اقتضا ہے کہ برائیوں کو ہر ممکن طریقے سے معاشرے میں متعدی بننے سے روکا جائے۔ اور اس کی ایک ہی شکل ہے کہ جرائم کی سزائیں سخت ترین رکھی جائیں تاکہ ہر شخص ان سے عبرت کا درس لے اور جرائم کے ارتکاب سے باز آجائے جیسا کہ زنا کی سزا میں قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ سَدَّ وَلَا
تَأْخُذْ كُفْرُهَا زَافَةً فِي دِينِ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ تُوْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَلَيْسَ هَذَا عَذَابًا لَّهُمَا طَافَةً مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۰﴾ (نور)

زانیہ عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑوں کی سزا دو، اور اللہ کے اس قانون کو نافذ کرنے میں ذرا بھی نرمی کا مظاہرہ نہ کرو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہو۔ اور جب زانیہ عورت اور زانی مرد کو سزا دو تو ذرا ہت پریری کے لیے مومنوں کا ایک گروہ موقع پر ضرور موجود رہے۔

آپ اس پس منظر میں اسلامی سزائوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ دراصل نفس انسان کے امراض کا ایک ناگزیر علاج ہیں۔ فی الواقع اسلام ایک قاتل کو قتل کی سزا دے کر ہزاروں معصوم انسانوں کی جانوں کو ضائع ہونے سے بچا لیتا ہے، وہ ایک زانی اور زانیہ کو سنگسار کر کے ان گنت مردوں اور عورتوں کی عصمت و عفت کی حفاظت کا سامان مہیا کرتا ہے، وہ ایک چور کا ہاتھ کاٹ کر بے شمار افراد کو امن و چین کی نیند سونے اور بے خوف و خطر اپنے کاروباری مشاغل جاری رکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے، وہ شراب نوشوں، بہتان طرازیوں اور دوسرے مجرمین کو کوڑے مار کر کتنے ہی انسانوں کی عزت و ناموس کو پامال ہونے سے بچا لیتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کی ہر سزا مجرم کے لیے نہایت سخت و شدید ہے لیکن سماج کے شرفین اور نیک سرشت انسانوں کے لیے سرتاپا رحمت و شفقت ہے۔

مجرمین کو سخت ترین سزائیں دینے کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی ریاست میں خوف و ہراس کا ماحول پایا جاتا ہے، اور اس میں روزانہ لوگوں کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور ان کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ دراصل اسلام ایک ایسا صالح معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں ارتکاب جرم محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ایک مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ آپ عہد نبوی اور عہد خلافت پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس پورے عرصہ میں قطع ید، جرم اور قصاص وغیرہ کی جو سزائیں دی گئی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اسلام کا نظام تربیت و اخلاق اور اس کے تعزیری قوانین دونوں مل کر سماج سے جرائم کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس واضح حقیقت کے باوجود مغرب کے نام نہاد ارباب علم و دانش اسلام کے تعزیری قوانین کو ظالمانہ اور غیر مہذبانہ کہتے ہیں، اور ان کی کورانہ تقلید میں کچھ تعلیم یافتہ خاندانی مسلمان بھی ان قوانین کو نشانہ اعتراض اور ہدف ملامت بناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے تصور جرم و سزا اور مغرب کے تصور جرم و سزا میں بہت بڑا فرق ہے۔ مغرب کا تصور جرم و سزا یہ ہے کہ ارتکاب جرم سماجی حالات کے تابع ہے۔ سماج ہی ایک شخص کو مجرم بناتا ہے، اس لیے مجرم کو سزا دینے سے پہلے ضروری ہے کہ سماج کی اصلاح کی جائے اور ان تمام اسباب و محرکات کو ختم کیا جائے جو کسی جرم کی علت بنتے ہیں۔ جب تک جرائم کے اسباب و محرکات کا استیصال نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک کسی مجرم کو سخت سزا یعنی سزائے موت دینا ایک ظالمانہ فعل ہوگا۔

اس کے علاوہ مغرب کے نزدیک ظلم و زیادتی کا نام جرم و گناہ ہے، اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی فعل بھی جرم کے درجہ میں نہیں آتا مثلاً زنا بالترامی اس کے یہاں کوئی جرم نہیں ہے، شراب نوشی اور قمار بازی بھی اس کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کی نظر میں ہر وہ انسانی فعل جرم و گناہ اور مستلزم سزا ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے جرم و گناہ قرار دیا ہے خواہ وہ باہمی رضا و رغبت سے ہی کیوں نہ انجام پائے۔ چنانچہ اس کے نزدیک زنا بالترامی بھی ایک قابل مواخذہ و لائق سزا جرم ہے جیسے زنا بالجبر، کیوں کہ زنا کی دونوں ہی شکلیں اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک صالح تمدن اور پاکیزہ انسانی معاشرہ کے لیے موجب ہلاکت ہیں۔

جہاں تک سزائوں کے نفاذ سے پہلے سماج کی اصلاح و تہذیب کا معاملہ ہے، اسلام بھی اصولی حیثیت سے اس کا قائل ہے جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں بیان کر چکے ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک روایت ہے جس میں وہ فرماتی ہیں :-
 انما نزل اول ما نزل منه سورۃ من المفصل فیہا ذکر الجنۃ
 والنار حتی اذا تاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام
 ولو نزل اول شئی لا تشربوا الخمر لقالوا لاندع الخمر ابداً
 ولو نزل لا تنزلوا لقالوا لاندع الزنا ابداً
 قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل کی گئی وہ ایک ایسی مفصل سورہ ہے جس میں دوزخ
 و جنت کا ذکر ہے، یہاں تک کہ جب لوگ دائرہ اسلام میں مکمل طور پر آگئے تب حلال و
 حرام کے احکام اترے، اور اگر بالکل شروع ہی میں حکم آجاتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے
 کہ ہم ہرگز شراب نہ چھوڑیں گے، اور اگر یہ حکم دیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنا
 نہ چھوڑیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اپنے تعزیری قوانین کی تنفیذ افراد معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی
 حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے تدریج کے ساتھ کرتا ہے، اور ان کے اطلاق میں احوال و ظروف کی
 پوری رعایت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں چوری کی سزا قطعید (AMPUTATION
 OF HAND) ہے، لیکن وہ اس سزا کا نفاذ اسی وقت کرتا ہے جب اسلامی مملکت میں
 کوئی بے روزگار اور بھوکا اور تنگدیں رہ جاتا۔ وہ پہلے رزق کی ضمانت دیتا ہے اور پھر قطعید
 کی سزا نافذ کرتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چوری کی علت صرف بے روزگاری
 اور غربت و افلاس ہی نہیں ہے۔ ہر ملک میں چوری کے کتنے ہی ایسے واقعات مل جائیں گے
 جس میں چور کا تعلق خوش حال گھرانوں سے ہوتا ہے۔ کوئی بتائے کہ اس حالت میں علت
 سرقہ کیا ہے؟ کیا یہ اس کی بدترین خصلت کا ثبوت نہیں ہے؟ اور کیا ایسے مجرموں کے ساتھ
 بھی نرمی یا عفو و درگزر کا معاملہ کیا جاسکتا ہے؟ بالخصوص اس وقت جب معلوم ہو جائے
 کہ یہ عادی مجرم ہے۔ اسلام میں ایسا مجرم لینت اور عفو و درگزر کا مستحق نہیں ہے۔ ایسے مجرموں

کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرنا گویا دیدہ و دانستہ از نکاب جرائم کو ہوا دینا ہے، اور یہ شریف اور امن پسند انسانوں کے ساتھ صریح ظلم ہے۔ اسلام عفو و درگزر کا مظاہرہ صرف اس حالت میں کرتا ہے جب یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ واقعہ سرقہ کا سبب غربت و افلاس اور فقر و فاقا ہے۔ اسلام ایسی حالت میں قطعید کا حکم نہیں دیتا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں جب قحط پڑا تو آپ نے قطعید کی سزا کو منسوخ کر دیا اور عملاً اس پر عمل بھی فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام سزا اور عفو و درگزر کے معاملے میں اعتدال و توسط کی راہ اختیار کرتا ہے اور تنفیذ سزا میں احوال و ظروف کی پوری رعایت کرتا ہے۔

اسلام اپنے تعزیری قوانین کے نفاذ سے پہلے محض سماج سے جرائم کے خارجی اسباب و محرکات کو ہی ختم کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ افراد کے قلوب کے تزکیہ کا بھی انتظام کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ از نکاب جرائم صرف سماجی حالات کے تابع نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کے باطن سے بھی ہے۔ اس لیے جب تک افراد کے قلوب کا تزکیہ نہ ہوگا، سماج سے جرائم کے اسباب و محرکات کو کٹتے ختم نہیں کیا جاسکتا ہے اس کی ایک عمدہ مثال ہم کو خود جدید مغربی معاشرہ کے اندر ملتی ہے۔

امریکہ میں امتناع شراب کے قانون کی تنفیذ سے پہلے اس اُمّ الخباثت کی اخلاقی و جسمانی مضرتوں سے امریکی عوام کو باخبر کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا، تمام ذرائع ابلاغ کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا گیا، اور کروڑوں روپیے اس اصلاحی مہم پر خرچ

۱۰۰ لاکھ روپیے کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرنا گویا دیدہ و دانستہ از نکاب جرائم کو ہوا دینا ہے، اور یہ شریف اور امن پسند انسانوں کے ساتھ صریح ظلم ہے۔ اسلام عفو و درگزر کا مظاہرہ صرف اس حالت میں کرتا ہے جب یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ واقعہ سرقہ کا سبب غربت و افلاس اور فقر و فاقا ہے۔ اسلام ایسی حالت میں قطعید کا حکم نہیں دیتا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں جب قحط پڑا تو آپ نے قطعید کی سزا کو منسوخ کر دیا اور عملاً اس پر عمل بھی فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام سزا اور عفو و درگزر کے معاملے میں اعتدال و توسط کی راہ اختیار کرتا ہے اور تنفیذ سزا میں احوال و ظروف کی پوری رعایت کرتا ہے۔

اسلام اپنے تعزیری قوانین کے نفاذ سے پہلے محض سماج سے جرائم کے خارجی اسباب و محرکات کو ہی ختم کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ افراد کے قلوب کے تزکیہ کا بھی انتظام کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ از نکاب جرائم صرف سماجی حالات کے تابع نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کے باطن سے بھی ہے۔ اس لیے جب تک افراد کے قلوب کا تزکیہ نہ ہوگا، سماج سے جرائم کے اسباب و محرکات کو کٹتے ختم نہیں کیا جاسکتا ہے اس کی ایک عمدہ مثال ہم کو خود جدید مغربی معاشرہ کے اندر ملتی ہے۔

امریکہ میں امتناع شراب کے قانون کی تنفیذ سے پہلے اس اُمّ الخباثت کی اخلاقی و جسمانی مضرتوں سے امریکی عوام کو باخبر کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا، تمام ذرائع ابلاغ کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا گیا، اور کروڑوں روپیے اس اصلاحی مہم پر خرچ

کیے گئے، اور عوام کی اکثریت کی رائے سے جنوری ۱۹۲۱ء میں اس کی کشید اور خرید و فروخت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ لیکن ۱۳ سال کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۳۳ء میں حکومت امریکہ کو یہ قانون واپس لینا پڑا کیوں کہ امریکی عوام تادیر اس ”نبتِ عنب“ کے فراق کو برداشت نہ کر سکے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ شراب کی مفرتوں سے امریکی عوام کو آگاہ تو ضرور کیا گیا لیکن ان کے قلوب و نفوس کے تزکیہ کا کوئی بند و بست نہیں کیا گیا۔ اس کے برخلاف جب صحابہ میں اسلام نے تخریمِ خمر کا اعلان کیا تو وہی عرب جو اس دختِ رز کی محبت میں سر تا پا غرق تھے، اس سے اس طرح متنفر ہو گئے جیسے اس سے پہلے ان کے نزدیک اس سے زیادہ نامرغوب اور قابلِ نفرت کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ تخریمِ خمر کے اعلان کے ساتھ ہی ہر گھر میں شراب کے جام و مینا چکنا چور کر دیے گئے، اور شرابِ مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہ نکلی۔ اسلامی سماج سے اس امّ الخبائث کو اتنی آسانی کے ساتھ اس لیے نکال باہر کیا گیا کہ تخریمِ خمر کے قانون کی تنفیذ سے پہلے افراد کے قلوب و اذہان کا بڑی حد تک تزکیہ کر دیا گیا تھا اور حکمِ خدا و رسول کی اطاعت کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔

اسلام اور مغرب کے تصورِ جرم و سزا میں جو فرق پایا جاتا ہے یہ دراصل اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ دونوں کے تعزیری قوانین اپنی شکل و صورت میں قطعاً مختلف ہیں۔ اب اگر اہل مغرب کو اسلامی سزائیں ظالمانہ اور غیر مہذبانہ نظر آتی ہیں تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ عام طور پر لوگ اسلامی سزائوں کی سختی کو تو دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ یہ تعزیری قوانین کس طرح کے سماج کے لیے وضع کیے گئے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین اپنی شکل و نوعیت کے اعتبار سے صرف ایک مخصوص کردار کی حامل اسلامی ریاست کے لیے ہی موزوں ہیں، مغربی طرز کی سوسائٹی کے لیے وہ قطعاً غیر موزوں ہیں۔ اگر کسی عربیوں اور بے کردار سوسائٹی میں ان قوانین کو نافذ کر دیا جائے تو وہ سوسائٹی کے افراد کی نظر میں یقیناً ظالمانہ اور غیر مہذبانہ نظر آئیں گے۔ لیکن یہی قوانین جب ایک صالح اور باکردار سوسائٹی کے افراد پر نافذ کیے جائیں گے تو وہ انہیں اپنے لیے باعثِ رحمت تصور کریں گے۔ اور اگر ایسی باکردار سوسائٹی میں مغرب کے تعزیری قوانین نافذ کر دیے جائیں تو وہ سوسائٹی کے افراد کی نظر میں اسی طرح غیر مہذبانہ نظر آئیں گے

جس طرح اہل مغرب کی نظر میں اسلامی قوانین غیر مہذبانہ نظر آتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قوانین سماجی حالات و ضروریات کے تابع ہیں۔ جس طرز تمدن کا حامل سماج ہوگا اسی کے مطابق اس کے قوانین بھی ہوں گے۔ اسلام ایک مخصوص طرز زندگی اور فلسفہٴ حیات کا حامل ہے اس لیے اس کے تخریری قوانین اسلامی ریاست کے حالات و ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ مغرب یا مغربی علوم کے فاضلین کو ان قوانین پر اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کیوں کہ ان کے نظریہٴ حیات اور اسلامی نظریہٴ حیات میں بعد المشرقین ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اگر کوئی شخص اسلامی قوانین پر زبانِ اعتراض دراز کرتا ہے تو یہ اس بات کا پتہ ثبوت ہے کہ وہ قانون کی روح اور قانون و سماج میں تعلق کی نوعیت سے بالکل ناواقف ہے۔

ایک مخصوص کردار کی حامل اسلامی ریاست میں بھی اسلام اپنے تخریری قوانین کو یکلخت نافذ نہیں کر دیتا بلکہ جیسا کہ ہم پہلے آپ کو بتا چکے ہیں، احوال و ظروف کی پوری رعایت کرتے ہوئے تدریج کی راہ اختیار کرتا ہے۔ جیسے جیسے تزکیہٴ نفس اور تطہیر معاشرہ کا کام آگے بڑھتا جاتا ہے اسلام کے تخریری قوانین کی مختلف دفعات کی تنفیذ بھی ہوتی رہتی ہے۔

اسلام اپنے تخریری قوانین کے اطلاق میں بھی بہت زیادہ حزم و احتیاط سے کام لیتا ہے تاکہ کسی معصوم اور بے گناہ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تخریری قوانین میں کسی شخص کو مجرم اور مستوجب سزا قرار دینے کے لیے درج ذیل دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی تکمیل ضروری ہے۔ پہلی شرط عینی گواہوں کی شہادت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاَسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً
مِنْكُمْ، اِنْ شَهِدُوا فَاَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّهِنَّ الْمَوْتُ
اَوْ يُجْعَلَ اللهُ لَهُنَّ مَخْرَجًا ۗ (نساء: ۱۵)

تمہاری عورتوں میں سے جو بدچلتی (فعل زنا کی) مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لے لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند کر دو

یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی سبیل (نجات) نکال دے۔

اور دوسری شرط مجرم کا اقبال جرم ہے۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”تم میں سے جو آدمی ان برے افعال میں سے کسی کام مرتکب ہو جائے تو اللہ کے ڈالے ہوئے پردہ میں چھپا رہے لیکن اگر وہ ہمارے سامنے اپنا پردہ کھولے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا قانون نافذ کر کے چھوڑیں گے“۔

اسلامی سزاؤں میں جو سزا مغرب کے نزدیک سب سے زیادہ بے رحمانہ ہے وہ فعل زنا کی سزائے رجم ہے لیکن اسلام اس سزا کے نفاذ کے لیے چار عینی گواہوں کی شرط کو جیسا کہ مذکورہ آیت قرآنی سے واضح ہے، لازم سمجھتا ہے۔ آپ انصاف سے بتائیں کہ عام حالات میں چار عینی گواہوں کا ملنا ممکن ہے؟ اگر مجرم خود اقبال جرم کرتا ہے تو بھی اسلام سزا کے نفاذ میں جلدی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ہدایت کرتا ہے کہ خوب چھان بین کرنے کے بعد ہی اسے سزا دی جائے۔ میں اس سلسلے میں عہد نبوی کا ایک واقعہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

ابوداؤد میں ہے کہ مالک بن ماعز اسلمی جو قبیلہ اسلم کا ایک شہسوار کا تھا اور جس کی پرورش حضرت ہنرال بن نعیم کے گھر میں ہوئی تھی، وہ ایک آزاد کردہ لونڈی سے زنا کر بیٹھا۔ حضرت ہنرال کے کہنے پر وہ حضور کے پاس گیا اور کہا:-

”یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے، میں نے زنا کیا ہے“ آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا: ارے چلا جا، اور اللہ سے توبہ و استغفار کر۔ مگر پھر اس نے سامنے

آکر وہی بات کہی اور آپ نے منہ پھیر لیا۔ اس نے تیسری بار وہی بات کہی۔

اور آپ نے منہ پھیر لیا۔ حضرت ابوبکر نے اس کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا

کہ دیکھو اگر اب تم نے جو تھی باریہ کہا تو حضور تم کو ضرور رجم کرادیں گے۔

مگر وہ نہ مانا اور پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔ اب حضور اس کی طرف متوجہ ہوئے

اور اس سے فرمایا: شاید تم نے بوس و کنار کیا ہوگا یا چھیر چھاڑی ہوگی یا

نگاہ بد ڈالی ہوگی؟ اس نے کہا ”نہیں“ آپ نے پوچھا: کیا تو اس سے ہم بستری

ہوا ہے؟ اس نے کہا ”ہاں“ آپ نے پھر پوچھا: کیا تو نے اس سے مباشرت

کی ہے؟“ اس نے کہا ”ہاں“

اس کے بعد آپ نے متعدد ایسے الفاظ زبان مبارک سے ارشاد فرمائے جن کو عام حالات میں آپ کبھی زبان پر نہیں لاتے تھے لیکن ان الفاظ کا استعمال آپ نے بجز واکراہ صرف اس لیے فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس نے واقعی زنا کیا ہے۔ آخر میں آپ نے پوچھا:

”کیا تم کو معلوم ہے کہ زنا کیا چیز ہے؟“ اس نے کہا ”ہاں میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا ہے جو ایک شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔“ آپ نے پوچھا: کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟“ اس نے کہا ”ہاں“ آپ نے پوچھا: تو نے شراب تو نہیں پی ہے؟“ اس نے کہا ”نہیں“ ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپ نے اس کے حملہ والوں سے پوچھا: یہ دیوانہ تو نہیں؟“ انھوں نے کہا ”ہم نے اس کی عقل میں کوئی خرابی نہیں دیکھی ہے۔“ آپ نے ہزال سے فرمایا: کاش تم نے اس کے عیب کو ڈھانک دیا ہوتا تو تمہارے لیے یہ زیادہ بہتر ہوتا“

اس کے بعد آپ نے ماعز کو زچم کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا۔

اس واقعہ سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں گناہوں کی پردہ پوشی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ گناہ کی پردہ پوشی کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام گناہ کو کوئی میسوب چیز نہیں سمجھتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ گناہ کے واقعات کو کریڈر کر دیکر منظر عام پر نہ لایا جائے، کیوں کہ گناہ جب تک پوشیدہ حالت میں ہوتا ہے وہ اس گندگی کی طرح ہے جو کسی ایک ہی جگہ میں بند ہو اور اس کی بدلہ سے لوگ بے خبر ہوں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ارتکاب گناہ کے بعد گنہگار کسی وقت اپنے گناہ پر نام ہو کر تائب ہو جائے اور اس طرح برائی کا خود بخود خاتمہ ہو جائے۔ لیکن جب گناہ طشت از بام ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہر محفل کا موضوع گفتگو بن جاتا ہے اور اس طرح بند گندگی پھیل کر سارے معاشرہ کو اپنی پیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس

لہ ابو داؤد کے علاوہ بخاری، مسلم اور ترمذی نے بھی اس حدیث کیا ہے۔ دیکھئے جمع الفوائد جلد ۱ ص ۲۶۵

کے ازالہ کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ گناہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے خواہ اس کے لیے ایک گنہگار کے وجود ہی کو ختم کر دینا پڑے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام مجرموں کو سزا دینے میں شقاوت اور بے رحمی کا مظاہرہ کرتا ہے، لیکن یہ محض مخالفین اسلام کا پروپیگنڈہ ہے تاکہ اسلام کو رسوا اور بدنام کیا جائے۔ اس باب میں اسلام کی جو روشن تعلیمات ہیں ہم ان کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

● مجرم کو تازیانے اس طرح لگائے جائیں کہ اسے جسمانی اذیت تو پہنچے لیکن اسے مجروح نہ کر دے اور مارنے والا اس طرح تازیانے لگائے کہ بغل نہ کھلے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مارنے والے کو ہدایت فرماتے تھے کہ: اس طرح مار کہ تیری بغل نہ کھلے اور ہر عضو کو اس کا حق مل جائے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو مطیع بن الاسود کے پاس بھیجا اور ان سے فرمایا: کل صبح اس کو تازیانے لگاؤ، ٹھیک اس وقت جب وہ نوجوان کو ضرب شدید لگا رہے تھے، حضرت عمرؓ گئے، اس منظر کو دیکھا تو فرمایا: تو نے تو اسے ماہری ڈالا، کتنے تازیانے لگا چکے ہو؟ اسود نے کہا: ۶۰ تازیانے آپ نے فرمایا: بیس تازیانے اس سے ساقط کر دو تاکہ تم نے جو شدید تازیانے لگائے ہیں وہ باقی بیس تازیانوں کے لیے قصاص بن جائیں، اسے اب میں تازیانے نہ لگاؤ بلکہ

● ضرب معتدل ہونی چاہئے کیوں کہ سزا کا مقصد ایلام ہے نہ کہ کھال ادھیڑ لینا۔ ابن عمرؓ نے جب اپنی پڑوس کو تازیانے لگائے تو ان کے لڑکے نے اعتراض کیا اور کہا: کیا اللہ کے قول وَلَا تَأْخُذْ كُذْبًا سِوَا ذُنُوبٍ فِي دِينِ اللَّهِ كَالْهَيْبَةِ مَقْهُومٍ ہے؟ آپ نے فرمایا: انے بیٹے (تم نے غالباً یہ خیال کیا کہ میں پڑوسن کے ساتھ نرمی برت رہا ہوں) اللہ نے ہمیں اس کو مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ ہم اس کے سر پر تازیانے لگائیں۔ میں نے تازیانے اس طرح لگائے ہیں کہ اسے (مثنائے شریعت کے مطابق) اذیت پہنچا دوں بلکہ

● مارنے میں چہرہ اور شرم گاہ کو پچایا جائے، صرف پشت پر تازیانے لگائے جائیں، ہتھ لگاتے وقت مرد کے تمام کپڑے بجز پاجامہ کے، مار دیئے جائیں، لیکن عورت کے کپڑے نہ

آٹارے جائیں بلکہ اس کے کپڑوں کو مضبوطی سے باندھ دینا چاہیے تاکہ بوقت ضرب اس کا جسم کھل نہ جائے۔ مرد کو کھڑا کر کے اور عورت کو بٹھا کر تازیانے لگانے جائیں۔
 ● سخت سردی اور سخت گرمی میں مارنا ممنوع ہے۔ مجرم کو باندھ کر مارنا بھی ممنوع ہے الا یہ کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرے۔

● مجرم اگر مریض ہے تو اس کو تازیانے اسی وقت لگانے جائیں جب وہ صحت یاب ہو جائے لیکن اگر صحت یابی کی کوئی اُمید نہ ہو تو سوشاخوں والی ایک ٹہنی سے صرف ایک ضرب لگانا کافی ہے تاکہ قانون کا منشا پورا ہو جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بوڑھا شخص فعل زنا کا مرتکب ہوا تو آنحضرتؐ نے اس کو یہی سزا دلائی تھی۔
 ● اگر عورت حاملہ ہے تو وضع حمل کا مرحلہ اور زمانہ نفاس گزر جانے کے بعد ہی اس کو سزا دی جائے، اور اگر اسے رجم کرنا ہو تو زمانہ رضاعت تک سزا کو مؤخر کیا جائے یہاں تک کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دے۔

سزا کے باب میں اسلام کی ان روشن تعلیمات و ہدایات کے بعد بھی کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہے کہ اسلامی سزائیں وحشیانہ اور غیر مہذبانہ ہیں؟ یہ جسارت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو خود مجرمانہ داعیات و میلانات کا حامل ہوگا، اور جس کے نزدیک بے حیائی و بدکاری کوئی قابلِ نفرت چیز نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین کو نظر انداز کر کے ایک پاکیزہ اور عدل و راستی پر مبنی انسانی معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔

اُخروی سزا

روزِ آخرت کافروں اور مجرموں کو ان کے برے اعمال کی پاداش میں جو سزائیں ملیں گی وہ دو طرح کی ہیں، ایک کو قرآن مجید نے نارِ جہنم سے تعبیر کیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا:-

سَلٰہِ احکام القرآن جصاص ج ۳، ص ۳۲۲ تلمذ المیر فی علم التفسیر ج ۶، ص ۸۔

سَلٰہِ احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ

فِيهَا، وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۰﴾ (سورہ تغابن: ۱۰)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ والے ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَٰنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي تَارِجِهِمْ خَالِدِينَ فِيهَا،

أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿۶﴾ (بینہ: ۶)

بیشک اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے بھی کفر اختیار کیا وہ آتش جہنم میں ڈالے جائیں گے، جہاں ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔

اور دوسری سزا کو اللہ تعالیٰ کے دیدار و کلام سے محرومی کی شکل میں پیش کیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا:

كَلَّا لَأَنَّهُمْ عَنِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ لَمَجْحُوبُونَ ﴿۱۵﴾ (تلفیظ: ۱۵)

ہرگز نہیں، یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے محروم کر دیے جائیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷﴾ (آل عمران: ۷)

ایسے ہی لوگوں کے لیے روز آخرت کوئی حصہ نہیں ہے۔ نہ تو اللہ ان سے کلام فرمائے گا

نہ قیامت کے دن ان کی طرف (نظر محبت سے) دیکھے گا اور نہ ہی ان کو (گناہوں سے)

پاک و صاف کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہ ایک ایسی سزا ہے جس سے زیادہ غم انگیز، اضطراب آفریں اور قلب و روح

کو گھلا دینے والی کوئی دوسری سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی شقاوت و نامرادی کی بات

ہے کہ اس سے بڑی نامرادی و سیاہ بختی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک عاشق

اپنے محبوب کی طرف سے پہنچنے والی ہر تکلیف کو سہی خوشی گوارا کر سکتا ہے لیکن یہ کسی طرح

بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لیے سلسلہ کلام و پیام بند کر دے۔ یہ ایک محبوب

کی خفگی و ناراضگی کی انتہائی حالت ہے اور ایک تپتے عاشق کے لیے سوہانِ روح سے کم نہیں ہوتی۔ وہ محبوب کے فراق میں ہر رنج و الم کو صرف اس امید میں بھیل لے جاتا ہے کہ شاید ایک دن اس کا محبوب اس سے راضی ہو کر اپنے دیدار و کلام سے نواز دے۔ لیکن اگر اسے کسی لمحہ بھی بالیقین یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا محبوب اس سے کبھی رہنی نہ ہوگا، اور وہ اس کے رونے تاباں کے دیدار اور اس کے سخنِ دل نواز سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے تو وہ لمحہ اس کے لیے پیامِ مرگ ثابت ہوگا۔ اس وقت اس کے جسمانی اضطراب اور روحانی کرب و التہاب کا جو عالم ہوگا اس کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو بادۂ عشق و محبت کا جرّ خواہر ہوگا۔

جہنم کی سزائیں کن لوگوں کے لیے ہیں

جہنم کی سزائیں فی الواقع انہی لوگوں کے لیے ہیں جو اس دنیا میں برے اعمال کرتے ہیں لیکن توبہ و استغفار نہیں کرتے، بلکہ دیدہ و دانستہ ایک کے بعد دوسرے برے عمل کے لیے مستعد رہتے ہیں، اور اسی حالتِ فسق و فجور میں اس دار فانی سے رحلت کر جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہنم کافروں، مشرکوں، مجرموں اور سرکشوں کے لیے ہے۔

آخری سزاؤں کا مادی پہلو

جہنم کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں عذابِ الہم کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھنچ جاتی ہے جس سے زیادہ المناک تصویر کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے جہنم کی جو کیفیات بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مقامِ تعذیب ہے جہاں مجرموں اور سرکشوں کو ان کے افعالِ بد کی سزائیں ملیں گی۔ ان سزاؤں پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں اپنی شکل و نوعیت میں آدی خصائص رکھتی ہیں یعنی یہ وہی سزائیں ہیں جو اس عالمِ مادی میں مجرموں اور بدکاروں کو دی جاتی ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا:

خُذُوهُ فَعَلَّوْهُ ۖ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلَّوْهُ ۖ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا

سَبْعُونَ ذِرَاعًا قَانَسُكُوهُ ۝ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الْعَظِيمَةِ ۝
 وَلَا يَحْضُرُ عَلَاطِعَ الْمَسْكِينِ ۝ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَهُنَا حَمِيمٌ ۝
 وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسِيلِينَ ۝ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْغَاطُونَ ۝ (الحاقة: ۳۷-۴۰)

(فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس شخص کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو پھر اس کو
 دوزخ میں ڈھکیں دو۔ پھر اس کو ایک ستر گز کی زنجیریں جکڑ دو۔ یہ شخص نہ تو خدا نے بڑگ
 و برتر پر ایمان رکھتا تھا، اور نہ خود کو غریبوں کو کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔ آج کے دن
 اس شخص کا کوئی بھی دوست دار نہیں ہے، اور زخموں کے دھوون کے سوا جو صرف
 خطا کاروں کا کھانا ہے، اس کے لیے کوئی دوسرا کھانا بھی نہیں ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

تَصَلَّى نَارًا حَامِيَةً ۝ تَنفَى مِنْ عَيْنِ النَّبِيِّ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ صَرِيرٍ ۝
 لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ۝ (غاشیہ: ۲-۷)

وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور کھولتے ہوئے چشے کا پانی ان کو پلایا جائے گا
 اور کانٹوں کے سوا ان کو اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا جس کو کھا کر نہ تو وہ موٹے ہو سکیں گے
 اور نہ ہی ان کی بھوک رفع ہو سکے گی۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَى سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ صَبُّوا عَلَيْهِ مِنْ
 عَذَابِ الْعَمِيمِ ۝ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝
 (دخان: ۴۹)

اس شخص کو پکڑو اور اس کو گھیٹے ہوئے جہنم کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ، پھر اس کے
 سر پر تکلیف دینے والا گرم پانی پھوڑ دو (اور کہو) لے اس عذاب کا مزہ چکھو تو (دنیائیں)
 بڑا معتز و مکرم تھا۔

اُخْرَى سُرُوفٍ كِي ان مَادِي نَصُوصِيَاتٍ كُو دِيكِيهِ كَرِهَارَسَ عِلْمَا كِي اِيك بَرِي تَعْدَاد
 كَا يَحْيَالِ هَي كَر عَالِمِ اُخْرَتِ مِي مَجْرَمُو كُو جُو سُرَائِي طِي سِ كِي وَه اِنْبِي شَكْل وَنُوعِيَتِ كَلِ اَعْتَابِ
 مَحْكَمِ دَلَائِلِ سَي مَزِيَا مَتْنُوعِ وَ مَفْرَدِ مَوْضُوعَاتِ پَر مَشْتَمَلِ مَفْتِ اَنْ لَانِنِ مَكْتَبِه

سے قرآنی الفاظ و بیان کے عین مطابق ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جزا اور سزا دونوں ہی تمثیلی انداز میں بیان کی گئی ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا :-

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأَنْتُمْ بِمَثَلِهَا لَا تَعْلَمُونَ وَإِنَّ اللَّهَ لَاسْتَعْتَبَ أَنْ يَصْرِبَ مَثَلًا لَبُؤُوسَةً فَلَمَّا قَامَ الَّذِينَ آمَنُوا يَقْتُلُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكْفُرُونَ مَا ذَا آرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۗ (بقرہ: ۲۶۵)

اور (اے پیغمبر) جو لوگ ایمان لے آئیں اور اچھے عمل کریں ان کو خوشخبری دے دو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوتی ہوں گی جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں تو کہیں گے، یہ وہی پھل ہے جو اس سے پہلے ہمیں دنیا میں عطا ہوا تھا۔ اور باہم دگرگتی جاتی ہوئی چیزیں ان کے سامنے آئیں گی۔ ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ بیشک اللہ اس بات سے ہرگز نہیں شرماتا کہ (حقیقت سمجھانے کے لیے) مچھر یا اس سے بھی زیادہ حقیر چیز کی تمثیل دے۔ پس جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ (انہی تمثیلوں کے ذریعہ) جان لیتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہے ان کے پروردگار کی طرف سے ہے، لیکن جن لوگوں نے انکار حق کی راہ اختیار کی ہے وہ (ان تمثیلات کو سن کر) کہتے ہیں کہ ایسی تمثیل بیان کرنے سے اللہ کا منشا کیا ہے؟

دوسری جگہ فرمایا :-

وَمَا آذْرُكَ مَا سَعَرَهُ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۗ لَوَاحٍ لِّلْبَشِيرِ ۗ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشْرَةَ وَمَا جَعَلْنَا أَحْضَبَ النَّارِ إِلَّا مَكِيدَةً ۗ وَمَا جَعَلْنَا عَذَابَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً ۗ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ۗ لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزِدَّ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَ

۱۷۰ یہ جزا کی تمثیل ہے اور اس پر مفصل گفتگو گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

الْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا (مذہب: ۲۷-۳۱)

اور تم کیا جانو کہ دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی، کھال جھلس کر جسم کا رنگ دہشت بگاڑ دے گی۔ انیس کارکن اس پر مقرر ہیں۔ ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں، اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے قسہ بنا دیا ہے، تاکہ اہل کتاب (سننے کے ساتھ) یقین کر لیں، اور ایمان لانے والوں کا ایمان اور بڑھ جائے اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں، اور جن کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے اور منکرین حتیٰ کہ یہیں کر ایسی مثال بیان کرنے سے اللہ کا مشا کیا ہے؟

روزِ آخرت انسانوں کے اعمال کے نتائج کن کن صورتوں میں ظاہر ہوں گے، ان کا حقیقی ادراک انسان کی محدود عقل و فہم کے سبب ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اعمال کے روحانی نتائج کو مادی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے تاکہ ہم اس دنیا میں اعمالِ خیر و شر کی حقیقت اور اس کے نتائج سے آگاہ ہو سکیں۔ اگر قرآن عذابِ آخرت کو اُن مادی صورتوں میں پیش نہ کرتا جن مادی صورتوں کو ہم اپنی دنیا میں عذاب کی صورت سمجھتے ہیں تو انسان برے اعمال کے عواقب کی صحیح حقیقت سے واقف نہ ہو سکتا، اور نہ ہی برے اعمال کے ارتکاب سے اپنے اندر کوئی خوف محسوس کرتا، کیوں کہ کلفت و آزار کی محسوس صورتیں ہی اس کے اندر خوف پیدا کر سکتی ہیں، اور اس کو کسی فعل کے ارتکاب سے روک سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر آگ ایک اذیت پہنچانے والی چیز ہے۔ انسان اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر اس کی اذیت رسانی کا یقین رکھتا ہے، اور اسی لیے وہ کبھی دیدہ و دانستہ اس میں اپنا ہاتھ نہیں ڈالتا۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے اور اس کے نتائج کے تصور سے اس کے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انسان تاریخ کے ہر دور میں کسی فرد یا جماعت کو کسی الزام میں جو سب سے بڑی سزا تجویز کی گئی ہے وہ یہی کہ اسے آگ میں ڈال دیا گیا، خود قرآن مجید میں اصحابِ اخدود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگ تعذیبِ جسمانی کا سب سے زیادہ الم انگیز اور خوفناک ذریعہ ہے۔

تعذیب و ایلام کے اس مادی پہلو کو سامنے رکھ کر جب ہم نار یا نارِ جہنم کے الفاظ پر جو

قرآن مجید میں کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں، غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مقصود ہر جگہ انتہائی سزا کا تصور دلانا ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ آتش جہنم سے مراد وہی آگ ہے جو ہماری اس دنیا میں موجود ہے۔ اس کی حیثیت ایک استعارہ کی ہے۔ روزِ آخرت ایک مجرم و سرکش کو اپنے برے اعمال کی پاداش میں جو تکالیف پہنچیں گی، اور اس کے اضطراب و ہیجان کا جو عالم ہوگا وہ کچھ اس طرح کا ہوگا جیسے اس دنیا میں آگ سے جلنے والے شخص کا ہوتا ہے۔ ہم فی الواقع عذابِ نار کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ ہمارے لیے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ اس دن ہمارے برے اعمال کے نتائج بری صورتوں میں ظاہر ہوں گے، اور ہمارے لیے موجبِ ذلت و خواری اور باعثِ رنج و الم ہوں گے۔

جہنم کی حقیقت

عالمِ آخرت میں سزاؤں کی مادی خصوصیات کو دیکھ کر بعض نادان ارباب علم و خرد جہنم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ عالمِ غیر مادی میں مادی احوال و مقامات کا وقوع کیوں کر ممکن ہے؟ اس سلسلے میں مسلم فلاسفہ نے جو توجیہات پیش کی ہیں وہ کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال نے اپنی کتاب ”تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ“ میں لکھا ہے کہ ”جہنم کوئی جگہ نہیں بلکہ تادیب کا ایک عمل ہے۔“

ہمارے علماء و فلاسفہ نے بحث و گفتگو میں یہ حقیقت بھلا دی کہ وہ جس موضوع پر کلام کر رہے ہیں وہ عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے، اور ان امورِ غیب تک انسانی فکر و فہم کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ فی الواقع قرآن مجید میں جنت اور جہنم کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ انسان کی فطری فہم و استعداد کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے، اور انھیں الفاظِ اولیٰ و سہولت کلام میں حقیقتِ حال کو کھولا گیا ہے جو اس کے لیے قابلِ فہم تھے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کی حیثیت تمثیلاتی ہے جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں

لہ تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۱۸۶ (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء)

بیان کر چکے ہیں۔

جنت اور دوزخ کے متعلق جتنی آیات قرآن مجید میں آئی ہیں ان پر غور کریں تو مان معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم کو اعمال کے اثرات و نتائج سے خبردار کر رہی ہیں۔ ان آیات میں اعمال کے اچھے نتائج کو جنت کی کامرانیوں اور لذتوں کی صورت میں اور برے نتائج کو دوزخ کی تکالیف و آزار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، دوسرے لفظوں میں برے اعمال کے برے نتائج کو جہنم سے اور اچھے اعمال کے اچھے نتائج کو جنت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کو فلسفیانہ اور علمی زبان میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیں کہ اس عالم مادی میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اپنے خواص و نتائج نہ رکھتی ہو مثلاً آگ کا خاصہ جلانا، سنکھیا کا خاصہ ہلاکت، پانی کا خاصہ ٹھنڈک و رطوبت، شہد کا خاصہ مٹھاس اور ایلو کا خاصہ تلخی ہے۔ ان اشیاء کے یہ خواص کسی حالت میں بھی تبدیل نہیں ہوتے۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آگ میں کسی نے ہاتھ ڈالا ہو اور وہ جلنے سے بچ گیا ہو، سنکھیا کھائی ہو اور اس کا نتیجہ ہلاکت کی صورت میں سامنے نہ آیا ہو۔ ان اشیاء کے نتائج و خواص پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان سب میں ایک مشترک قانون عمل کام کر رہا ہے جس کو ہم مکافاتِ عمل کا قانون کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جیسے ہی کوئی عمل واقع ہوتا ہے اس کا ایک رد عمل ضرور سامنے آتا ہے جسے ہم اس فعل کی مکافات کہہ سکتے ہیں۔ آگ میں ہاتھ ڈالنا ہمارا ایک عمل ہے اس کا رد عمل جلنے کی صورت میں سامنے آتا ہے جو پہلے عمل کی مکافات ہے۔

کائنات ہستی کا کوئی گوشہ اس کلیہ یعنی مکافاتِ عمل کے قانون سے خالی نہ ملے گا جب صورت حال یہ ہے تو پھر انسانی اعمال کے خواص و اثرات پر کسی کو حیرت کیوں ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی طرح اعمال کے بھی خواص و نتائج متعین کر دیے ہیں، اور یہ خواص و نتائج ہر حالت میں اپنا ظہور رکھتے ہیں۔ یہ غیر متبدل قانونِ فطرت ہے۔ کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اعمال کے اثرات و نتائج کو تبدیل کر دے۔

جو قانونِ مکافات اس دنیا کی ہر چیز میں جاری و ساری ہے وہی قانونِ مکافات عالمِ آخرت کے لیے بھی ہے۔ وہ قانونِ مکافات کیا ہے؟ یہی کہ اچھے اعمال کا بدلہ اچھا محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور برے اعمال کا بدلہ بری صورت میں نکلے گا مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں:

”تم گہوں بوتے ہو اور تمہارے دل میں کبھی یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ گہوں پیدا نہ ہوگا۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ممکن ہے گہوں کی جگہ جو ایدہ ہو جائے تو تم اسے پاگل سمجھو گے، کیوں؟ اس لیے کہ فطرت کے قانون مکافات کا یقین تمہاری طبیعت میں راسخ ہو گیا ہے۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گہوں لے کر اس کے بدلے میں جو ایدہ دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گہوں لے کر برے قسم کا گہوں دے گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ پھر تباؤ کہ جو فطرت گہوں کے بدلے گہوں اور جو ایدہ کے بدلے جو ایدہ دے رہی ہے کیوں کر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو۔“

حقیقت یہی ہے کہ انسان آج جو کچھ کر رہا ہے کل اس کا نتیجہ اسے ضرور دیکھنا ہے۔ جس طرح سنکھیا کھا کر ہلاک ہونے والا شخص خود قابل الزام ہے نہ کہ سنکھیا، اسی طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا نے بڑا ظلم کیا جو آگ میں جلانے کی خاصیت رکھدی اور اس نے ہاتھ جلادیا۔ کیا آگ کی خاصیت سے وہ واقف نہ تھا، کیا اس کی عقل نے اسے یہ نہ بتایا تھا کہ آگ جلاتی ہے، کیا اس کا تجربہ و مشاہدہ اس امر کی تصدیق نہ کرتا تھا کہ آگ نے بار بار جلانے کا عمل کیا ہے؟ اگر وہ ان سب باتوں سے واقف ہو کر بھی آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو وہ ہر رنج و تکلیف کے لیے خود قابل ملامت ہے۔ یہی حال ہمارے اعمال کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی، ضمیر بخشا، تمیز خیر و شر کی صلاحیت اس کی فطرت میں ودیعت کی، مزید برآں اپنے انبیاء و رسل اور اپنی کتابوں کے ذریعہ اچھے اور برے اعمال اور ان کے نتائج خوب و زشت سے انھیں صاف صاف باخبر کر دیا۔ اب اگر ان تمام

الہی انتظامات کے باوجود کوئی شخص برے اعمال کرتا ہے تو اس کے نتائج کو بھگنے کے لیے بھی اسے تیار رہنا چاہیے۔ روزِ آخرت جن لوگوں کو اعمالِ بد کے بدلے برے نتائج یعنی جہنم سے دوچار ہونا پڑے گا وہ ہرگز یہ نہ کہہ سکیں گے کہ وہ نتائجِ اعمال سے بے خبر تھے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ یہ اللہ کا ظلم نہ ہوگا خود ان کا اپنے آپ پر ظلم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ. وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا. وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ
لِّلْعَالَمِينَ ﴿۵﴾ (طہ السجدہ: ۴۶)

جس نے اچھا کام کیا تو اس کا اجرا سی کے لیے ہے، اور جس نے برا کام کیا تو اس

کا وبال بھی اسی کے اوپر ہے، اور تمہارا رب بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت اور جہنم دونوں انسان کے اپنے ہی اعمال کے دو مختلف نتائج ہیں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نتائجِ خیر سے خوش ہوتا ہے کہ وہ خود سراپا خیر ہے، اور نتائجِ بد سے ناخوش ہوتا ہے کہ وہ برائیوں سے منزہ اور پاک ذات ہے۔ ایک حدیثِ قدسی میں اسی بات کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، فرمایا:

”اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے ہیں اور وہ سب جو بعد میں پیدا ہوں گے، اور تمام انس و جن اس شخص کی طرح نیک ہو جلتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری سلطنت میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے ہیں اور وہ سب جو بعد میں پیدا ہوں گے، اور تمام انس و جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جلتے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے تو اس سے میری خدائی میں کچھ بھی کمی نہ ہوتی۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو اس سے میرے خزانہِ رحمت و بخشش میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کمی ایک سوئی کے

ناکے کو سمندر میں داخل کرنے سے ہو سکتی ہے۔ اسے میرے بندو! یاد رکھو!
یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لیے انقباض اور نگرانی میں رکھتا
ہوں اور پھر انہیں جوں کا توں تمہیں واپس کر دیتا ہوں (یعنی ان کے نتائج کو
بغیر کسی ویشی کے تمہیں واپس کر دیتا ہوں) پس تم میں جو شخص اچھائی پائے اسے
چاہیے کہ وہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جس کسی کو اس کے علاوہ یعنی برائی پیش
آئے اسے چاہئے کہ وہ اپنے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے، ملہ

اعمال کے برے نتائج کو جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، قرآن مجید نے مادی صورتوں میں جس کا
دوسرا نام جہنم ہے، صرف اس لیے پیش کیا ہے تاکہ انسان ان کی شدت و ہولناکی کو اچھی طرح
سمجھ لے اور اس دنیا میں برے افعال کے ارتکاب سے باز آجائے۔ سزاؤں کی مادی صورتوں
کو دیکھ کر جہنم کے وجود سے انکار کرنا قلتِ علم و تدبیر کی علامت ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں
مکافاتِ عمل کے قانون کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ان کو لازماً یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ برے اعمال
کے اثرات و نتائج کا ظہور یقینی ہے خواہ اس کو کسی بھی نام سے موسوم کیا جائے۔

بعض اربابِ نظرِ اعمال کے نتائج کو تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ نتائج
کسی غیر مادی دنیا میں نہیں بلکہ اسی عالمِ آب و گل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال حقیقتِ واقعہ
کے خلاف ہے۔ یہ ایک مشابہاتی حقیقت ہے کہ کتنے ہی برے افعال کے نتائج اس دنیا میں
ظاہر نہیں ہوتے، اور کتنے ہی مجرم و بدکار اپنے اعمالِ بد کے نتائج سے اس دنیا میں صاف
بچ نکلتے ہیں۔ یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اعمال کے اثرات و نتائج کے ظہور
کے لیے ایک دوسری دنیا کے وجود کو تسلیم کر لیں۔ اس دنیا کے وجود کو تسلیم کر لینے میں کوئی
امراغ نہیں ہے کیوں کہ یہ اعمالِ بد کے اثرات و نتائج کے ظہور ہی کا دوسرا نام ہے۔

کیا جہنم بھی خدا کی رحمت ہے؟

ہمارے بعض علماء کہتے ہیں کہ جہنم بھی خدا کی رحمت ہے اور اس کی حیثیت شفاخانے

لے مسلم رواہ ابو ذر

کی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:-

”دورخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لیے قید خانہ ہے بلکہ وہ بیماروں کے لیے شفا خانہ ہے۔ بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں۔ درد، اعضا، شکنی، شدت تشنگی، سوزش جسم، وہاں کڑوی سے کڑوی دوا دی جاتی ہے، بد مزہ سے بد مزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے، اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایذا رسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عام صحت کی غلط کاریوں کے برے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے“۔

اس تمثیل میں بظاہر چاہے کتنا ہی حسن معلوم ہوتا ہو، اور اس کا منطقیانہ انداز بیان چاہے کتنا ہی موثر ہو لیکن میرے نزدیک یہ طرز استدلال مغالطہ آمیز ہے۔ جہنم کو شفا خانہ قرار دینا جہنم کی سزاؤں یا دوسرے لفظوں میں اعمالِ بد کے برے نتائج کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ جہنم کی اس توجیہ کی ضرورت ہمارے علماء کو صرف اس لیے محسوس ہوئی کہ خدا کی رحمت و درافت کے خلعے میں جہنم کا وجود کچھ بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ جو خدا رحمان و رحیم ہے، جس کی رحمت و نوازش کی فیض رسائیوں سے اس عالم کا ذرہ ذرہ مستفید ہو رہا ہے، جس کا لطف و کرم بے نہایت، جس کے الطاف و عنایات بے اندازہ، جس کا عفو و بخشش بے حساب، بھلا وہ خدا اپنے بندوں کے ساتھ قہر و غضب، سنگ دلی و بے مروتی اور تعذیب کا معاملہ

کیسے کر سکتا ہے؟

فی الواقع جہنم قید خانہ ہے اور نہ شفا خانہ اور نہ ہی جہنم کی سزاؤں کی علت خدا کا قہر و غضب یعنی جذبہ انتقام ہے کہ وہ اس عیب سے بالکل پاک ہے، اور نہ ہی اس کا مقصد تربیت و اصلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کمال رحمت و شفقت سے اس دنیا میں انسانوں کی تربیت و اصلاح کا مکمل انتظام فرما دیا ہے یعنی اپنے انبیاء اور کتابیں بھیج کر انہیں اعمال کے نتائج سے آگاہ کر چکا ہے، اس لیے آخرت، تربیت و اصلاح کے بجائے نتائج اعمال کے ظہور کا دن ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہنم ایک ایسی حالت کا نام ہے جہاں برے انسان اپنے برے اعمال کے نتائج کے قالب میں ڈھل کر زندگی گزاریں گے جب تک اللہ تعالیٰ ان کی اس زندگی کو قائم رکھنا چاہے گا۔

جہنم کا وجود دراصل خدا کے قانون عدل کے ظہور سے وابستہ ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اس عالم ہست و بود میں ہر طرف اس کی ربوبیت و رحمت کا ابرگہر بار سایہ گستر ہے۔ یہ اس کی رحمت بے پایاں ہی کا نتیجہ ہے کہ کفار و مشرکین بھی اس دنیا میں اس کی رحمتوں سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ اور زندگی کا ہر سر و سامان حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن آخرت جس دن کا نام ہے وہاں اس کی رحمت کے ساتھ ساتھ اس کے قانون عدل کا بھی ظہور ہوگا۔ یہ قانون ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا کہ آج کون اس کی رحمت کا مستحق ہوگا اور کون اس سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس کی رحمت و عذاب کا قانون کیا ہے اس کا سراغ ہم کو موسیٰ علیہ السلام کی دعائے استنفا میں ملتا ہے، جس میں آپ نے فرمایا:

أَنْتَ وَلِيُّنَا فَأَعُوذُ لَكَ وَأَرْحَمُنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغُفُورِينَ ۝ وَكَتُبَ

لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ لِأَنَّكَ هَذَا كَأَنَّكَ

(ایمان: ۵۶، ۱۵۵)

تو ہی ہمارا کارساز ہے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہم پر رحم فرما، اور تو ہی سب سے اچھا معاف کرنے والا ہے۔ تو اس دنیا میں بھی ہم کو بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی

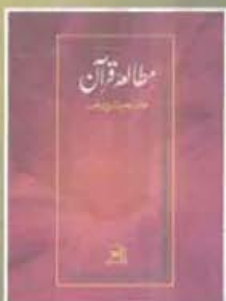
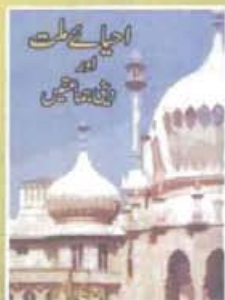
ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِنِّي أَصِيدُ الْعَافِينَ ۝
 هُمْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيُذَكَّرُوا ۝

”اس نے فرمایا ”میرا عذاب تو میں جس پر چاہتا ہوں اس پر نازل کرتا ہوں“ اور یہی میری رحمت تودہ (عالم کی) ہر چیز پر سایہ افکن ہے۔ پس میں اپنی رحمت کو (روزِ آخرت) صرف ان لوگوں کے لیے خاص کر دوں گا جو (اس دنیا میں) خدا سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں“ اور جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ ہے خدا کا قانونِ عدل و رحمت جس کا ظہورِ آخرت میں ہوگا۔ یہ قانونِ عدل و رحمت غیر متبدل ہے، ممکن نہیں کہ اس میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر واقع ہو جائے۔ وہ انسانوں کے قانونِ عدل و رحمت کی طرح نہیں ہے کہ عدل کا جامہ اتار دیا تو عفو و بخشش کا ہر دروازہ بند کر کے خوں ریزی اور ستم رانی پر اتر آئے، اور اگر رحمت کا لبادہ اُدھر لیا تو عدل و انصاف کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیا۔ خدا کا قانونِ عدل و رحمت اس طرح کی بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ روزِ آخرت عدل کے نام پر نہ کوئی ظلم و ستم ہوگا، اور نہ رحمت کے نام پر عدل و انصاف کا خون ہوگا۔ جیسا اور جتنا کچھ کسی نے کیا ہوگا اسی کے مطابق ویسا ہی اور اتنا ہی اس کے ساتھ پیش آئے گا، دوسرے لفظوں میں جو کچھ بویا ہوگا وہی کاٹے گا۔ اوپر کی سطروں میں ہم نے جنت اور جہنم اور دیگر امور متعلقہ کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت یقینات کی نہیں بلکہ تمام ترقیاتی ہے جو قرآن مجید کے الفاظ اور جملوں کے عمل اشارات سے ماخوذ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور جہنم کی اصل حقیقت ہمارے لیے ایک رازِ سرلبتہ ہے اور انسانی عقل و فکر کے ناخن سے اس کی گرہ کشائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ جنت اور جہنم دونوں ہی جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں بیان کر چکے ہیں، ہمارے اعمال کے دو مختلف نتائج ہیں۔ اچھے اور راحت بخش نتیجے کو جنت سے اور برے اور تکلیف دہ نتیجے کو جہنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔



297.1229

15211



* 24892 - EU - 64 *